

اگست 2018

ماہنامہ
دکن

دکن

دکن کا دستِ خوان

جائزہ نگار و پروفیسر

کرن

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نواز بھٹو سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نواز بھٹو ریلیٹو

باقی ————— محمود باقر فیصل
نیکران ————— محمود ریاض
مدیر ————— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود
نائب مدیر ————— شجاع حسین
مدیر خصوصی ————— اصمت الصوید
استھمارات ————— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ————— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیکل اسٹرز

254 ادارہ موتی پختے ہیں
252 رومیہ شریف مسکراتی کرنیں
255 مدیر وکرن ناع میکرناہم

اگست 2018

جلد 41 شمارہ 5

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: بہنام کرن - 37 - اردو بازار، کراچی۔

بہشت آرزو ریاض نے ان حسن پر تنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی۔91، بلاک W، تاج محلہ عالم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو، شعاع عمیر 244
یادوں کے درکے سے، بشری محمود 248
مجھے شیعہ پسند ہے، شگفتہ سلیمان 250
آم سے میٹھانیاں، خالدہ جیلانی 247

مکمل ناول

لذتِ نعمِ عشق، صائمہ قریشی 214
آخری فتح، نگہت بیما 66
نین تارا اور کوکب، منشا حسن علی 130

ناولٹ

غم ہے یا خوشی ہے تو، تنزیلہ ریاض 99
میں واری، ریحانہ آفتاب 163

افسانے

بقوہ عید، فادیر احمد 51
دل خوش فہم، قرۃ العین سکندر 23
سچ کہونا، فرح بھٹو 06

محمد
لعل
11 فروزا نیناں
11 احمد خیال

انٹرویو

مذللہ عقیدت، شاپین رشید 12
شامل خان سے ملاقات، شاپین رشید 19
میری بھی سنیے، عاصم محمود 23
مقابل ہے آئینہ، صائمہ سحر 27

ناول

شبِ نم کی سحر، رخ چوہدری 30
ہوائیں رخ بدل گئیں، نگہت عبداللہ 190

کرن
37 - اردو بازار، کراچی

رسالہ نواز بھٹو کی سٹوری
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا و افریقہ، یورپ --- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے مہینہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقض بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویب سائٹ پر ڈراما ڈرامائی شکل میں اور سلسلہ وار قطعہ کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

اگست کا مہینہ ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس ماہ ۱۴ اگست کو ہمارا وطن عزیز مزمن وجود میں آیا تھا۔

اس وطن کے قیام میں ہمارے بزرگوں کی لازوال قربانیوں کی داستانیں رقم ہیں۔ ہماری آزادی کا ہر باب خون سے رنگین ہے۔ آزادی قربانی کا ماحول ہے۔ حصول پاکستان کے لیے جس قدر محنت اور جدوجہد کی گئی پاکستان کے قیام کے بعد بھی لاکھوں لوگ اپنی جان کا نذرانہ دے چکے ہیں۔

یوم آزادی - محمد عبدالغفور کا دن کہ میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا کی اس کی حفاظت کریں۔ اس کی توجہ دینی کے لیے غنت اور کوشش کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے گئے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس مقدس امانت کو امن اور خوشیوں کا گہوارہ بنائیں۔ ہر طرح کے تعقیبات سے بالاتر ہو کر باہمی رواداری اور جذبات اخوت کے تحت سچے پاکستانی بنیں۔ رہی ترقی اور خوش مانی کا راستہ ہے۔

اگست کے بیسٹے میں عبدالاحدی کا دن ہے۔ عبدالاحدی قربانی کے ایک عظیم ترین واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے عزیز ترین بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ یہ فطرت قربانی کا سلسلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ سب سے افضل ہے۔

اگست ۱۵ء اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی چند دن ہوئے ہم ایک جمہوری عمل سے گزرے ہیں اور اپنی نئی قیادت منتخب کی ہے۔ عوام ہی کسی مذہب معاشرہ کی قوت ہوتے ہیں۔ جو کسی سوچ فکر کے تحت ووٹ کی طاقت سے مستقبل کے فیصلے کرتے ہیں۔ جمہوری عمل کا تسلسل ہی قوموں کو مورچ دیتا ہے۔

اہل وطن کو عبدالاحدی، یوم آزادی اور ایک نئی قیادت مبارک ہو۔

محمود خاوری بری

کچھ لوگ دل پر ایسے نقش چھوڑ جاتے ہیں جن پر وقت کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ محمود خاوری ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ گوگان کو ہم سے پچھلے برس بری لڑ گئے۔ مگر وہ آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ ۲۵ اگست کو ان کی بری کے موقع پر تارین سے دہائے مغزرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں

- ۱۔ "نذرانہ عقیدت مقام عالم" ۱۴ اگست کے حوالے سے شاہین رشید کا خصوصی سروے،
- ۲۔ اداکار شائل خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- ۳۔ فن کار عالم محمود "کتھے ہیں میری بھی جیتے"،
- ۴۔ اس ماہ صائمہ سحر کے مقابل ہے آئینہ،
- ۵۔ شب غم کی سحر خیز روح مدنی کا نیا سلسلہ وار ناول،
- ۶۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ۷۔ "انڈیا جی" صائمہ سحر کا ناول،
- ۸۔ نگہت سحر کا ناول "آخری لمحہ"،
- ۹۔ منشا حسن علی کا ناول "نہ تارا اور ایک نئی کوکب"،
- ۱۰۔ ستریزہ ریاض کا ناول "عزیزے یا غریبے تو"،
- ۱۱۔ "میں واری جاواں" ریحانہ آفتاب کا ناول،
- ۱۲۔ "نادر احمد" فرح بیٹو اور قرۃ العین مسکندر کے افانے اور مستقل سلسلے،
- ۱۳۔ "محنت"،
- ۱۴۔ "گرن کا دسترخوان" کرن کے بر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔

محمد
باری تعالیٰ

رسول مقبول
محمد

یارب نفس نفس میں ہے یہاں تلیلیا
دنیا کا فردہ فردہ کرے دو ترا نام

تیرے ہی نور سے ہیں فروزاں مہ و نجوم
روشن ہے آفتاب ہے درخشاں مہ تمام

سیراب سب ہوئے ترے زمزم کے فیض سے
لوٹا نہیں ہے درے ترے کوئی تشہ کام

مل جائے مجھ کو ایک سجدہ نصیب سے
گھر میں ترے جہاں ہے ابراہیم کا مقام

کر لے قبول ساری دعائیں جو دل میں ہیں
نینال یہاں سے جائے گی برگزینہ تشہ کام

فرزانہ نینال

احمد خیال

14 اگست، آزادی کے خوب صورت احساس کے ساتھ اس دن کا آغاز ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس دن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا ان کے لیے یہ دن کتنا اہم ہوگا۔ مگر جن لوگوں نے اس کی تاریخ پڑھی ہے یا ہماری نوجوان نسل جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس دن کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا انہیں یہ دن منانا کیسا لگتا ہے..... کیا بہت اچھا یا شرمندہ شرمندہ سا کہ ہم نے ان 70 سالوں میں کیا حاصل کیا، بہت کچھ پایا..... یا بہت کچھ کھویا.....؟

سوال یہ ہے کہ

(1) ”آپ 14 اگست کو کس طرح سلیپر یٹ کرتے ہیں؟“

(2) ”کیا اس دن اپنے ملک کا موازنہ دوسرے ملک سے کرتے ہیں۔“ ہاں، تو کیا احساسات ہوتے ہیں اور ”نہیں“ تو کیوں نہیں؟“

تذاتہ عقیدت اود مقام عالم

شاین رشید



فاطمہ نجیب:- شاعر، گیت کار، ہم ٹی وی

(1) 14 اگست ہماری زندگی کا اہم اور خوب صورت دن ہے..... اس دن پاک وطن کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ ہر طرف ایک گرین اور سفید رنج دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ خود بھی سبز رنگ کا لباس پہنتی ہوں اور دل کرتا ہے کہ ہر طرف سبزے کی

بہار ہو، اور شاعری کی شکل میں کچھ اشعار لکھ کر پاک وطن کو خراج تحسین پیش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بچے گھر کو جھنڈیوں سے سجاتے ہیں اور کوشش ہوتی ہے کہ اپنے لفظوں سے اپنے ملک سے اظہار محبت کریں..... اپنے بچوں کو ان عظیم قربانیوں سے روشناس کرائیں جن کو جھیل کے اس وطن عظیم کو حاصل کیا ہے۔

(2) کبھی خاموش بیٹھے تنہائی میں اپنے ملک کا موازنہ دوسرے ممالک سے کرتی ہوں تو کبھی سوچتی بھی ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں الحمد للہ اپنی فیملی کے ساتھ کافی ممالک کی سیر کر چکی ہوں..... کچھ واقعات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہم مسلمانوں کی تعلیمات یہ دوسرے مذہب کے لوگ زیادہ اچھے طریقے سے عمل پیرا ہیں..... خاص طور پر سچ بولنا، ایمانداری کے ساتھ کام کرنا، اپنے وطن سے محبت کرنا، ملاوٹ نہ کرنا، قوانین کی اور وقت کی پابندی کرنا..... اپنے وطن سے محبت ہونا ایک فطری

عمل ہے اور اس محبت کے تحت کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارا ملک بھی تیزی سے ترقی کرے اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں عزت و وقار سے شامل ہو جائے..... اس کے لیے دعاؤں کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اللہ پاک ہمارے وطن کو دائم آباد رکھے۔ (آمین)

تیری دیواروں سے تیرے در سے ہم کو پیار ہے
تجھ سے نسبت جس کو ہے اس ہر بشر سے پیار ہے
پاک سرزمین دائم شاد ہو آباد ہو
محزون فہم و فراست شاد ہو آباد ہو



ڈاکٹر عرفا روق ای این ٹی + کولیکس ایمپلائٹ

اسپیشلسٹ

(1) بچپن سے لے کر آج تک 14 اگست کا دن ہمیشہ یادگار رہتا ہے، جب ہم اسکول میں تھے پوائنٹ اسکاؤٹ میں تھے، اور میکور روڈ جو کہ اب مولوی تمیز الدین روڈ ہے، اس کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن ہے..... ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے واقف نہ ہوں..... وہاں 14 اگست کو باقاعدہ اسکاؤٹ کی ریلی ہوا کرتی تھی اور اتفاق دیکھیں کہ بارش ضرور ہوتی تھی..... خیر آج بھی ہم اس دن اپنے گھر میں جھنڈا ضرور لگاتے ہیں۔ جھنڈا بھی



فیصل قریشی:- (آرٹسٹ۔)

لگاتے ہیں۔ لیکن چونکہ اب جدید دور ہے تو اب برقی قلموں سے گرین اور وائٹ جھنڈا بناتے ہیں اسے ملک کا..... اور اب گھر کو سجانے اور جھنڈا بنانے کی ذمہ داری میرے چھوٹے بیٹے اور بیٹی نے لے لی ہے..... اور اس انداز میں ہم 14 اگست مناتے ہیں۔

(2) جی بالکل موازنہ کرتا ہوں..... اور بہت دکھ ہوتا ہے اور اپنے گزرے دور کا موازنہ ہم آج کے دور سے کریں تو ہم بہت ہی با تہذیب اور ترقی یافتہ قوم میں سے تھے..... اور علم و ادب کا، تہذیب کا، ہر چیز کا بہت بول بالا تھا..... اب آہستہ آہستہ تہذیب بدلتی جا رہی ہے۔ لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ بھولتی جا رہی ہے کہ کس طرح قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا اور اب کس طرح اس کا حال برا کیا جا رہا ہے..... دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر جو ملک ہم سے بہت پیچھے تھے وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں..... جو ہمیں دیکھنے آتے تھے کہ ترقی کیسے ہوتی ہے آج ہم انہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ ان کے پاس جاتے ہیں قرضہ لینے کے لیے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے..... کس کس ملک کا نام لوں آپ سب جانتی ہیں..... تو موازنہ ضرور کرتا ہوں اور بہت دکھ ہوتا ہے۔

الوب کھوسہ:- (آرٹسٹ)

(1) 14 اگست ایک ایسا دن ہے جس کی جتنی قدر کریں کم ہے اور جو بھی آزاد قومیں ہیں ان کے لیے یہ آزادی دن بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس دن لوگ اپنا احتساب کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملک کے لیے کیا کیا..... میں اس دن آزادی کے حوالے سے جو پروگرام ہوتے ہیں ان میں شریک ہوتا ہوں، جو مجھے بلاتے ہیں میں ان کا مہمان ہوتا ہوں اور مجھے آزادی کے حوالے سے پروگراموں میں شرکت کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔

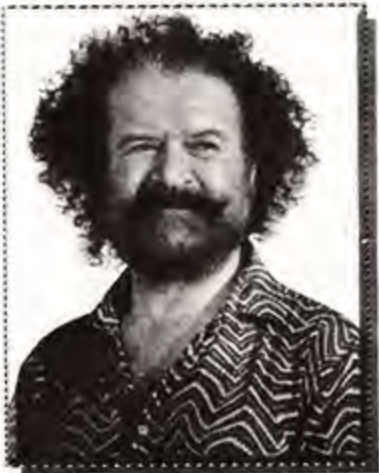
(2) ہاں موازنہ ضرور کرتا ہوں..... اور یہ دیکھتا ہوں کہ ہم خود کہاں پہ کھڑے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم، بہ حیثیت ایک حکمران کے..... اور ہم سے کیا کیا غلطیاں کیا گیا کوتاہیاں ہوئی ہیں اور ہمیں اس کو کس طرح دور کرنا ہے..... اور میرا جیسا بندہ جس نے شوبز میں کافی ٹائم گزارا ہو اور جس سے لوگوں نے بے انتہا پیار کیا ہو، محبت دی چاہت دی..... تو میں یہ سوچتا ہوں کہ جو شخص مجھے ملی ہیں اسے عوام سے..... ان کو میں کس طرح لوٹا سکتا ہوں..... تو اگر میں ایکشن میں کامیاب ہو جاتا ہوں..... تو یقیناً یقیناً میں اپنی الگ سے ایک سوچ اور ایک زبان رکھتا ہوں



محمود اسلم:- (آرٹسٹ)

(1) پاکستان کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ آپ بتائیں ہمیں چودہ اگست منانا چاہیے؟..... یا 14 اگست منانا بننا ہے؟ ملک کی حالت دیکھیں کیا ہو رہی ہے۔ غریب کی حالت دیکھیں کیا ہو رہی ہے..... ہم کس منہ سے 14 اگست منائیں گے؟ بہت برے حالات ہیں ملک کے، دوسرے ممالک دیکھیں کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں اور ہم اپنے لوگوں کو نہ پانی دے سکے ہیں، نہ بجلی..... کوئی بنیادی سہولت ہم نہیں دے سکے ہیں، آپ اسپتالوں کی حالت دیکھیں۔ گاؤں دیہات میں غریبوں کی حالت دیکھیں۔ دو چار شہروں میں دو چار سڑکیں اور پل بنوا کے آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا..... ہمارے لیڈروں نے قوم نہیں بنائی۔ آپ طبیب پر ہنگام کی طرف دیکھیں آپ مہاترہ کی طرف دیکھیں جنہیں نے قومیں بنائی ہیں، جنہوں نے ملک بنائے ہیں۔ ہمارے پاس کیا ہے منانے کو؟

(2) یہی میرا موازنہ ہے اور ”آزادی“ آزاد لوگ مناتے ہیں ہم تو ابھی تک محکوم ہیں، غلام ہیں، ڈری ہوئی قوم ہیں، ہم نے کیا منانا ہے۔



(1) 14 اگست بھر پور طریقے سے مناتا ہوں۔ اس دن میرا شو بھی ہوتا ہے..... اور خوش گواری احساس ہوتا ہے کہ آج آزادی کا دن ہے اور آزادی بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کروڑ بار شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ملک، پاکستان عطا کیا اور ان قربانیوں کو یاد کرنا چاہیے جو ہمارے بزرگوں نے دیں اور جن کی وجہ سے ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں۔ اس سال 14 اگست ان شاء اللہ لندن میں اپنے پاکستانی بہن بھائیوں کے ساتھ سیلبریت کروں گا۔

(2) موازنہ کرتا ہوں اور موازنہ کرتے وقت مجھے اپنے ملک میں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی کہ جس کے لیے میں کہوں کہ میرے ملک میں یہ اچھا نہیں ہے..... اللہ کا بڑا شکر ہے کہ سب کچھ اچھا ہے..... ہاں تھوڑی سی اصلاح کی ضرورت ہے اور اس کی ضرورت ہماری عوام کو ہے..... جب ہم بچے کو ”مادر پدر“ آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے تہذیب و تہذیب نہیں سیکھاتے، ٹھنڈا بیٹھنا نہیں سیکھاتے تو ظاہر ہے کہ..... دنیا بھر میں جس چیز پر سختی ہوتی ہے وہ ٹریفک کے نظام پر ہوتی ہے..... مگر ہمارے ملک میں پنجاب میں ٹریفک کا نظام کچھ اور ہے، اسلام آباد کا کچھ اور ہے دیگر شہروں کا الگ ہے..... تھوڑی سی اوپینس کی ضرورت ہے، تھوڑی سی چیزیں سکھانے کی ضرورت ہے۔ سیکھنے کے ہم شوقین ہیں بہت جلد اچھی عادتیں سیکھ لیتے ہیں..... اللہ کرے کہ کوئی ایسا انسان آئے جو لوگوں کو یہ سمجھائے کہ پورے ملک کا نظام ایک ہونا چاہیے۔ چاہے وہ تعلیمی نظام ہو، یا ٹریفک کے حوالے سے ہو، چاہے وہ صحت کے حوالے سے ہو، اور پھر نظام نظر آنا چاہیے..... صوبوں میں نہیں باشنا چاہیے۔

بینش راجہ:- (آرٹسٹ)

(1) 14 اگست اسی طرح منائی ہوں جس طرح ہم سب پاکستانی مناتے ہیں۔ گرین کپڑے پہن لیے، گھر سجایا، کہیں گھومنے پھرنے نکل گئے،

جھنڈیاں لگالیں قومی نغمے سن لیے، دیئے جلا لیے، یعنی جوش و خروش کے ساتھ منائی ہوں، کہ یہ دن ہمارا ہوتا ہے۔ آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ گرین پاسپورٹ پر فخر ہوتا ہے۔

(2) جہاں تک موازنہ کی بات ہے تو اپنے ملک کا موازنہ میں بھی کسی دوسرے ملک سے نہیں کروں گی، کیونکہ میری پہچان میرا ملک ہے اور میں کسی اور کی پہچان کو اپنی پہچان کے ساتھ کپیئر نہیں کر سکتی۔ ہاں لوگوں کے اخلاق کا موازنہ ضرور کروں گی..... ہم اکثر اپنے حکمرانوں کو باتیں کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ہم اخلاقی طور پر بہت گری ہوئی قوم ہیں..... ہمیں جہاں موقع ملتا ہے ہم غبن کرتے ہیں، فراڈ کرتے ہیں۔ چھوٹے طبقے سے لے کر بڑے طبقے تک سب ایک جیسے ہیں۔ شریف صرف وہ ہے جسے موقع نہیں ملا۔ جس کو بنی موقع ملا اس نے دوسرے کی ٹانگ ضرور ٹھینچی ہے۔ اگر ہم میں اخلاقیات کی کمی نہ ہوتی تو آج ہم ترقی پذیر نہیں بلکہ ترقی یافتہ کہلاتے..... اور موازنہ ملک کا اس لیے نہیں کروں گی کہ جو گھر مجھے تحفظ دے رہا ہے عزت دے رہا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔

جس کو میں ضرور استعمال کروں گا..... اور جو خدمت کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔



عمرانہ مقصود:- (رائٹر)

فیض احمد فیض کیا خوب کہہ گئے ہیں.....
وہ انتظار تھا جس کا
یہ وہ سحر تو نہیں

کہ 14 اگست 1947ء کو یہ بات فیض صاحب نے کی تھی۔ ہمیشہ 14 اگست کو اس سحر کا ہی انتظار ہوتا ہے کہ شاید کبھی ایسا ہو کہ ہم اپنے ملک کو آزاد مانیں اور آزاد جھیں، کاش کہ ایسا ہو جائے، لیکن جو کچھ بھی ہے۔ ملک ہمارا ہے، اس کے لیے دعائیں ہماری ہیں..... اور ہم اس کے لیے کام کرتے رہیں گے، جس کے بس میں جو کچھ ہے وہ کرے..... انسان بڑے بڑے کاموں سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ روز کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے پہچانا جاتا ہے۔ تو اچھے کام کرتے رہیں۔ کرتے رہیں۔ ایک دن اللہ تعالیٰ اس کا بھی اجر دے گا۔

سیماناف:- (رائٹر ڈرامہ بند کھڑکیاں + افسانہ و ناول نگار)

(1) 14 اگست میرے لیے میری سالگرہ سے زیادہ اہم ہے، مجھے اپنے وطن سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے، اس لیے مجھے اسے منانا بہت اچھا لگتا ہے..... جھنڈیاں لگانا، قومی نغمے لگانا، قومی لباس پہننا اور اس دن گھر والوں کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلانا مجھے بہت پسند ہے۔ 14 اگست کو ہی جاوید کی سالگرہ (میاں صاحب) ہوتی ہے تو اس دن کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے میری نظر میں..... دن بھر بلڈنگ کے بچوں کے ساتھ اپنے اپنے فکروں کو سنانا، ان کی مدد کرنا..... بچے کہتے ہیں کہ ماں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہیں۔ تو ہاں میں پاکستان کے لیے جذباتی ہوں۔ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں چلی جاؤں، میرے لیے میرا



پاکستان سب سے اہم ہے..... 2015ء میں میں شکاگو میں تھی وہاں کے پاکستانی یہ دن بہت جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ پورے شکاگو میں ریلیاں نکالتے ہیں۔ جھنڈے، قومی لباس، قومی نغمے..... یہ دل دیکھ کر دل خوش ہو گیا تھا..... اور یقین کریں میں نے ان سب کے ساتھ مل کر اتنے نعرے

لگائے کہ زندگی بھر نہ لگائے ہوں گے۔

(2) اس دن مجھے اس بات کا بہت دکھ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خزانوں سے بھرا ہوا اسلامی ملک دیا ہے اور ہم نے اس کی قدر نہیں کی، میرے ابا کا پورا خاندان پارٹیشن میں ختم ہو گیا تھا..... اور بھی پتا نہیں کتنے خاندانوں نے اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی قربانیاں دیں، گھر چھوڑے، رشتوں کو گنوا یا، صرف اس لیے کہ ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے سکیں..... لیکن ہم قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد کو کتنی آسانی سے بھول گئے ہیں..... ہمارے سیاست دانوں نے ہمارے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے..... اور ہم پھر بھی بار بار انہی کو منتخب کر کے لے آتے ہیں..... مگر میں پھر بھی پر امید ہوں کہ ایک دن ہم ایسی قوم بن کے ابھریں گے کہ لوگ ہم پر رشک کریں گے..... ان شاء اللہ۔



شہود علوی:- آرٹسٹ، پروڈیوسر + ڈائریکٹر

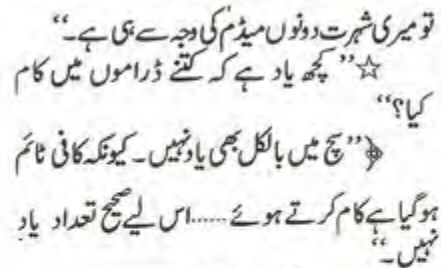
(1) 14 اگست چونکہ ہماری آزادی کا دن ہے۔ یہ کہنا کہ آج 14 اگست ہے اور آزادی کا دن منالینا بڑا آسان ہے..... تو درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

یہ دن جن قربانیوں اور جدوجہد کے بعد ہمیں ملا تھا اگر اس دن کے بارے میں سب کو پتا ہو تو یہ بڑا تکلیف دہ دن ہے 14 اگست کا دن دیکھنے کے لیے اس قوم نے جو قربانیاں دیں، اگر ان کو یاد رکھا جائے، تو 14 اگست کا دن خوشی اور تہواروں کے انداز میں منانے کی بجائے۔ لوگوں کو مسجدوں میں منانا چاہیے، اللہ کا شکر ادا کر کے منانا چاہیے، رو رو کر گزرتا چاہیے۔ اور اپنے بزرگوں کا وہ تکلیف دہ وقت یاد رکھنا چاہیے کہ کتنی قربانیاں دی تھیں اور پھر 14 اگست کا دن دیکھنا نصیب ہوا..... تو اگر ایک طرف میں اس دن خوش ہوتا ہوں تو دیکھی بھی بہت ہوتا ہوں..... اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس دن تمام شہیدوں کے لیے دعائیں مغفرت کروں کہ جنہوں نے اس ملک کو بنانے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا..... اس دن انہی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہوں اور اگر کسی فی وی پروگرام میں بلایا جاتا ہے تو پھر وہاں اس دن کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔

(2) ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ..... ”اپنے سے اوپر دیکھنے کے بجائے اپنے سے نیچے دیکھو گے تو تمہارے اندر شکر کی عادت پیدا ہوگی اور شکر کرنے والے اللہ کے بہت قریب اور عزیز ہوتے ہیں“..... تو اگر میں اپنے ملک کا موازنہ کسی یورپی ملک سے کروں یا کسی اور ملک سے کروں تو مجھے اوپر دیکھنے کی عادت پڑ جائے گی..... اور وہ میں دیکھنا نہیں چاہتا، تو میں اپنے ملک کا موازنہ ان ملکوں سے ضرور کرتا ہوں، جہاں کے لوگ بہت تکلیف میں

ہیں۔ تو اس طرح سے اپنے ملک سے پیار بھی بہت ہوتا ہے اور آگے بڑھنے کی جدوجہد بھی جنم لیتی ہے..... اور اگر آزادی کا موازنہ کریں تو جو آزادی ہمیں ہمارے ملک میں ہے وہ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ تو اس چیز کا بھی موازنہ کریں تو اپنا ملک زیادہ اچھا لگے گا..... مجھے اپنے ملک کا ہر موسم

شاہین رشید



شامل خان فلم اور ٹی وی کے معروف فنکار ہیں اور ان کے کیریئر میں کئی معروف فلمیں اور ڈرامہ سیریل ہیں۔ یہ گزشتہ دنوں ان سے بات چیت ہوئی تو ہم نے ان سے پوچھا۔

﴿”جی اللہ کا شکر ہے۔“﴾

☆ ”آج کل ہر طرف سیاست کا زور ہے۔

آپ کے انٹرویو آنے تک نئی حکومت بھی آ چکی ہوگی،
کچھ نہیں گے اس بارے میں؟“

”سچ تو چھس تو مجھے سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے..... کیونکہ ہماری توقعات یہ تو کوئی بھی پورا نہیں کرتا پھر فائدہ کسی کی حمایت کرنے کا یا دوث نے کا۔“

☆ ”بھئی صدر یا وزیر اعظم کے عہدے کا
ریشن لڑنا بڑے تو؟“

”تو آسانی سے لڑلوں گا..... یہ کون سا
شکل کام ہے اور سب کی سیاست دیکھ دیجیہ کہ اتنی
سیاست تو ہمیں بھی آگئی ہے.....“ تہقہہ۔

☆ ”آپ نے ڈراموں میں بہت کام کیا اور فلموں میں بھی۔ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو شہرت کس میڈیا نے دی؟“

”مجھے میرے کام نے شہرت دی..... میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ مجھے ڈرامہ شہرت دے رہا ہے فلم..... لوگ جب میرے پاس آ کر کہتے ہیں کہ آپ کو فلاں ڈرامے میں دیکھا تو لگتا ہے کہ ڈرامہ نے شہرت دی اور جب کوئی میری فلم کی تعریف کرتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں فلم کی وجہ سے مشہور ہوا ہوں۔“

نہیں ہوتا۔ مہمان اگر کبھی ڈھنگ کے بلا بھی لیے جائیں تو ان سے لایعنی گفتگو کی جاتی ہے۔ گزشتہ سال کا 14 اگست بہت اچھا گزرا، میں اپنی کزنز کے ساتھ ”سی ویو“ گئی اور یہ وہ دن تھا جب کسی کے پاس بھی کسی پارٹی کا جھنڈا نہیں تھا بلکہ سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے..... اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔

(2) میرا بھی تک پاکستان سے باہر جانے کا

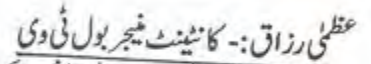
اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن چوہنا ہے اس پر موازنہ تو کیا ہی جاتا ہے اور ایسے موقع پر مجھے حکمرانوں سے زیادہ اپنے عوام پر غصہ آ رہا ہوتا ہے کہ وہ ایسے حکمران ہی کیوں منتخب کرتے ہیں..... اور دوسری بات یہ کہ یہ ہم ہی لوگ ہیں جو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں..... ڈرائیو کرتے وقت اکثر میں دیکھتی ہوں کہ پڑھے لکھے لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے تو ہوتے ہیں لیکن ان کو شعور نہیں کہ سگنل پر رکنہ بھی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جب ڈیڑھ دو گھنٹے کی فلائٹ کے بعد دہی جاتے ہیں تو یکسر بدل جاتے ہیں..... یہی وہ لوگ ہیں جو باہر جا کر ایک منظم زندگی گزارتے ہیں، کیا ان کی کوئی ٹریننگ ہوتی ہے؟..... نہیں بلکہ صرف قانون کا خوف ہوتا ہے جو ان کو انسان بنادیتا ہے..... قوانین تو ہمارے پاس بھی ہے مگر کاغذوں کی حد تک..... اور اس کے ذمہ دار صرف اور صرف ہمارے حکمران ہیں۔

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
قیمت نام کی شہرت	شیر علی چندی	180/-
شہر علی کے حالات	شیر علی چندی	300/-
محمد علی چندی	گیت علی	200/-

اور ایک ایک انچ زمین سے بھی پیار ہے۔ مجھے اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے ملک سے باہر امیگریشن لینے کا موقع ملا۔ لیکن میں نے اور میری بیوی اور بچوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنے ملک میں ہی رہنا ہے اور یہ ہماری اپنے ملک سے محبت کا اظہار تھا..... میں اپنے ملک میں رہنا چاہتا ہوں اور اس کا موازنہ کسی دوسرے ملک سے نہیں کرنا چاہتا۔ ملک میں ترقی ہو تو یہ میرے لیے فخر کی بات ہوگی اور اگر نہ ہو تو مجھے دکھ ہو گا۔



(1) 14 اگست کی ساری سلیپر شیٹ بیچپن سے جڑی ہوئی ہیں جب عید کی طرح اس دن کا انتظار رہتا تھا..... جھنڈیاں لگانا اور پھر بارش ہونے پر ان کے بھیک جانے پر افسوس کرنا اسکول کے پروگرامز میں حصہ لینا اس صبح آٹھ بجے کے ترانے کی خوشی ہی الگ ہوتی تھی اب کافی سالوں سے بس ٹی وی دیکھ کر ہی 14 اگست منایا جا رہا ہے اور ٹی وی دیکھ کر بھی مایوسی ہی ہوتی ہے کہ ان سو کالڈ مارننگ شو میں لوگوں کو نچوانے کے علاوہ کچھ



”میں شوق ہے تو میں تمہیں ”آفاق صاحب کے پاس
”بجھ دیتا ہوں۔“ پھر میں آفاق صاحب سے ملا،
دوبارہ سید نور صاحب سے ملا۔ اور یوں فلم کے
ذریعے میری انٹری ہوئی شو بزم میں۔ اور پھر راستے
”کھلتے چلے گئے۔“

☆ ”والد صاحب کی طرف سے بھی تو آپ
میں جراثیم موجود تھے؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی بالکل موجود تھے لیکن کسی نے
اس جانب توجہ ہی نہیں دلائی تھی۔ بہر حال میرے
نصیب میں یہی فیلڈ لکھی تھی اس لیے اس فیلڈ میں آ
گیا۔ بس قدرت ہی ہے کہ وہ انسان کو کہاں سے
کہاں پہنچا دے۔“

☆ ”گوکہ آپ نے سترہ اٹھارہ فلمیں کیں،
مختلف ہیروئنوں کے ساتھ۔۔۔۔۔ پھر بھی سب سے
زیادہ کس کے ساتھ کام کیا۔ اور کیسے کا موقعہ کس کی
صحبت میں ملا؟“

”میں نے زیادہ تر بلکہ پانچ یا چھ فلمیں
”صائمہ“ جی کے ساتھ کیں۔ ہمارا ایئر پسند کیا گیا۔
تب ہی ہمیں اتنی فلمیں ملیں۔ اور سیکھا تو میں نے
سب ہی سے ہے۔“

☆ ”صائمہ کیسی فنکارہ ہیں؟“
”صائمہ بہت اچھی فنکارہ ہیں اور یہ حقیقت
ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور وہ خود بھی
سکھاتی ہیں۔ غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتی ہیں۔“

☆ ”آپ نے تو شاید بھارت میں بھی جاکر
ان کی فلموں میں کام کیا ہے۔ کچھ بتائیں گے ان کے
بارے میں؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ میں نے انڈیا جاکر انڈیا

کی فلم میں بھی کام کیا ہے اور اس فلم کا نام ”بکھی پیار نہ
کرنا“ تھا اور یہ فلم 2007ء میں بنی تھی اور اس کی
ساری ریکارڈنگ ممبئی میں ہوئی تھی۔ اور اسکرپٹ
بھی اور بچل تھا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایک ہی چینل
تھا۔ نہ ایف۔ ٹی، نہ سوشل میڈیا، نہ انسٹا گرام۔۔۔۔۔ تو
صرف اپنی اداکاری کی وجہ سے ہی اپنا آپ منواتا
تھا۔۔۔۔۔ اب تو کوئی ایک ڈرامہ میں بھی کام کرتا ہے تو
سوشل میڈیا کے ذریعے اتنی زیادہ پکٹی ہو جاتی ہے کہ
ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک ڈرامہ میں نہیں بلکہ کئی
ڈراموں میں کام کیا ہو۔ آج کا ٹیلنٹ تو راتوں
رات شہرت کی بلند یوں پہنچ جاتا ہے۔“

☆ ”آپ کے ٹیلنٹ کو کس نے دریافت
کیا؟“

”یہ بڑی بات ہے کہ کسی میں پوشیدہ ٹیلنٹ کو
دریافت کیا جائے۔۔۔۔۔ مجھے تو خود علم نہیں تھا کہ مجھ میں
اداکاری کے جراثیم موجود ہیں۔ میں تو اپنی گریجویشن
کے بعد بینک میں جاب کر رہا تھا، اور بینک کی جاب سے
پہلے میں نے ایک سپر مارکیٹ میں بھی جاب کی۔ مگر
مجھے مزا نہیں آیا۔ بات یہی ہو جائے گی آپ نے
ٹیلنٹ کے بارے میں پوچھا کہ کس نے دریافت کیا۔ تو
مجھے سید نور نے دریافت کیا۔“

☆ ”آپ نے کہا کہ بات یہی ہو جائے گی تو
آپ اپنی بات مکمل کریں۔ اور پھر یہ بھی بتائیں کہ
سید نور نے آپ کو کس طرح دریافت کیا؟“

”میں اپنی جاب کے بارے میں بتا رہا تھا کہ
پہلی جاب سپر مارکیٹ میں کی، کوئی چھ ماہ تک۔ پھر بینک
میں 10 ماہ تک، پھر ایک آئل کمپنی میں جاب کی اور یہ
جاب بھی تھی تقریباً چار سال۔۔۔۔۔ اگر مجھے اداکاری کا
شوق ہوتا تو میں ادھر ادھر جاب نہ کرتا اس طرف آ جاتا،
پھر اتفاق یہ ہوا (شاید قدرت کو یہی منظور تھا) میں اسلام

آباد سے لاہور ہجرت منانے آیا۔ تو وہاں سید نور سے
ملاقات ہوئی۔ تو وہ بے ساختہ بولے کہ ”تم فلم میں کام
کرو گے“ اور میں نے بھی فوراً حامی بھری، بس پھر کیا تھا
انہوں نے کہا کہ تم اپنی تصاویر مجھے بھیج دینا۔۔۔۔۔ میں نے
گھر آ کر اپنے والد صاحب سے ذکر کیا اور کہا کہ میں
کام کرنے کے لیے ”یس“ کر دیا ہے۔ تو کہنے لگے اگر

سمیٹا ہے یا پھر زوال کی طرف جاتا ہے۔۔۔۔۔ تو
2002ء ایسا سال ہے جب اللہ کی رحمت اور برکت
سے میرے کام میں بے حد اضافہ ہوا اور بتدریج ہوتا
ہی رہا۔۔۔۔۔ اور میں نے اپنے کام مکمل کرانے کے لیے
دن رات کام کیا۔“

☆ ”اور کیا فلمیں بھی لا تعداد ہیں؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ فلموں کی تعداد تو
محدود ہی ہے۔ یہی کوئی 18، 19 فلمیں کی ہوں
گی میں نے۔۔۔۔۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میری ساری
فلمیں مقبول ہوئیں۔۔۔۔۔ میری پہلی فلم ”لوکی پنجابن“
تھی اور آخری فلم ”سن آف پاکستان“ تھی۔

☆ ”آخری فلم۔۔۔۔۔ کیوں کیا فلموں کو خیر باد کہہ
دیا؟“

”فی الحال خیر باد اپنی مرضی سے کہا ہوا ہے
میں نے۔۔۔۔۔ کیونکہ دو باتوں نے دل برداشتہ کیا۔۔۔۔۔
ایک تو یہ فلم انڈسٹری میں گروپنگ بہت ہو گئی ہے۔
اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے اداکار نئے لوگوں کو کچھ
نہیں سمجھتے اور نئے فنکار، پرانوں کو نہیں کچھ سمجھتے۔
عجیب سا ماحول ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ
کوئی اچھا اسکرپٹ ہی ہاتھ نہیں آیا۔۔۔۔۔ وہی پرانے
گھسے بے موضوعات کو اپنایا جا رہا ہے۔“

☆ ”فلموں میں بھی ڈراموں کے ہی اداکار نظر آ
رہے ہیں۔۔۔۔۔ لگتا ہے کہ نیا ٹیلنٹ سامنے نہیں آ رہا؟“

”نیا ٹیلنٹ تو بہت آ رہا ہے مگر نئے ٹیلنٹ
میں محنت کا جذبہ نہیں ہے۔ نیا ٹیلنٹ سمجھتا ہے کہ بس
کامل رہا ہے بہت کافی ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔

آپ اچھا ریسائٹس نہیں دو گے تو کب تک چلو گے، ہم
جس دور میں آئے تھے بہت محنت اور پاپز بننے کے
بعد۔۔۔۔۔ بہت محنت کی تھی، تب کہیں جا کر اپنے آپ کو
منوانے لگے۔“

☆ ”پہلے زمانے میں فنکار کو اپنا آپ منوانے
کے لیے بہت تک و دو کرنی پڑتی تھی۔۔۔۔۔ شاید چینل
ایک تھا؟“

☆ ”کیا بات ہے کہ انڈیا کی فلمیں زیادہ
کا میاب ہوتی ہیں؟“

”میں بھی یہی کہتا ہوں کہ ہر فلم میں ہیرو
ہیروئن، ولن، مارڈر، لو، گانے سب کچھ ہوتا ہے
مگر بس پیش کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اچھی
چیز یہ سامتی ہے۔“

☆ ”سید نور کو بہ حیثیت ایک ڈائریکٹر کے کیسا
پایا؟“

”سید نور کی تو کیا ہی بات ہے، بہترین
ڈائریکٹر بھی ہیں اور بہترین انسان بھی ہیں۔۔۔۔۔ فلم
انڈسٹری کے لیے ان کی بڑی قربانیاں ہیں۔“

☆ ”اب ماشاء اللہ آپ سینئر فنکار ہیں۔ کبھی
خیال آیا کہ میں خود بھی ایک فلم بناؤں؟“

”میں نے یہ حیثیت اسٹنٹ ڈائریکٹر کے
سید نور کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا ہے اور میں
فلم میکنگ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن

میری بی سنی

عاصم محمود

شاہین رشید



(10) ”اماؤنٹ تھا؟“

”صرف 7 ہزار تھا۔“

(11) ”میری مادری زبان؟“

”پنجابی..... بہت میٹھی زبان ہے۔“

(12) ”موسم پسند ہے؟“

”گریموں میں سردی اور سردیوں میں گرمی۔“

ہاہا..... مگر ایسا ناممکن ہے..... مگر مجھے سردیوں کی

دھوپ بہت اچھی لگتی ہے۔“

(13) ”کھانے میں خزعے؟“

”نہیں جی..... ہرگز نہیں۔ بھوک لگے اور گھر پر

نہیں ہوں تو کچھ نہ کچھ کھا کر بھوک مٹا لیتا ہوں۔“

(1) ”میرا نام؟“

”عاصم محمود۔“

(2) ”پیار سے بلاتے ہیں؟“

”عاصم ہی بلاتے ہیں کسی نے نام بگاڑا نہیں۔“

(3) ”پیدا ہوا؟“

”1988ء 16 جنوری۔“

(4) ”شہر/قد؟“

”سیالکوٹ/5 فٹ 9 انچ..... اللہ کا شکر ہے

کہ قد اچھا ہے۔“

(5) ”تعلیم؟“

”ایم بی اے۔“

(6) ”میرا خواب تھا؟“

”کہ میں آدمی میں جاؤں یا پھر اپنا بزنس

کروں اور یہ دونوں خواب پورے نہیں ہوئے اور

میں اس فیلڈ میں آ گیا۔“

(7) ”شو بزنس آیا؟“

”اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر۔ آپ کو پتا

ہے جب تک صلاحیت نہ ہو تب تک کوئی لفٹ نہیں

کراتا۔“

(8) ”میں مشہور ہوا؟“

”ڈرامہ سیریل ”علی کی امی“ اور ڈرامہ سیریل

”جنت“ سے۔“

(9) ”پہلی کمائی کسے دی؟“

”اپنی ماں کو۔ گو کہ زیادہ نہیں تھی مگر خوشی بہت

تھی۔“

اپنے پروڈکشن ہاؤس بنا لیے ہیں لہذا مارکیٹنگ کرنا
اور اپنی چیز بیچنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے میں
اپنے کام کو فوقیت دیتا ہوں اپنے کام پہ فوکس رہتا
ہوں۔“

☆ ”کسی چینل کو جوائن کرنے کا خیال آیا؟“
”مجھے تو خیال آتا ہے..... اگر کوئی اچھی پیش
کش ہوئی تو ضرور کسی چینل کو جوائن کروں گا..... اور
چینل جوائن کرنے کے بعد ہی کام کر کے دکھانے کا
موقع ملے گا۔“

☆ ”ڈرامے تو آپ نے لا تعداد کیے، مگر جو
بہت زیادہ مقبول ہوئے، ان کے نام یاد ہوں تو
بتائیے؟“

”اللہ کا شکر ہے کہ میرے تقریباً سب ہی
ڈرامے مقبول ہوئے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو بتاؤں
کہ ”صدقے تمہارے۔ لاہور جنتن۔ فاصلے۔ بدگمان۔ کوئی
پھر وہی محبت۔ لاہور جنتن۔ فاصلے۔ بدگمان۔ کوئی
عشق نہ جانے۔ آنگن میں دیوار۔ مانا کا گھر اندہ۔
کتی گر ہیں باقی ہیں“ کے کئی ڈرامے اور ”یقین کا
سفر“ نے تو مقبولیت کے ریکارڈ توڑے۔ جبکہ آج کل
آن ایئر ڈرامہ سوپ ”میرا حق“ بھی بہت مقبول ہو رہا
ہے اور ”عقرب آپ“ ”گڈی“ کے نام سے جیو سے
ایک سیریل بھی دکھائیں گے۔“

☆ ”اور فلمیں؟“

”فلموں میں ”لڑکی پنجابن۔ سن آف
پاکستان۔ جسم۔ بستی۔ بھی پیار نہ کرنا۔ گلابو۔ سونا
یار۔ ہم ایک ہیں“ اور ”ریونج آف ڈی ورلڈ لیس“
کافی مقبول ہوئیں۔
چلیں جی بہت شکریہ ”شامل خان“ صاحب
آپ کا کافی ٹائم لیا۔

☆☆



میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اکیلے بندے کا کام نہیں ہے
اس کے لیے پوری ٹیم چاہیے ہوتی ہے..... آج کل
کے آرٹسٹ کام کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ پروڈیوسر
پیسہ لگاتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کو پورا
پروڈکٹ دیا جائے..... ایسا کہاں ہوتا ہے..... بس
اس لیے سوچنا ہوں اور پھر ارادہ بدل دیتا ہوں۔“

☆ ”فلم پہ بہت باتیں ہوئیں..... اپنی ڈرامہ
انڈسٹری کے بارے میں کیا کہیں گے؟“
”ماشاء اللہ ترقی کر رہی ہے۔ اور بطور اداکار
میری تو پوری کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنا کام ایمان
داری اور جانفشانی کے ساتھ کروں، کیونکہ یہی ہماری
جاپ ہے اور جاب کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتا۔
اس فیلڈ سے ہمارا رزق بندھا ہوا ہے تو ہمیں تو اچھا
اچھا کام کرنا ہے۔“

☆ ”ڈرامہ پروڈکشن کی طرف آنے کا سوچا؟“
”نہیں، کیونکہ اب بڑے بڑے چینل نے



PakiBooks.Site

”سلطان راہی اور منور ظریف مرحوم۔“

(29) ”خوف زدہ ہو جاتا ہوں؟“

”جب بھی اونچائی سے نیچے دیکھتا ہوں
ٹانگوں سے جان نکلنے لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ
کہ بچپن میں میں ایک بار چھت سے گر پڑا تھا۔“
(30) ”کھانا اچھا کون پکاتا ہے، مرد یا عورت؟“
”میرے خیال میں مرد..... کیونکہ میں خود بہر
اچھا کھانا پکالیتا ہوں۔“

(31) ”گھر سے نکلنے وقت نہیں بھولتا؟“

”اہم چیزوں کو لینا، مثلاً موبائل فون، آ
ڈی کارڈ، والٹ اور لائسنس وغیرہ۔“

(32) ”زیادہ اچھی رائے کون دیتا ہے دل
دماغ؟“

”دونوں کو آ زمانے کے بعد اندازہ ہوا کہ دماغ

کھاتا ہوں۔ ویسے زیادہ تر ہاتھ سے کھانا اچھا لگتا
ہے۔“

(24) ”بچپن کی ایک مار جو ابھی تک یاد ہے؟“

”دادی امی کی ایک پٹی پلائی ”مرغی“ میرے
ہاتھوں سے مرگئی تھی تب دادی نے بہت مارا تھا..... وہ
مارا ابھی تک یاد ہے۔“

(25) ”شانگ میں پہلی ترجیح؟“

”اپنے کپڑے خریدنا۔“

(26) ”کوئی لڑکی بدتمیزی کرے تو؟“

”تو مجھے وہ میری کتاب سے خارج ہے۔“

(27) ”میرے غصے کے علاوہ کس کا غصہ گھر
میں تیز ہے؟“

”میرے والد محترم کا۔“

(28) ”ماضی کا پسندیدہ فنکار؟“

(19) ”وہ وقت اچھا لگتا ہے؟“

”جب ہاتھ میں چیک آتا ہے..... ہا ہا ہا..... یا
پھر جب اپنی فیملی کے ساتھ سیالکوٹ میں ہوتا
ہوں۔“

(20) ”غصے میں رد عمل؟“

”جس پہ غصہ آتا ہے اس سے کچھ عرصے کے
لیے بات چیت چھوڑ دیتا ہوں۔“

(21) ”کس قسم کی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں؟“

”خوب صورت لڑکیاں اچھی لگتی ہے۔“

(22) ”والد صاحب کا تحفہ جو آج بھی محفوظ
ہے؟“

”میرے خیال میں جب ساتویں آٹھویں
کلاس میں تھا تو میرے ابو نے مجھے ایک ”ہیٹ“ لاکر
دیا تھا..... جو مجھے بہت پسند آیا تھا..... اسے میں نے
سنجیال کر رکھ لیا..... اور آج تک میرے پاس محفوظ
ہے۔“

(23) ”کھانا دہی سے طریقے سے کھاتا
ہوں یا انگریزی طریقے سے؟“

”جیسا ماحول ہوتا ہے اسی حساب کھانا
کام غلط بھی ہو جاتے ہیں۔“

(14) ”صبح کی روٹین؟“

”جس دن شوٹ پہ جانا ہو۔ صبح جلدی اٹھ جاتا
ہوں، برش کرنا، نہانا..... پھر جم جانا اور پھر کچھ کھاتا
ہوں۔ اور صبح کی یہی روٹین ہے پھر شوٹ پہ چلا جاتا
ہوں۔“

(15) ”ناشتے میں پسند ہے؟“

”عموماً دلیہ ہی کھاتا ہوں۔ خود ہی ناشتا بھی بنا
لیتا ہوں..... کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔“

(16) ”مجھے اچھا لگتا ہے؟“

”جب لوگ میرے والدین سے میری
اداکاری کی تعریف کرتے ہیں۔“

(17) ”یادگار لمحہ؟“

”لمحہ نہیں، وہ وقت جب کئی ہزار لوگوں کے
ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد میں نے ”ہیرو“ بننے کی
ترنگ“ ایوارڈ جیتا تھا اور یہی ایوارڈ میرے لیے لگی
ثابت ہوا کہ مجھے آفرز آنا شروع ہو گئیں۔“

(18) ”اپنی ناپسندیدہ عادت؟“

”جذبائی بہت ہوں اور جذبات میں آ کر کئی
کام غلط بھی ہو جاتے ہیں۔“

زیادہ اچھی رائے دیتا ہے۔ ورنہ پہلے تو صرف دل کی ہی سنتا تھا۔“

(33) ”خدا کی خوب صورت تخلیق؟“
”انسان.....“

(34) ”اپنا ناشتا خود بنا تا ہوں؟“
”جب کراچی میں اکیلا ہوتا ہوں تو پھر اپنا ناشتا کھانا خود ہی تیار کرتا ہوں اور جب سیالکوٹ میں ہوں تو فرمائش کر کے چیزیں پکواتا ہوں۔“

(35) ”کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“
”کیڑے مکوڑوں سے اور سانپ بچھو سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے۔“

(36) ”محبت کے بارے میں میری رائے؟“
”کہ یہ اندھی بہری اور گنگی سب کچھ ہوتی ہے۔“
(37) ”میری اچھی عادت؟“

”دوسروں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔ وقت پہ ان کے کام آتا ہے۔“

(38) ”میں پیچھتا ہوں؟“
”لوگوں کی میٹھی باتوں میں آ کر اپنے دل کی ساری باتیں ان کے سامنے کہہ دیتا ہوں اور بعد میں پیچھتا ہوں۔“

(39) ”عورت کے بارے میں میرا تجزیہ؟“
”میں نے اکثر دیکھا ہے کہ حسین یا بہت حسین عورت یا لڑکی عموماً عقل سے تھوڑی پیدل ہوتی ہے..... جبکہ دیگر خواتین ذہین ہوتی ہیں اور عورت کو ذہین ہی ہونا چاہیے۔“

(40) ”کہاں سکون ملتا ہے؟“
”اپنے گھر میں اور اپنے کمرے میں۔“
(41) ”والٹ میں کیا کیا رکھتا ہوں؟“
”اپنے ابو کی تصویر..... پیسے، کریڈٹ کارڈ، وزیٹنگ کارڈ اور آئی ڈی کارڈ..... یہ بہت ضرور سمجھتا ہوں۔“

(42) ”وہ بات جو بہت بری لگتی ہے؟“
”کہ کوئی مجھے اس بات کی نصیحت کرے جس کا میری ذات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔“

(43) ”کاش کے لوٹ آئے؟“

”میرا بچپن..... جب کوئی پریشانی نہیں، کوئی سوچ نہیں بس کھیلنا کودنا، کھانا پینا اور پڑھنا لکھنا ہی ہوتا تھا۔ بہت خوب صورت دور ہوتا ہے جو بہت جلدی گزر بھی جاتا ہے۔“

(44) ”جب سیٹ پہ جا کر دیکھتا ہوں کہ؟“
”میں آ گیا ہوں اور دوسرا کوئی نہیں آیا..... کیونکہ میں ہوں وقت کا بے حد پابند اور جب کوئی دوسرا وقت کی پابندی نہ کرے تو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔“

(45) ”بہت خوش ہوتا ہوں؟“
”جب اپنی کمائی سے خریدی ہوئی کار میں بیٹھتا ہوں اور چلاتا ہوں۔“

(46) ”میں چاہتا ہوں کہ؟“
”کہ لوگ میرے ڈرامے دیکھیں اور میری حوصلہ افزائی کریں تاکہ میں مزید اچھے ڈرامے کر سکوں، مزید اچھا کام کر سکوں۔“

(47) ”کھانا انجوائے کرتا ہوں؟“
”چٹائی پہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے میں جو مزہ وہ ڈانگ ٹیل نہیں ہے۔“

(48) ”جب فارغ ہوتا ہوں تو؟“
”مودی دیکھتا ہوں کوئی بہت اچھی سی، یا پھر مطالعہ کرتا ہوں کیونکہ مجھے مطالعہ کرنا اچھا لگتا ہے خواہ کوئی اچھی کتاب ہو، ناول ہو، یا پھر اخبارات۔“

(49) ”فینز کیسے لگتے ہیں؟“
”بہت اچھے لگتے ہیں..... اور ان کی تعریفی باتوں میں آ کر ایک غلطی کر بیٹھتا ہوں کہ ان کو کبیر دے دیتا ہوں..... بس پھر مشکل ہو جاتا ہے ان سے جان چھڑانا۔“

(50) ”جو جی محبت کرتے ہیں؟“
”وہ آپ سے بھی بھی کسی معاملے میں جھوٹ نہیں بولیں گے۔“

☆ ☆

”اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟“

”ج ”اصلی نام صائمہ سحر ہی ہے۔ مگر گھر میں سب ماہیل کہتے ہیں۔“

”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“
”ج ”مس صائمہ اگر آپ ماڈلنگ کریں تو سب بڑی بڑی ماڈل کو اپنے پیچھے چھوڑ دیں۔“ (ماہا ماہا)

”ارے جناب یہ بات آئینے کے علاوہ کبھی بہت سے لوگ مابدولت کو کہہ چکے ہیں۔“

”حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟“
”ج ”تب دل ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے کہ صائمہ بی بی ایک آپ ہی نہیں حسین دنیا بھری پڑی ہے خوب صورت لوگوں سے.....!“

”کھانے میں کیا پسند ہے؟“
”ج ”میں کھانے میں بالکل سادہ کھانا پسند کرتی ہوں، ارے بابا مجبوری ہے، خود کو کف رکھنے کے لیے اور سلم اینڈ سارٹ رہنے کے لیے فاسٹ فوڈز اور پائلی کھانوں کی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔“

”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“
”ج ”کھرے اور سچے لوگ، حق بات کرنے والے، منافقت سے کوسوں دور، ہر بات منہ پر کرنے والے ایسے لوگ مجھے بہت پسند ہیں۔ عموماً ایسے لوگوں کو منہ پھٹ کہا جاتا ہے، کیا یہ کھلا تضاد نہیں.....“

”مزاج لڑاکا ہیں؟“
”ج ”نہیں جی! بہت شریف بچی ہوں۔ بس غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اگر کسی دوسرے کے ساتھ بھی زیادتی ہو رہی ہو تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور اس کا ساتھ دینا میں اپنا فرض سمجھتی ہوں۔“

”اگر آپ کو ایک دن کی حکومت مل جائے“

”ج ”تو میں اپنے ملک کی خواتین کے لیے بہت کچھ کرنا چاہوں گی، (مرد حضرات سے معذرت) ارے بھئی مدد کی ضرورت تو مظلوم کو ہوتی ہے۔“

”ج ”اگر آپ کو ایک دن کی حکومت مل جائے“

”ج ”تو میں اپنے ملک کی خواتین کے لیے بہت کچھ کرنا چاہوں گی، (مرد حضرات سے معذرت) ارے بھئی مدد کی ضرورت تو مظلوم کو ہوتی ہے۔“

مقابلہ آئینہ

صائمہ سحر

اگر

ہے نہ.....!!! آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔“

”ج ”کوئی ایک ہو تو بتاؤں، بہت لمبی فہرست ہے۔ چند ایک بتا دیتی ہوں۔ مان منصب، زین ٹکلیل، عاطف سعید اور..... اور..... صائمہ سحر (ماہا ماہا)

”ارے بابا.....! بیچ میں ہم بھی شاعری کرتے ہیں۔ آپ نہ مانیں تو یہ الگ بات ہے۔“

”ج ”اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟“
”ج ”تو لینے والے کو بہت کچھ ملے گا۔ گولڈ کی جیولری، میک اپ کا سامان، قلم، ڈائری سیل فون، بیل، چاکلیٹ، ٹافیاں اور کیش تو ہو گا ہی۔“

”ج ”مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟“
”ج ”جو میرے ہم مزاج ہوں۔ ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں، ایسے مہمان تو میری جان ہوتے ہیں..... اور جو ایسے نہ ہوں وہ بال جان ہوتے ہیں۔“

”ج ”اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟“
”ج ”تو ہماری لائف اور بھی بڑی ہوتی۔ یہ جو چند لمبے ہیں ایک ساتھ مل کر بیٹھے کول جاتے ہیں، یہ لوڈ شیڈنگ کی بدولت ہی میسر ہوتے ہیں۔“

”ج ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟“
”ج ”بہت فضول خرچ ہوں۔ مگر صرف اپنی ذات کے لیے۔ بھئی دوسروں پر کون فضول خرچی کرتا ہے ٹھیک ہے نہ.....!!!“

”ج ”کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟“
”ج ”جی ہاں بالکل ہوتا ہے۔ میں نے تو آج تک ایسا ہی دیکھا ہے، ایسا ہی پایا ہے۔“

”ج ”اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟“
”ج ”رات کا بھلا..... اور آخری.....“

”ج ”رات کا بھلا..... اور آخری.....“



WITH
COLOR LOCK
TECHNOLOGY™

BLACK ROSE

Color Supreme

PERMANENT
HAIR COLOR
DEEP NOURISHING EFFECTS

AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES



COLOR EXPERTS!

س ”حقیقی خوشی کب ہوتی ہے؟“
ج ”جب میری ماما مجھ سے بہت خوش ہوتی
ہیں۔ (اور ایسا بہت کم ہوتا ہے) کیونکہ میں ہر کام
بہت سلو کرنے کی عادی ہوں اور اسی پہ ماما سے ڈانٹ
پڑتی رہتی ہے۔“

س ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“
ج ”بالکل بھی نہیں۔ صرف اللہ پر یقین رکھتی
ہوں اور اپنی دعاؤں پر.....!!!“
س ”مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ، جس پر عمل
کرتا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟“
ج ”کوئی خاص پلاننگ میں نہیں کرتی۔ کیونکہ جو
وہ چاہتا ہے وہی ہونا ہوتا ہے۔ بس اس سال اپنی ماما کے
ساتھ عمرہ کرنے کی دعا کر رہی ہوں اور تیاری بھی۔“
س ”کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی
ہو؟“

ج ”کہ میں بہت گناہ گار ہو..... اور ایک یہی
بات مجھے نیکی کی طرف مزید راغب کرتی ہے۔“
س ”زندگی سے کیا سیکھا؟“
ج ”فتیب و فراز، اتار چڑھا اور دکھ یہ سب
زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ طرح آنکھیں
بند کر کے نہیں، بلکہ شیر کی طرح ان کا مقابلہ کریں تو
زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔“

س ”اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟“
ج ”پہلے اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی تھی، مگر
اب اپنے کام کی تعریف سن کر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔
جب کوئی نئی کہانیوں، میری شاعری کی تعریف
کرے، پسند کرے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ دل
چاہتا ہے اس کا منہ چوم لوں۔“
س ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“
ج ”بہت کم.....! بہت چوز کر کے دیکھتی ہوں
جو حقیقت کے بہت قریب ہو۔“

فجر کا غائب۔ میں ان دو وقت میں اس ذات کو اپنے
بہت قریب پاتی ہوں۔“
س ”تین لوگوں کی احسان مند ہیں؟“
ج ”لوگوں کا پوچھا ہے تو یہی کہوں گی کہ ہم پہ

اگر کوئی احسان کرتا بھی ہے تو وہ درحقیقت اسی ذات کا
ہم پر احسان ہوتا ہے۔ سو میں بس اپنے اللہ کی احسان
مند ہوں۔ جس نے ایک بہت اچھے انسان کو میری
زندگی بدلنے کا وسیلہ بنایا۔“

س ”آپ کی نظر میں محبت؟“
ج ”اللہ کی دین..... اس ذات کا عطا کردہ
ایک انعام..... ایک نعمت..... ایک ایسا احساس جو ہر
پل..... ہر لمحہ..... ہر وقت ہمارے دل کو اپنے حصار
میں رکھتا ہے۔ ہمیں وہ خوشی وہ سکون اور وہ اطمینان
عطا کرتا ہے جس کا کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوتا۔“
س ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج ”بھوت، بھوتوں سے کیا ڈرے گا؟ بابا ہا میں
بالکل نہیں ڈرتی بھوتوں سے۔ اللہ پر یقین رکھنے
والے میرا نہیں خیال کہ بھوتوں سے ڈرتے ہیں۔“
س ”وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے وقت
خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟“
ج ”میں نے کبھی بھی کوئی بھی کام کرتے وقت
یہ نہیں سوچا کہ دنیا کیا کہے گی۔ وہ کسی شاعر نے کہا ہے
نہ۔“

”دنیا کب چپ رہتی ہے، کہنے دے جو کہتی
ہے۔“
س ”آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہو
اور کتنا پیچھے لگ جائے تو؟“
ج ”تو میں دوڑ میں کتے کو ہرا دوں گی۔ یعنی وہ
میرے پیچھے رہ جائے گا۔“
س ”پچھلے سال کی کوئی کامیابی، جس نے آپ
کو مسرور و مطمئن کر دیا ہو؟“
ج ”کچھ خاص نہیں بس ایم۔ اے انگلش میں
ڈگری لی۔“

رخ چوہدری

سچ کی سحر

لندن کے انتہائی سرد موسم میں بڑھیا نائٹ کلب کی عمارت کے نیچے بیٹھی ہر آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کر کے اپنے پیار شوہر کی دوا اور کھانے کے لیے میسے مانگ رہی تھی کہ اچانک ٹی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑھیا کی جمع شدہ رقم لے کر بھاگ جاتی ہے۔

”سلیم منزل“ کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین جن کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری یعنی نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر نواب سلیم الدین اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کرتے ہیں اور اس پسند میں سلیم الدین اور دونوں بہنوں کی پسند شامل ہوتی ہے مگر حمیدہ خاتون مختلف زبان، مختلف ثقافت اور کم تعلیم یافتہ بہو کو دل سے قبول نہیں کرتیں اور دن رات کڑھا کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزا بجا انتہا بد مزاج، اکھڑ، بات بات پر بیوی کی بے عزتی اور اس پر ہاتھ اٹھانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ظہیر احمد اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں اسما، ثمنینہ، فکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد سخت ضرور تھے مگر بیوی پر ہاتھ اٹھانے کو مرد کی بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عابد اور ساجد جو اسما اور ثمنینہ کے سنگیتر ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو فکیل اور جمیل کی سنگیتر ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔ اب آگے پڑھیے۔

پانچویں قسط



طلاق ایسا لفظ ہے اگر کبھی زندگی میں عورت خود بھی طلاق کا تقاضا کرے اور شوہر اس کے حسب فضا طلاق دے۔۔۔۔۔ دے تو مل بھر کو وہ بھی سنانے میں آ جاتی ہے۔ لمحہ بھر کے لیے سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے، یہاں تو ایک لفظ — طلاق کا کہہ کر لفاظی ایک ایسی بیوی کو تھمایا گیا جو شوہر کو بچپن سے ٹوٹ کر چاہتی تھی جس کی سانس ہر وقت اکڑی رہتی تھی اس کا کیا حال ہو سکتا تھا۔ حسب توقع شہینہ کی سانسیں اکڑ گئیں۔

”طلاق..... طلاق.....“ زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ خشکی کے باوجود بھی پسینہ بہنے لگا، سانس کی تالی کو..... گویا ساجد نے مٹھی میں اتنا کس کر پکڑ رکھا تھا کہ سانس آنا مشکل تھا اور وہ ستم گرا سے اگلے لاوے میں دھکیل کر تماشائے لب جاں دیکھ کر نجانے اپنی کس انتقامی حس کی نشانی کر رہا تھا۔

”میں..... میں..... مر جاؤں گی۔ سا..... ساجد اللہ کے واسطے..... ایسا نہ کریں۔ پا..... پا..... پانی.....“

سینے پر ہاتھ رکھے بند پر گرتے ہوئے شہینہ نے التجا کی تو ساجد نے غصے سے گلاس میں ڈھکا پانی اٹھا کر اس طرف الٹے کیا کہ پانی اچھل کر شہینہ پر گرا۔

”لچھے پانی، عمر یوں سانس روک لینے سے اس طرح مرنے کی ایکٹنگ کرنے سے حقائق بدلیں گے نہیں شہینہ بیگم! ابھی تو اس بد لفاظی میں طلاق نامہ نہیں ہے اور آپ کا یہ حال ہے اگر واقعی ہوا تو.....“

”جی..... جی..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اس میں.....“

”جی، ہاں دیکھیے لفاظی ہے۔“

پھر ساجد نے باقاعدہ لفاظی کھول کر شہینہ کو دکھایا تو..... شہینہ کی پھنسی سانس بحال ہو گئی۔ اسے لگا سکتے انگاروں پر گویا پانی ڈال دیا گیا ہو۔ وہ سینے میں اٹھتی تیسوں کو دبائے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ.....

”یہ، کیسا جان لیوا مذاق تھا کہ ابھی دم رخصت ہو جاتا۔“

مگر ساجد کو اتنا تو علم تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور یہی وہ وقت تھا جب وہ اپنی بات منوا سکتا تھا۔

”کسی گمان میں نہ رہتا شہینہ بیگم! آج یہ لفاظی دانستہ طور پر خالی رکھا گیا ہے لیکن اگر بات نہ مانی گئی تو.....“

ساجد نے لفاظی اس کے سامنے لہرایا۔ اس ”تو“ کے پیچھے کون سی قیامت اس کی زندگی کے در پر دستک دے رہی ہے، وہ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے تو چپ چاپ مختار نامے پر سانس کر دے کہ صاحب ہماری زندگی کی کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے جو چاہے آپ اس کے ساتھ سلوک روا رکھیے۔

”آ..... آپ..... کیا کہنا چاہتے ہیں ساجد!“

☆☆☆

”یہ زاہدہ بیٹی کو کیا ہوا؟“ رقیہ بیگم ابھی تک زاہدہ کے رویے کو سمجھ نہیں پائی تھیں۔ شاہدہ نے ان کو پیار سے صوفے پر بٹھایا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں چچی جان! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ زاہدہ ذرا شوخ سی ہے۔ پھر بھی اگر اس نے دانستہ طور پر یہ مذاق یا بد تمیزی کی ہے تو اسے معافی مانگنی پڑے گی۔“ شاہدہ کو واقعی افسوس ہو رہا تھا زاہدہ کے رویے پر۔

”ارے چھوڑو بیٹی! اب تو تلخ اور سخت رویوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا، اب کسی بات سے.....“

رقیہ بیگم نے صوفے کی پشت سے سر لگایا تو کئی آنسو بوڑھے رخساروں کی جھریوں میں جا چھے۔

”آپ یہ تو مجھ پر چھوڑ دیں چچی جان! ہمارے خاندان کے مرد باپ ہیں، بیٹے ہیں یا بھائی، سب ایسے ہی ہیں

یہاں کو جوتے کی نوک پر رکھنے والے مگر ہمیں تو ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں اپنے سرسرا میں اپنی ماؤں کی تربیت کی لاج رکھنی ہے تاکہ والدہ حضرات..... خیر آپ فکر نہ کریں اس گھر میں اسماء اور یہاں میں ان شاء اللہ ماحول کو کنٹرول میں رکھیں گے۔ آپ فکر نہ کریں بس ٹھیک رہیں، آپ میری ہمت ہیں یہاں پر۔“

شاہدہ سانس کا ہاتھ تھامے، کتنی دیر سہلا، سہلا کر تسلی دیتی رہی۔ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار کیا۔

”اسماء اور تمہاری جیسی بیٹیاں ہی رحمت ہوتی ہیں۔ ماؤں کی ڈھال ہوتی ہیں۔ خوش رہو، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔“

☆☆☆

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ زاہدہ نے جو کہا تھا وہی اس کا مطلب تھا اور ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ شاہدہ کی طرح نیک پرہیزگار کی فرماں بردار بہو تھی۔ بس اپنی ایک سوچ تھی اس کی، مزاج میں سختی، والد کی طرف سے آئی گئی تاہم بڑی بہن کے کھانے پر اس نے باقاعدہ سانس سے معذرت تو کر لی تھی اندازہ ہی اکھڑا تھا۔

”معافی چاہتی ہوں چچی جان! میرا مطلب وہ تو نہیں تھا لیکن چونکہ آپ نے نکال لیا ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔“

”ارے ارے زاہدہ! میری گڑباز۔ تم اور شہینہ میرے لیے ایک حیثیت رکھتی ہو۔ اب چھوڑو، بھول جاؤ اس بات کو۔ ہاں شہینہ سے بات ہوئی تم لوگوں کی۔“ رقیہ بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس بات کو ظاہر کریں جو وہ زاہدہ کے انداز روئے میں محسوس کر رہی تھیں، بات بدل دی۔

”نہیں چچی جان! شہینہ سے ابھی تک تو بات نہیں ہوئی۔ اسماء کا فون آیا تھا، ماشاء اللہ سب ٹھیک ہیں۔“

”جانتی ہوں بیٹا! جو ٹھیک ہیں اللہ ان کو خوش رکھے، مجھے صرف شہینہ کا بتاؤ۔“ اس بات پر زاہدہ کا موڈ بگڑ گیا۔

”چچی جان! یہ جو آپ کی بیٹی شہینہ ہے ناں، ساجد بھیا کو بہت تنگ کرتی ہے۔ ہر وقت تو بیمار رہتی ہے، ساجد بھیا بے چارے شادی کو انجوائے ہی نہیں کر سکے۔ سہاگ رات ہی انہوں نے اس کی وجہ سے ہاسپٹل میں گزاری۔“

زاہدہ نے اپنی ساڑھی استری کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو شاہدہ نے اسے گھورا، اس نے بھی گھور کر اپنی بات کو درست قرار دیا مگر رقیہ بیگم کا دل مٹھی میں آ گیا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اسے کمرے میں آ گئیں۔

”یا اللہ! کیا ہوگا میری بچی کی شادی کا انجام۔ بات تو زاہدہ کی بھی ٹھیک ہے مگر..... مگر کیا کروں، کیا نہ کروں۔“

ادھر متا سکتی رہی، ادھر شہینہ نے اپنے محبوب شوہر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے ساجد!..... آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں۔“

اور پھر شہینہ نے اپنی رقیہ کے حق میں فیصلہ دے کر ظلم توڑ ڈالا کیوں کہ اس کے ستم کر کا تقاضا تھا۔

جینا ہے تو نوک تنجنر جیو
ہم سے تمہاری سانسوں کے ناز اٹھائے نہیں جاتے

معادے پر دستخط کر کے سینے کی دھن میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”ایک بات اور میری منیبہ سے شادی اس وقت تک راز رہے گی جب تک میں چاہوں گا۔“ وہ اپنی سفاکی میں اس کی اذیت کو نظر انداز کر رہا تھا، جو اس کو قلبی اور روحانی طور پر بھوری تھی۔

”جی، جی..... ساجد..... آ..... آپ کہیں تو یہ راز قبر میں لے جاؤں گی۔“ شمینہ نے بامشکل سانس لیا۔
 ”ہوں، ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ اس لفافے میں طلاق ڈال دی جائے گی خواہ عمر کا کوئی بھی پہرہ ہو۔“
 ”ایسا بھی نہیں ہوگا ساجد! آپ مطمئن رہیے۔ مگر پلیز..... پلیز میرے وجود کی اس ذہنی عمارت پر اپنے
 نام کی سختی لگی رہنے دیجیے گا بس، اتنا سا تقاضا ہے۔“
 ”اپنی بات پر قائم رہو گی تو ایسا ہی ہوگا۔“

اور پھر یوں ہوا کہ گزرتی شب کے لمحوں نے شمینہ کی تباہی دیکھی اور چپ چاپ کھمک گئے۔

☆☆☆

”بس باس!“ رائی جواب تک اس پاکستانی شخص کو دیکھ رہے تھے، ملازم لڑکے کی آواز پر چونکے۔
 ”ہوں، ہاں..... کیا کیوں آئے ہو، کیا پوچھ رہے ہو۔“ رائی کا دھیان اس آدمی ہی کی طرف تھا، لڑکا
 حیران ہوا۔

”سر! آپ نے اشارے سے مجھے بلایا ہے۔ میں کسٹر چھوڑ کر آیا ہوں۔“ رائی نے لڑکے کو دیکھا اور
 کاؤنٹر سے اٹھے۔

”ہاں..... آگئے ہو تو اچھی سی کافی دو کپ بنا کر، وہ صاحب جو پاکستانی لگ رہے ہیں، ان کے سامنے
 لا کر رکھو۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

”اوکے سر!“ اور پھر لڑکا حکم بجالانے چلا گیا اور خود رائی اس پاکستانی نظر آنے والے شخص کی طرف
 بڑھے۔

”السلام علیکم!“ رائی نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھایا، آدمی کھڑا ہو کر ان کی طرف بڑھا۔
 ”وعلیکم السلام! آپ.....“ آدمی ان کے پہناتوے اور سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے شک میں پڑا، کہیں

انگریز نہ ہو۔
 ”جی، اس ناچیز کو رائی کہتے ہیں۔“ اردو بولنے پر وہ شخص گرم جوشی سے رائی کے گلے لگا۔

”اوہ تو یہ بزنس شی آپ کا ہے؟“
 اس شخص نے طائرانہ نگاہ رائی کے جنرل اسٹور پلس کافی ہاؤس پر ڈالی تو رائی خوش دلی سے مسکرا دیے۔

انکساری سے سر جھکایا۔
 ”الحمد للہ! تشریف رکھیے۔ اس میں اب کوئی شک نہیں کہ آپ میرے مسلمان پاکستانی بھائی ہیں۔ بس نام

بتا دیجیے۔“ رائی کو عجیب سی خوشی اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا، ایسے تاثرات اس شخص کے جچی تھے۔
 ”جی، مجھے انور خان کہتے ہیں۔ خوشی ہو رہی ہے، یہ سب دیکھ کر کہ میرا پاکستانی بھائی انگلینڈ جیسے ملک

میں.....“
 ”ارے چھوڑیے صاحب! تشریف رکھیے اور جلدی سے بتائیے کہ کافی کے ساتھ کیا لیں گے؟“

”کافی کا تو میں نے ابھی آرڈر دیا ہی نہیں۔“ انور کو حیرت ہوئی۔
 ”تو نہ دیا ہو، صاحب! آج ہمارے مہان ہیں۔ آپ بتائیے آپ کافی کے ساتھ کوئی اسٹیک لینا چاہیں

گئے تو..... بتائیں۔“
 ”ارے بھئی ہمارے میزبان کی مرضی جو کھلا دیں کھالیں گے۔ مگر ہمارے میزبان نے جو ہمیں عزت دی

ہے، اس کا بدلہ نہ شکر یہ۔“
 اور پھر بتائی نہیں چلا کہ سرد موسم میں گرم کافی پیتے ہوئے، انور خان اور رائی کب صدیوں پرانے دوست

بن گئے۔

”تو یہ ہے بات۔ انور! ایسا کرو، آج ڈنر میرے ساتھ میرے گھر پر کرو۔“ اجنبیت اور تکلف کی دیوار
 جانے کب گر چکی تھی۔ کافی کا آخری سپ لے کر انور نے مگ میز پر رکھا۔

”اگر، ہم نے ایک ساتھ ہی ڈنر کرنا ہے تو، یہ ڈنر میرے گھر پر ہوگا۔“
 ”اچھا، ایسا ہے تو ایسا ہی۔ بھابھی کھانا بنا رہی ہیں، کیا؟“ ایک دھندلا سا یہ انور کے چہرے کو چھوٹا گزر گیا۔

”ہاں، بہت اچھا۔ تم آنا ناں بھابھی کو لے کر۔ اپنی بیٹی کو لے کر، اس دیار غیر میں مل بیٹھیں گے تو.....
 شاید ہم ایک دوسرے کے دکھ بانٹ سکیں۔“ انور نے اپنی ٹوپی سر پر جمائی اور کھڑے ہو گئے۔

”ہاں کیوں نہیں، بیگم کو لے آؤں گا، مگر بیٹی کی اپنی دنیا ہے یا یوں کہہ لو کہ ہماری بیٹی ہماری نہیں اس آزاد
 ماحول کی بیٹی ہے۔“ مٹی کے ذکر پر رائی سنجیدہ ہو گئے۔

”اچھا اچھا، سمجھا۔ چلو پھر ملیں گے ڈنر پر۔“

☆☆☆

”دیکھا تم نے منیر! شہلا ہمیں کس طرح آگنور کر رہی ہیں۔“
 ”ہاں دیکھا اور تمہاری تکلیف کو بھی سمجھ رہا ہوں۔ انسان کے لیے، اس انسان کی بے رخی جسے وہ ٹوٹ کر

چاہتا ہو برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ مگر وہ بھی آج کل بہت بریش میں ہے، والد اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کی
 شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ بھی بہت جلدی تو سوچو ذرا وہ لڑکی اپنے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لگانا نہیں چاہتی

سوائے تمہارے تو.....“ منیر نے سموسوں کی ادا سنگی کرتے ہوئے لفافہ تھما، دونوں یونیورسٹی سے باہر جانے والی روڈ پر
 آ گئے۔

”کھاؤ.....“ منیر نے لفافہ اس کے سامنے کیا۔ اس نے بے رخی سے پکڑ تو لیا مگر دل اتنا پریشان تھا کہ
 کھانے کو نہ چاہا، واپس رکھ دیا۔

”تو..... تو منیر! بتاؤ میں کیا کروں۔ میرے گھر کا روایتی ماحول شہلا کو پسند نہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ میں سب
 کچھ چھوڑ چھاؤں کر ان کا بی رہوں مگر.....“ زیر سخت کوفت کا شکار تھا۔ روڈ کے کنارے بڑے سے سیم کے درخت

کے نیچے بیٹھ گیا۔
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا منیر! کیا کروں؟“

”دیکھو، باتو باقی بن جاؤ اور چھوڑ دو سب کو اور اپنا اپنی محبت کو یا..... شہلا سے دست بردار ہو جاؤ۔“
 ”نہیں..... نہیں..... میں ان دونوں میں سے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں، کوئی درمیان کا راستہ بتاؤ کہ شہلا

میرے گھر میں سب کے ساتھ رہے جیسے اس گھر کی دوسری بیویوں رہتی ہیں۔“ منیر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اسے
 کچھ دیر دیکھتا رہا۔

”اوکے، دیکھو منیر! میں ایک آخری کوشش کروں گا، اب آگے تمہاری قسمت۔ شہلا یا تو تمہارے گھر میں یا
 اپنے چچا کے گھر۔“ اور پھر منیر کی ٹھٹھکی دھتھکی رنگ لائی، شہلانے زبیر کو، اس کے گھر والوں کو، مشروط طور پر قبول

کر لیا تھا۔ اپنے حراج کی تمام تر تنگ مزاجیوں کے ہمراہ آنے والی برہم باز شہلا کے لیے محبتوں کی کھکشاں سجادی
 گئی تھی۔

”ماں صدقے..... میرے زبیر پتر دی پسندتے سب نوں زیادہ خوب صورت اے۔ ہے ناں سلیم جی!“ بھولی
 بھالی ساس کی محبت بھری تعریف شہلا کو تو متاثر نہ کر سکی، البتہ دوسری بہوؤں کو ناراض کر گئی۔

”دیکھنا ناں، آپ نے غصہ صاحب! یعنی کہ وہ گندہ رنگ۔ والہ! شہلا بیگم ہم۔ یعنی غلش۔ سب کو

خاندان بھر کی حسین خاتون ہیں، یکے میں بھی اور سسرال میں بھی۔ مگر ہماری ساسو ماں کو میرے جڑے نظر آئے تو شہلا بیگم میں۔“

اب ہوتا تو یہ چاہیے تھا شہلا اتنی ملنے والی عزت اور محبت کو کسی اعزاز کی طرح یا تو میڈل سمجھ کر گلے میں سجالتیں یا ایورڈ جان کر دل اور نظر کے شوکیس میں سجالتیں۔ انہوں نے تو ان اعزازات کو پاؤں کی زنجیر سمجھ لیا، جس کو توڑوانے کی ہر وقت منصوبے بنایا کرتیں۔

☆☆☆

”اباجی! یہ جو ریفہ ہے ناں بڑا کم چور ہو گیا ہے آپ اس کو کھوتے کا پتر بنائیں۔“ چھ سالہ غزین نے آکر گھر کے ملازم کی شکایت کی تو..... چار پانی پر بیٹھ کر حقہ پیتے اباجی ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے اور ساتھ غزین کو ساتھ لگالیا۔

”او پتر جی! ریفہ کم چور ہے، تو اسے بندے کا پتر بنانا چاہیے کہ کھوتے کا پتر..... او میرا بھولا شاہ..... پتر۔“

”کیا بات ہے۔ ملک جی پتر پر بڑا پیارا رہا ہے۔“

”آپ۔ پتر جی نے گلن ای ایسی کی ہے کہ خیر وہ زبیر کا فون آیا ہے، کہہ رہا تھا آپ اسے ملنے کو دل چاہتا ہے۔“

”ہائے، تو آیا صدقے داری جائے۔ اس کو کہنا تھا ناں کہ اپنی دوٹی کو لے کر آئے۔ جب سے شادی ہوئی ہے اک واری وی نہیں آیا، زبیر شہلا کو لے کر۔ میں اباجی اور اماں ہوراں سے زبیر کی شکایت کروں گی۔“ مزیدہ نے حقہ کی ٹوپی اتار اور چور بنے ریفے کی طرف بڑھاٹی۔

”لے، ریفے جھپٹتی نال ہنا کے لے آ۔“

”او بیگم صاحبہ! شکایت کی ضرورت نہیں، وہ زبیر کہہ رہا تھا کہ اس نے شہلا کو گاؤں دیکھنے کے لیے مجبور کر لیا ہے، اس لیے آپ لوگ ذرا چار بندے لگوا کے جوہلی کی صفائی کروادیں۔“

”ہائے، میں صدقے..... دیوے اکبر جی آپ بھی چالاک ہیں۔ اصل بات بتائی ہی نہیں، آپ فون کرو اس سے پروگرام پوچھو۔ میں جوہلی کو دوٹی کی طرح سجادوں کی، آ خر میرا سب چھوٹا دیو جوا رہا ہے۔“

اور پھر شہلا گاؤں بھی آئی اور ساتھ قیامت بھی لائی۔ مزیدہ اور اس کی بیٹیاں شاداب، نایاب ماں سمیت اس کے ارد گرد گھومتی رہیں۔ اکبر بھی بچہ بچہ گیا، مگر شہلا نے زبیر کا جینا حرام کر دیا۔ گویا..... گاؤں کا دورہ تابوت میں آخری کیل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ شہلا کو ہر چیز سے کھن اور بدبو آتی تھی، نند کا قدم قدم پر بچھ جانا، صدقہ اتارا، سب دقیا نوسی باتیں لگیں اور مزیدہ کا یہ کہنا تو گویا قیامت ہی ڈھا گیا۔

”زبیر! یاد رکھیں اس بات تیری بیٹی پیدا ہوئی تو..... وہ میرے غزین کی دہن بنے گی۔ یاد رکھیں، یہ بات میں گھر آ کے سب کے سامنے کروں گی تاکہ سب کو پتا چل جائے۔“

مزیدہ، شگفتہ کی طرح معصوم اور سادہ لوح خاتون تھیں وہ شہلا کی ان نظروں کا مطلب بھی نہ سمجھ سکیں جس سے وہ زبیر کو دیکھ رہی تھی۔ مزیدہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شہلا ان معصوم محبتوں کو سمجھنے کے بجائے، زبیر کو سب سے چھین کر الگ ہو جائیں گی۔

☆☆☆

”زبیر! شہلا زور سے چلائی۔“

”زبیر میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تمہارے گھر والے ابھی تک دور جہالت میں جی رہے ہیں۔ حد ہو گئی وہ وجود جو ابھی..... آج ابھی نہیں، آج کا رشتہ اس گدھے سے لڑے..... اف! بہت ہو گئی زبیر! میرا اور تمہارا رشتہ اسی صورت

آگے بڑھ سکا ہے کہ تم یہ سب چھوڑ دو، ورنہ ہائے ہائے۔ میرا کزن ابھی بھی میرا انتظار کر رہا ہے، یہ تو میں ہی پاگل تھی کہ تمہاری محبت میں اس جہالت گھر میں آجی۔“

”او کے شہلا! سوچتے ہیں۔“

”سوچ کا ہر موزم پیچھے چھوڑ آئے ہیں، مجھے اس دقیا نوسی دنیا میں اب نہیں رہنا، نہ ہی میں آنے والے فیصلہ کرو..... میں یا گھر والے۔“

زندگی ابھی ایسے موز پر بھی لا کر کھڑی کر دے گی کہ اسے شہلا اور گھر والوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا تو وہ کیا فیصلہ کرے گا۔ نہ ہی محبت کرتے وقت اس نے سوچا تھا کہ شہلا جیسی روشن خیال بڑھی لکھی اور کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے محبت کرنا اتنا مہنگا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچا ہوتا تو شاید محبت ہی نہ کرتا مگر اب تو اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

گھر بھر کے افراد کھڑے تھے، شگفتہ خاتون کا رو رو کر برا حال تھا۔ بہنیں الگ سک رہی تھیں، بھائیوں نے شانہ بابر کنبھانے کے لیے کہا مگر زبیر تو اپنی محبت، اپنی شہلا کو دیکھ رہا تھا جو سر پر دو پٹار کے بغیر روایت شکن کی تصویر بنی، تن کر کھڑی شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی رشتے سے متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔ کسی قسم کا سمجھوتہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تب سلیم صاحب نے چپکی بار شکستہ دل کے ساتھ فیصلے کی تلواریں لٹکے بیٹے کو دیکھا۔ پھر ملکتی شگفتہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”شگفتہ خاتون! آپ زبیر کی والدہ ہیں، شاید آپ ہمارا فیصلہ سن نہ پائیں، بہتر ہوگا آپ اپنے کمرے میں جاویں۔ بشری بیٹی اپنی والدہ کو لے جائے۔“

”جی ابا جان! آئیے ای ای جان۔“ بشری نے آنچل سے اپنا چہرہ صاف کیا، شاکی نظروں سے زبیر اور شہلا کو دیکھا اور شگفتہ کو زبردستی لے گئیں۔

”زبیر میاں! ہم دیکھ رہے ہیں آپ فیصلہ نہیں کر پارہے۔ آپ بہت مشکل، دکھ اور اذیت کا شکار ہیں۔ ہم آپ کو جانے ہیں، آپ بچپن ہی سے نازک رہے ہیں، فیصلہ کرنے کی صلاحیت شاید آپ میں ہے نہیں۔ خیر اتنا تو ہم جان گئے ہیں کہ آپ شہلا بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتے اور نہ ہم ایسا چاہتے ہیں۔ ہم تو چاہتے تھے رشتوں کا یہ قائلہ پرانے اور نئے رشتوں کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا رہے لیکن شہلا بیٹی رشتوں کی اس مالا کو توڑنا چاہتی ہیں تو.....“

”بوتلے بوتلے سلیم میاں کے سینے میں اک ٹیس سی اٹھی، سلیم اور ہم آگے بڑھے۔“

”ابا جان.....“ زبیر نے تو زبیر بھی مگر وہ جانتے تھے محبوب بیگم کی کڑی نگاہ ان پر ہے، لہذا وہیں جتے کھڑے رہے۔ شہلا کی بات پارشتے سے متاثر ہوئے بغیر غصت سے ہونٹ کیڑے، دیکھ اور سن رہی تھیں۔

”ابا جان! پاپی لیجیے۔“ غصے نے آگے بڑھ کر باپ کو پانی پلایا۔ لمحائی سکوت نے سب کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

”زبیر میاں! آپ کو کچھ احساس ہو رہا ہے کہ ابا جان دکھ کے کس خاردار جنگل سے گزر رہے ہیں۔“ بشری ہواں کو کمرے میں چھوڑ کر واپس آئی تھیں، باپ کی محبت میں ہمت کر کے زبیر کے قریب آئیں، مگر تو انہوں نے سر کوٹھی مٹی مگر وہ سر کوٹھی زبیر سے پہلے شہلا کے کانوں سے جا ٹکرائی۔

”حد ہے، یعنی کہ حد ہے زبیر! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کے ماڈرن اور ایجوکیٹڈ ماحول میں بھی اندھی، بہری محبتوں کا واسطہ دے کر، دوسروں کو اپنی بات منوانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔“

بشری خاتون کی سر کوٹھی کا جواب شہلا بیگم نے کچھ اتنی آواز میں دیا کہ سب اس کو دیکھ کر رہ گئے۔

”چلیے، چھوٹی بھابھی شہلا خاتون ہم نے مان لیا کہ ہم تو ناستے پڑھے لکھے، نہ روشن خیال، نہ ماڈرن.....“

27

اس لیے ایسا کر رہے ہیں لیکن آپ تو بہت پڑھی اور روشن سوچ کی حامل خاتون ہیں۔ آپ بھی تو محبت کو تادان کی صورت استعمال کر رہی ہیں، زیر کو زار ہی ہیں۔“

”بشری خاتون! آپ سے کس نے بولنے کو کہا تھا؟“

سلیم صاحب کو بیٹی اور بیہوش میں ٹکڑا رکھی پسند نہیں آئی۔ ان کی تیز آواز سے ماحول پر پھر سکوت چھا گیا۔

”خاتون..... خاتون، ہونہ! نہ جانے کس دور جہالت میں جی رہے ہیں یہ لوگ۔ میری غلطی تھی کہ زیر کی محبت میں آ کر گھائے کا سودا کر بیٹھی۔ آپا بیگم اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں غلط کر رہی ہوں تو اپنے بھائی سے پوچھ لیجئے، انہوں انگریسٹ سائن کیا تھا کہ میں کچھ عرصہ ہی یہاں رہوں گی پھر ہم الگ گھر میں رہیں گے اور میں نے اتنا عرصہ جو یہاں پر گزارا ہے ایک طرح جو اسٹیکل سسٹم کو ٹیسٹ کیا تھا، وہ بھی زیر کے کہنے پر۔“

”شہلا کی نفرت، ان چاہنے والوں کی اپنائیت اور محبت کو روکنے والی شہلا کے منہ پر اپنی انگلیوں کو آٹکھیں موند لیں۔ کتنا جی چاہا تھا، اپنے اسٹے پیارے اور معزز رشتوں کو پامال کرنے والی شہلا کے منہ پر اپنی انگلیوں کو چھاپ دیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ایسا کرنا اس کی تربیت کا حصہ نہیں تھا جہاں ہمیشہ عورت کی عزت کرنی سکھائی گئی تھی اور وعدہ کر کے وعدہ خلافی ان کی مردانگی کی تو جہنم تھی۔ لہذا وہ خطی میں بھی اپنے اندر اترتے پسینے کے قطرہوں کو محسوس کرتے رہے۔ مگر لب کشائی کی ہمت تھی نہ ہی جرأت۔ انہوں نے کھلی آنکھ سے والد کو دیکھا، بے ادبی سمجھا، ذرا کی ذرا پلٹک اٹھائی۔ کتنے عجیب اور مختلف لگ رہے تھا اباجان، ان کا نوابی جاہ و جلال کہاں چلا گیا تھا۔ شاید ایسی گستاخ اولادوں کے والدین کی عزت یوں ہی دھندلا جایا کرتی ہے اور وہ ڈھے جاتے ہیں۔“

”دیکھئے شہلا بیٹی! آپ کے اور ہمارے صاحب زادے کے درمیان جو بھی معاہدہ ہوا ہے، رشتوں کی سوداگری ہوتی ہے، ہمیں اس سے انکار نہیں۔ آپ اور زیر میاں ہماری طرف سے آزاد ہیں۔ آج ہم ان کو اپنی منقولہ یا منقولہ جاںکداسے عاق تو نہیں کرتے البتہ اپنی محبت اپنی شفقت اور قربت سے عاق ضرور کرتے ہیں۔ آپ دونوں جہاں چاہیں جائیں، رہیں..... لیکن بیٹی! ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، رشتے نبھانے کے لیے ہوتے ہیں، ٹیمٹ کرنے کے لیے نہیں۔ زیر میاں آپ کو اجازت ہے، جایے۔ اپنی دنیا آباد کیجیے، جایے۔“

چھڑی پر سلیم صاحب کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی یا وہ خود لرز رہے تھے۔

”اباجان! ہمیں..... ہمیں معاف کر دیجیے۔ اباجان اللہ کے واسطے ہمیں معاف کر دیجیے۔ کاش..... کاش ہمیں معلوم ہوتا۔ شہلا بیگم کی محبت کا عرفیت ہمیں لوٹ لے گا، ہماری محبتوں کو رشتوں کو مار ڈالے گا تو..... تو ہم گھائے کا یہ سودا نہ کرتے، لیکن..... ہم آپ کی اولاد ہیں۔ کچھ وعدوں کے اسیر ضرور ہیں لیکن ہم اپنی بیگم شہلا کو آپ سب کے سامنے بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان کو یہ سب پسند نہیں تو ہم اپنے وعدے کے مطابق ان کے ساتھ ضرور جا رہے ہیں مگر صرف ہمارا جسم ان کے ساتھ جا رہا ہے۔ ہمارا دل ہماری روح ہمیں اباجان کے قدموں میں پڑی رہے گی۔ زندگی بھر جب تک اباجان ہمیں معاف نہ کر دیں، پھر سے اپنی پیدلانہ شفقت کی آغوش میں نہ لے لیں۔ چلیے شہلا بیگم! دل اور روح کے بغیر ہمارے اس ڈھانچے کو۔ جہاں چاہیں لے جائیں۔“

☆☆☆

”اتنی معصوم مت بنو شہلا بیگم، گویا کچھ نہ جانتی ہو۔ یہ فارم ہے، دوسری شادی کا اجازت نامہ ہے۔“

”دو..... دوسری شادی.....“

پہلی بھر کے لیے شہلا کو اپنے جان جسم سے نکلنے محسوس ہوئی۔ دم گھٹتا ہوا محسوس کیا تھا، وہ مرغ بھل کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مانی بے آب کی مانند اور دم گرم، چند ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑا تڑشا دکھ رہا تھا۔ کس قدر ذلت آمیز جان، لیوا احساس تھا کہ وہ جس شخص کو بچپن سے جانتی تھی، جس سے

منسوب ہونے کے بے شمار خواب اس کی پلکوں تلے روشن تھے۔ وہ شخص کسی اور کی محبت کا دم بھر رہا تھا۔ اپنی زندگی کو اس عورت کے حصول سے مشروط کر رہا تھا، کچھ بھی تھا فیصلہ تو اس کو اس ستم گر کے حق میں کرنا تھا۔ اب چاہے سچے میں دم کھٹ جاتا یا خواب لہو لہو ہو کر آنکھوں سے نکلتے۔

”کیوں، کیا ہوا..... میں تو تمہیں سائن کرنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ یہ فارملی اخلاقی قدر نبھانے کے لیے اور دوسرا اپنی اور تمہاری طرف کے بے وقوف لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے پوری کرنا چاہتا ہوں۔ سائن کرنی ہو یا“

”وہ جلا دو خنجر پر خنجر چلائے جا رہا تھا جبکہ وہ تو ایک ہی دار میں فنا ہو چکی تھی۔ بولنے کے لیے ہمت جوڑ رہی تھی۔“

”آپ..... آپ تو اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں، ساجد میری اجازت کی اگر آپ کو اسی لیے ضرورت ہے یہاں آپ نے بتایا تو..... تو بیجیے میں یہ آپ کی اخلاقی مجبوری بھی ختم کرتی ہوں۔ آ..... آ..... آپ منیبہ سے شادی کر سکتے ہیں۔“

لرزتے ہاتھوں نے اجازت نامے پر سائن کر کے اپنی زندگی میں اپنی سوگن کے لیے دروازے کھول دیے۔

”اب اگر آپ اس انتظار میں ہیں کہ سائن کرنے پر میں آپ کا احسان مند ہو کر شکر یہ ادا کروں گا تو بھول نہ آپ کی۔ تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ باقاعدہ اجازت لے کر یہ کام کر رہا ہوں ورنہ.....“ وہ اس کے لڑتے وجود کو سنبھالنے کے بجائے پیپر لیے باہر نکل گیا اور وہ سینے میں اٹھتی ٹیسوں کو دبا بی۔ پھنسی سانسوں کو کھینچ کھینچ کر لیتی بیندروم پر گر گئی۔

☆☆☆

”منیبہ! میں نے شہلا سے اجازت لے لی، میں تمہارے لیے یہ سب کر رہا ہوں اور تم کہہ رہی ہو.....“

”یہ یادنی ہے۔ تمہارے بھائی نہیں مانیں گے۔“

”ساجد آپ مرد ہیں، سمجھ نہیں سکتے۔ ایک تو یہ کہ شہلا کو پریشرا ناز کر کے آپ نے اجازت تو لے لی، مگر میرے بھائی بھابھی اور..... اور..... دوسرے رشتہ دار۔“

منیبہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ساجد محبت میں یہ بھی کر گزرے گا اس کی شہلا کے ساتھ شادی کے بعد تو شہلا نے محبت کو نامرادی کی قبر میں اتار کر مبر بھی کر لیا تھا کہ ساجد حد سے گزر گیا۔ نئی نویلی دلہن سے دوسری شادی کا اجازت نامہ بھی سائن کروا لیا۔ کیا گزری ہوگی شہلا کے دل پر، وہ..... وہ تو اسے بچپن سے جانتی تھی۔ ساجد نے کیا ظلم کر دیا تھا، ہمیشہ عورت شہلا کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی، ہر چند کہ وہ ساجد کو بے حد چاہتی تھی مگر ایک عورت کے شہر کو بانٹ کر وہ خوشی حاصل نہیں کر سکتی تھی، اسی لیے اس نے صاف منع کر دیا تو ساجد آپ سے باہر ہو گیا۔

”اوکے، تو تم اس صورت میں بھی مجھ سے نکاح پر تیار نہیں ہو۔ میرے مقابلے میں اب تمہیں اپنے بھائی بھابھوں اور رشتے یاد آ گئے ہیں۔ عورت پن یاد آ گیا ہے، لیکن یاد رکھو تم اس طرح انکار کر کے شہلا سے کوئی اچھائی نہیں کر رہی ہو۔ تم نے میرے ساتھ نکاح نہ کیا تو کھر جاتے ہی شہلا کو طلاق دے دوگا۔“ ساجد شدت جذبات اور غصے میں آ پے سے باہر ہو رہا تھا، منیبہ کا دل کھٹکی میں آ گیا۔

”ساجد! یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”صرف یہ کہیں رہا، کر کے دکھا دو! گا اور اس کے بعد نہ تم، نہ وہ! میری زندگی میں کوئی عورت نہیں ہوگی۔“

منیبہ جانتی تھی ساجد جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ وہ بری طرح پھنسن گئی تھی۔ بات صرف اس کی حد تک ہوتی تو وہ انکار کر دیتی مگر اب تو ساجد نے شہلا کو طلاق دینے کی دھمکی دے دی تھی اور وہ جانتی تھی یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ وہ ایسا کر گزرنے کا اور منہ جیسی اچھی لڑکی ایک ایسی ہی جیسی لڑکی کا انتخاب کرنا اور اس کا سہارا لینا.....

چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے، ساجد جیسا آپ چاہتے ہیں، میرے بھائیوں سے بات کر لیجیے اگر وہ مان جائیں تو..... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کا عمر بھر کا ساتھ ہی میری خوشی ہے۔“

بعض اوقات ہمیں خوشیاں اسی طرح مل رہی ہوتی ہیں کہ ہم ان کو اپناتے ہوئے بھی خوف زدہ ہو رہے ہوتے ہیں۔ ساجد، منیہ کی پہلی محبت تھی اور اس کو پانے کے لیے اس نے اللہ سے کتنی دعائیں مانگی تھیں مگر اس کا ساتھ مل بھی رہا تھا تو اس طرح کہ وہ نہ خوش ہو پاری تھی نہ رو پاری تھی۔ یہ اللہ کی مصلحت ہی تو تھی، اس جواب پر ساجد کچھ دیر اسے خاموش نظروں سے دیکھتا رہا پھر چپ چاپ چلا گیا۔

☆☆☆

”بس بھی کریں امی جی۔ رو رو کے آپ نے اپنا حال برا کر لیا ہے۔ وہی ہوتا ہے ناں جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اب ہمت کریں، حوصلہ کریں امی جی! اپنے آپ کو سنبھالیں، میں ابا جان کو دیکھتی ہوں۔“ بشری خاتون نے مختلف خاتون کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

زیر کا گھر سے چلے جانا کوئی معمولی حادثہ یا واقعہ نہیں تھا کہ کچھ دیر بعد ہی سب معمول پر آ جاتا۔ گھر کا سب سے چھوٹا، سب سے لاڈلی بیٹا ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا یا نکال دیا گیا تھا۔ وہ تو یہ جانتی تھیں زیر چلا گیا تھا، ممتا کے آنگن میں سناٹا ہو گیا تھا اور اب ان کو تا عمر یا نجانے کب تک ان سناٹوں کو لینا کر دونا تھا۔ اب دوسری بہنیں یا بیٹے جتنا بھی ان کا درد دیکھنے کی کوشش کرتے، مختلف کو لگتا درد بردھتا جا رہا تھا۔ ان کے مزاج کی مختلف زبیر کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ سلیم منزل میں ایک عجیب سوگ کی فضا تھی ہر کوئی دھمی دھمی اور دیران دل لیے ایک دوسرے سے آنسو چھپاتا پھر رہا تھا۔

”ابا جان! اٹھو! سا کھانا کھا لیجیے، آپ کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔“ بشری خاتون نے پہلے اپنے آنسو صاف کیے اور پھر نوالہ والد کے منہ کی طرف بڑھایا جو انہوں نے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا تو زندگی میں پہلی بار بشری، والد کے شانے سے سر لگا کر شدت سے رو پڑیں ورنہ تو وہ گھر بھر میں سنگ دل مشہور تھیں۔ سب کو یہی اعتراض تھا کہ کچھ بھی ہو جائے بشری خاتون کی پلک نہیں جھپکتی۔ آج بھائی کی جدائی اور ماں باپ کی حالت نے ان کا دل خون جگر میں ڈبو دیا تھا۔

”اللہ کرے شہلا خاتون آپ بھی تمام عمر سکون قلب کو ترسیں۔ آپ نے ہمارے والدین کو اولاد کی جدائی اور گستاخی کا صدمہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ایسے ہی صدمے سے دو چار فرمائے۔“ ہم انسان ایسے ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو نہیں جانتے سمجھتے، بس کسی سے تکلیف پہنچے تو بددعا دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ہمارے مقروض کو بھی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی اپنے اعمال کی، مگر ہمارا رب وہ کرتا ہے جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

☆☆☆

”تو میرے بھائی راہی یہ تھی۔ میری کٹھا کہانی، کبھی کبھی ہم بہت گھانے کا سودا کر بیٹھے ہیں۔ ایک محبت کے عوض محبتوں کا خزانہ ہی لٹا دیتے ہیں اور میں نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا اور ایک محبت پانے کے لیے محبتوں کا خزانہ ہی لٹا دیا اور آج نتائج بھگت رہا ہوں۔ میرا بھرا بڑا خاندان ماں باپ، بہن بھائی..... میں نے سب کچھ گنوا دیا، اس ایک عورت کی خاطر اور اس عورت نے مجھے یہ زندگی دی، نہ دن کا سکون، نہ رات کا آرام۔

تین بیٹیاں اس ماحول کی پیداوار، اس ماحول کا حصہ۔ ایک بدتمیز گستاخ، ٹام بوائے۔ مہی بیٹا، جس کے عورت اور مرد ہونے کی شناخت بھی مشکل ہو گئی۔ لڑکیاں لڑکے اور لڑکا لڑکی بنا پھر رہا ہے۔“ انور خان نے اپنا زخم

نورودہ دل کھول کر اپنے نئے دوست راہی کے سامنے رکھ دیا تھا اور پھر ساؤنڈ ٹیبل پر رکھے کئی ٹشو نکال کر چہرہ صاف کیا، راہی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔

”ہمت سے کام لو یا ر! تم تو بالکل ڈھسے گئے ہو، دیکھو۔“

”ہمت..... کیسے کروں ہمت یا ر! راہی میں نے محبت کے میدان میں بڑے گھانے کے سودے کیے ہیں۔ ایک محبت کو پایا بے شمار محبتوں کو گنوا دیا ہے۔ کتنا خوب صورت تھا میرا گھر جہاں ابا جان کی خاموش محبت تھی، والدہ کی دعاؤں کا ممتا بھرا سایہ تھا۔ سب کچھ..... سب کچھ گنوا دیا میں نے اس عورت کی خاطر اور یہ مجھے گھر کا سکون نہ دے پائی، نہ بچوں کی دینی اخلاقی تربیت کر سکی۔ خود بھی مغربی رنگ میں رنگ گئی اور بچوں کو بھی اس گند کے نوالے کر دیا۔ میری مثال تو اس بھگے ہوئے مسافر کی سی ہے، آگے کا راستہ معلوم نہیں پیچھے کے راستوں پر خود اسے خار بچھا دیے ہیں کہ.....“

اور جانے کب تک انور پچھتاوے کی قبر میں بیٹھے لوح خوانی کرتے رہے اور ان کے سامنے چپ چاپ بیٹھے راہی کو بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ انہیں تسلی دیں۔ ٹھنڈ بہت ہو گئی تھی، راہی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”راہی بھائی! آپ آتے جاتے رہے گا۔ مجھے رویکا کی صورت میں ایک اچھی دوست مل گئی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں، انور بھی آپ کے ساتھ بہت خوش ہے۔ ورنہ تو یہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔“ نجمہ نے شوہر کو دیکھا، طنز پر لبہ سخت نظر۔ انور نے اسے صرف گھورنے پر اکتفا کیا اور راہی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے۔ راہی مرد ہونے لگی۔

”جی جی بھابھی! ان شاء اللہ اب ہم ملتے رہیں گے اور انور میں تو نہ جانے کیا بات ہے کہ میں سمجھتا چلا گیا تھا اس کی طرف۔“ راہی نے انور کو دیکھا، جو اب بھی ماضی کی تلخی یادوں کے کرب میں ڈوبا لگ رہا تھا، رویکا زور سے ہنسی۔

”چلو نجمہ! اب کم از کم ہمیں ملنے سے روکا نہیں جائے گا۔ اب تم لوگ میرے گھر اور بچوں کو ضرور لانا۔“ اپنی گرہنوں کی اور دستاں کے چڑھاتے ہوئے رویکا نے نجمہ کو دیکھا۔

”ارے بھئی، بچوں کی اپنی لائف ہے ان کا تو نہیں کہہ سکتی البتہ خود ضرور آیا کروں گی۔“

”اوہ کے پھر چلتے ہیں، برف باری شروع ہو گئی تو ٹکنا مشکل ہو جائے گا۔“

وہ چاروں باہر نکلے تو موسم شدید سرد تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ سکر رہے تھے، وہاں سے نکلے ہی تھے کہ برف کی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔

”واپس آن کر دو، راہی کہاں گم ہو۔“ اسکرین پر برف کی پھوار پڑنے لگی تھی، راہی واقعی گم سم سے تھے۔

”ہاں۔“ واپس چلا کر راہی نے بیڑا آن کر دیا۔

”کسی لگیس نہیں بھابھی؟“ راہی نے سادہ سے لہجے میں کہا تو رویکا نے انتہائی طنزیہ شکل بنائی اور باہر

☆☆☆

اور پھر موسم آتے جاتے رہے، رتیں بدلنے لگیں۔ پرانے سایہ دار درخت ختم ہو چکے تھے۔ سلیم منزل میں

سے مہک اٹھا تھا۔ جس رتے پر پہلے ابا جان اور اماں جان فائز تھے اب وہاں گنگتہ بیگم اور سلیم تھے۔ اب وہ دادا اور دادی جان، نانائیں بن چکے تھے۔ وسیم، حکیم اور غیر کے بیٹے بیٹیاں، دادا جان، دادی جان کہہ کر لپٹا کرتے تو دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا کر زہیر کے بچوں کو تلاش کرتے۔

”میں نے کہا سلیم جی! زہیر کے بھی خیر سے بچے تو ہوں گے ناں۔“ گنگتہ ماں تھیں خود پر اختیار نہ رکھ پائیں تو کہہ ہی اٹھیں۔

”ہوں، ہاں..... کیوں نہیں یقیناً ہوں گے۔ بیٹے بھی بیٹیاں بھی۔ ویسے کیا مطلب ہے آپ کا گنگتہ بیگم..... یہ..... یہ..... آپ کیا فضول ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مت دل جلایا کیجیے نہ اپنا، نہ ہمارا۔“ پدرانہ شفقت کی رو میں کہہ کر سلیم ایک دم جھینپ کر بات بدل گئے تو گنگتہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”دل پر ہاتھ رکھ کر کہو سلیم جی، آپ کو زہیر یادیں آتا۔“ سلیم دل سے اٹھی میسوں کو سختی سے دباتے اٹھ گئے۔

”نہیں۔ اور..... اور آئندہ ایسا سوال مت کیجیے گا۔“

”ابا جان! نماز کے لیے چلیے گا یا گھر پر ادا کیجیے گا۔“ وسیم نے آگے بڑھ کر چھری ان کے ہاتھ میں تھمائی۔

”نہیں، ہم مسجد ہی جایا کریں گے جب تک ایک سانس بھی باقی ہے، چلیے اور واپسی پر والدہ کو سمجھائیے گا، سیراب کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیں، ورنہ.....“

”جی، ابا جان! میں اماں جان کو سمجھا دوں گا مگر آپ تو خود سمجھ دار ہیں ناں، پھر بھی آپ دونوں نے زہیر کی جدائی کو سینے سے لگا رکھا ہے اور گستاخی، معاف، سچ پوچھیے تو ہم سب بہن بھائیوں کو آپ دونوں سے شکایت ہے۔ ایک اولاد کی محبت میں آپ نے ہم پانچ بچوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مزید آپ نے یہاں آنا چھوڑ دیا ہے۔ زہیر ہی آپ کا بیٹا تھا، ہم سب جو آپ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے ہیں، آپ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ مگر آپ صرف ایک زہیر کی محبت میں ہم سب کو بھلائے بیٹھے ہیں۔“

یہ وہ شکوہ اور خیالات و جذبات تھے، جو سب بہن بھائیوں کے تھے مگر ان کی ادائیگی کی کسی میں جرأت نہیں تھی لیکن آج وسیم نے ہمت کر کے کہہ ہی ڈالا تو سلیم صاحب ذرا لرزے پھر تخت پر بیٹھ گئے۔

”ابا جان اور اماں جان ہمیں ہمارے ہتے مسکراتے والدہ والدہ کو لٹا دیجیے۔“ چند منٹ خاموشی سے گزر گئے پھر سلیم صاحب نے گنگتہ خاتون کو دیکھا۔

”اچھا میاں! نماز تو ادا کریں، واپسی پر سوچتے ہیں۔ کیا کرنا ہے، کس کو کیا لوٹانا ہے اور..... ویسے آپ کی یہ والدہ تو اب بزرگ ہو گئیں ان کی شوشی گنگتہ کی تو رخصت ہو چکی، اب آپ سب کے مطالعے کے بعد ہم نے آپ کے لیے دوسری والدہ لانے کا پروگرام بنایا ہے۔ کیوں گنگتہ خاتون! اجازت ہے۔“ سلیم صاحب کے انداز سے معلوم ہو گیا تھا کہ انہوں نے وسیم میاں کی بات کو سمجھ لیا ہے اسی لیے شوشی سے گنگتہ بیگم کو دیکھا تو انہوں نے شوہر کے شوشی کے پیچھے چھپے مقصد کو سمجھتے ہوئے، ان کو گھورا۔

”وسیم! پتر اپنے ابا جی سے پوچھو اپنی ٹانگوں کے ساتھ مسجد جائیں گے یا ٹانگوں کے بغیر۔“ والدہ کی بات پر وسیم نے دونوں کی پیشانی پر پیار کیا۔

”آپ نے تو دل خوش کر دیا ہے اماں جان! اللہ تعالیٰ آپ دونوں کا سایہ ہم پر تادیر سلامت رکھے۔ چلیے ابا جان! جماعت ہونے والی ہے۔“

☆☆☆

”اپنا خیال رکھا کر ٹھینہ! دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔“ اسماء نے ٹھینہ کے سر پر سرسوں کے تیل کی

”کیا خیال رکھوں آ یا اپنا، ساری زندگی اپنا ہی تو خیال رکھا ہے۔ کبھی یہ دوائی کبھی وہ سیرپ۔ اب تو قبر میں ہی سکون آئے گا۔“ ٹھینہ نے حلق میں پھینے آنسوؤں کے گولے کو نیچے اتارا اور کروٹ لے کر لیٹ گئی تو اس کے لیے دودھ گرم کر کے لائی، اس کی پھلکی میں زارا نے سن لیا۔

”دیکھ لیا ناں خالہ جان! امی ہر وقت ایسی ہی ہولانے والی باتیں کیا کرتی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتیں کہ ہم تینوں کا کیا ہوگا۔“

زارا، سارہ سے چھوٹی اور عمارہ سے بڑی تھی اور کچھ باغی سوچ بھی رکھتی تھی۔ ماں کی زیادہ قریب بھی یہ ہی تھی۔ باپ کے رویے کی وجہ سے اسے اپنے باپ ساجد سے بھی وہ محبت محسوس نہیں ہوتی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ زارا کی آواز پر ٹھینہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی کیونکہ زارا کی جان پر بن جاتی تھی اگر وہ ذرا بھی بیمار ہوتی۔

”ٹھینہ! کیا کرتی ہو، ہم بیٹیوں کی ماں ہو، اپنا خیال رکھا کرو۔ چلو اٹھو، دودھ پی لو۔“

”ارے بھئی، آپ خالہ بھانجی تو میری جان کو آ جاتی ہیں۔ لاؤ..... لاؤ زارا! اور وہ دوا بھی دے دو، کھا کر ایک ساتھ ہی لیٹوں گی۔“ زارا نے دودھ میز پر رکھا اور ماں کو دوا نکال کر دینے لگی، اسی وقت فہد، کرکٹ کا شوقین ہاتھ میں بلا پکڑے، سلام کرتا آ گیا۔

”السلام علیکم گرلز! کیا حال ہے اور سالٹی کیسی ہو؟“ فہد نے شوشی سے پہلے اسماء کو پیار کیا پھر لیٹی ہوئی ٹھینہ کی پیشانی پر پیار، دونوں کی دعائیں ملیں۔

”جیتے رہو۔ فہد بیٹا! اللہ تعالیٰ لمبی زندگی دے، بے شمار کامیا بیاں دے۔“ ٹھینہ نے محبت سے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر پیار کیا۔ ماں کے سر کے نیچے تکیہ برابر کرتے ہوئے زارا نے شوشی سے فہد کو دیکھا۔

”بھولی ماں! کامیابی اس کو ملتی ہے جو محنت کرتا ہے اور یہ موصوف جس ٹیم میں ہوتے ہیں اس کو ہر اوکر میاں بجاتے آ جاتے ہیں۔ سارا دن بیچ کر کھڑے ہو کر ٹنگ ٹنگ کر کے بور کرتے ہیں۔ پھر جب کھڑے کھڑے تھک جاتے ہیں تو کسی بھی فیلڈر کو آسان بیچ تھا کر بلا لہراتے آتے ہیں، گویا ڈبل پختی بنائی ہو۔“ اس بات پر فہد گہری نظروں سے زارا کو دیکھتا، اس کے قریب آیا۔

”میڈم! مجھ جی، سی گمان میں نہ رہنا، ایک دن تمہیں سچ کر لوں گا۔“

”اور پھر ڈراپ کر دوں گا، ہے ناں۔“ زارا مسخرانہ انداز میں ہنسی تو اسماء اور ٹھینہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”ان کو منع کریں آ یا! ابھی مذاق مذاق میں یہ دونوں سنجیدہ ہو کر لڑنے لگیں گے اور..... اور.....“ ٹھینہ کی سانس اب بھی زارا نے فوراً ماں کو دیکھا، فہد ہنسنے لگا۔

”تم بھی ناں یار سالٹی! ابویں سیرس ہو جاتی ہو اور یہ جو تمہاری جھگڑا لوبیٹی ہے ناں، ایک دن.....“

”اچھا، اچھا..... میں جھگڑا لوبوں یا تم خوش فہم۔“

”اف تو ہے، لگتا ہے تم دونوں کی تو زندگی لڑتے جھگڑتے ہی گزرے گی۔ ہر وقت لڑائی لڑائی.....“

”والدہ مجھے گھور کر اپنی آنکھوں کو دیکھی نہ کریں، اپنی اس تک چڑی بھانجی کو سمجھائیں، جودن بہ دن تمیز کی چیزوں سے نیچے آ رہی ہے۔“

”بکومت، میری زارا تو سب سے زیادہ تمیز دار، سمجھ دار اور سب سے حسین بیٹی ہے۔“

”ماں پلیر، بس کر دو، بس..... یہ کیا ہو گیا ہے ماں آپ کو، ایک ساتھ اتنے بڑے بڑے بول بول ڈالے آپ نے۔ اف..... اف..... تمیز دار، سمجھ دار، حسین..... اف..... میں سر کیوں نہ گیا ماں آپ کے اتنے بڑے

زین اور داؤد خوش ہو کر دیکھ رہے تھے۔

”امی! میں ذرا سرمد کی طرف جا رہا ہوں۔“

”ہاں، بیٹے چلے جاؤ، مگر دیکھو تو اپنی بہنوں کو۔“

”امی پلیز! مجھے مت دکھائیں۔ میں ان لوگوں کو اپنی بہن نہیں مانتا۔ جن کے پاس ہم جا نہیں سکتے، وہ آ نہیں سکتیں۔ ہم ہی ان کو جانتے ہیں، وہ ہمیں نہیں جانتیں۔ ابانے ابھی تک شادی اناؤنس نہیں کی، آپ کو اپنے گھر اور معاشرے میں اپنی بیگم کے حوالے سے متعارف نہیں کروایا۔ آپ.....“ وہ تو جانے کب تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہتا کہ منیبہ نے درمیان میں ٹوک دیا۔

”ارمغان! حد ادب کر اس مت کرو۔ تمہارے ابا جب مناسب سمجھیں گے، ہمیں اس گھر میں لے جائیں گے۔ اپنے گھر والوں سے متعارف کروادیں گے اور پھر تم لوگ اگر ان بچیوں کو بہن تسلیم نہیں بھی کرتے تو ان کو، تمہارے ابا کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سمجھے.....! فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ پتا ہے ناں باپ کے غصہ کا۔“

”ہونہ، باپ کو غصہ دکھانے کی علاوہ آتا کیا ہے۔“

”ارمغان!“ منیبہ غصے سے کھڑی ہوئی، ارمغان نے میز پر پڑی گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

”امی جان! بھائی ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ جب وہ سب مل کر رہ رہے ہیں، سب کزنز کتنا ہلکا مزا کرتے ہوں گے اور..... اور ہم لوگ اچھوت کی طرح الگ رہتے ہیں۔ بس آپ ابا سے کہیے ہمیں بھی دادا ہاؤس لے کر چلیں، ہم بھی وہاں رہنا چاہتے ہیں، اپنی بہنوں کے ساتھ، کزنز کے ساتھ۔“

داؤد سب سے چھوٹا تھا مگر عمارہ سے بڑا تھا اس کا اکثر دل چاہتا کہ وہ اپنی بہنوں اور کزنز کے ساتھ رہے۔

”میں جانتی ہوں بیٹا! میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں مگر تمہارے ابا جب مناسب سمجھیں گے ہمیں وہاں لے جائیں گے۔“

”اور ابا کب مناسب سمجھیں گے امی؟“

منیبہ اسی طرح لڑکوں کے سوالوں میں الجھ جاتی تو فیصلہ کرتیں، اس بار وہ ساجد سے گھر جانے کا تقاضا کریں گی۔ وہ گھر جو ان کا سرال تھا۔ بچوں کا دھیال تھا، مگر ہر باریا تو ساجد گھورنے پر اکٹھا کرتے یا ڈپٹ کر بٹھا دیتے۔

”ان لوگوں کو ہم سے غرض ہونی چاہیے اس گھر یا، گھر والوں سے نہیں۔“

”مگر ساجد! اب سب بڑے ہو گئے ہیں، سوال کرتے ہیں؟“

”کیسے..... کیسے سوال کرتے ہیں؟ کیا انہیں ہمارے بارے میں کوئی شک ہے۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم نے باقاعدہ شادی کی ہے اور ایک ساتھ نہیں رہتے تو ہیں کچھ میری مجبوریاں.....“

”اور یہ مجبوریاں کب ختم ہوں گی ساجد! کب..... کب ہمیں بھی شناخت ملے گی۔ کب میں بھی اپنے سرال میں ساجد احمد کی بیوی کی حیثیت سے داخل ہوں گی کب؟ میرے بیٹے اپنے دادا کے گھر اپنی حیثیت کے ساتھ جائیں گے، کب.....؟ ساجد کب..... میں بھی اپنے سرال میں اپنے رشتے کے استحقاق کے ساتھ جانا چاہتی ہوں، آ خر کب؟“

بیٹوں کے سوالات سے تنگ آئی منیبہ آج گویا پھٹ پڑیں مگر مقابلے پر تھا ساجد جیسا خود غرض، خود پرست شوہر تھا۔

”بند کرو اپنی یہ کب کب کی رٹ..... میں نہ تمہارا بچم ہوں، نہ ہی تمہارے بیٹوں کا..... سمجھیں! کہ جواب دیتا پھروں، وضائیں کروں اور پھر تمہیں کون سی حیثیت، کون سی شناخت چاہیے۔ معاشرے میں میری بیوی کی

حیثیت سے ہی جی رہی ہو۔ بچوں کی ولدیت کے خانے میں میرا نام ہے..... اور کیا چاہیے تمہیں یا ان کو۔“

”اپنے دادا کے گھر میں پہچان اور رشتے چاہئیں ان کو، وہ اپنی بہنوں سے ملنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اپنے کزنز کی پہچانی انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں ساجد، میرے بیٹے اور یہ چاہتے کوئی نا چاہتیں کہ میں ان کو منع کروں، روک دوں یا ان کا حق ہے۔“

آج منیبہ میں جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ شاید آج ایک بیوی کو نہیں مستاکو تکلیف ہوئی تھی اور ایک عورت ہار سکتی ہے، بیوی ہار سکتی ہے مگر ایک ماں جتنی بھی کمزور ہو، اولاد کے حقوق کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے اور جب انہوں نے سب کچھ برداشت کر لیا، قبول کر لیا تو وہ لوگ ان کو ان کے بچوں کو قبول نہیں کر سکتے۔

”ساجد! آخر کیا کیا وجہ ہے کہ آپ ہمیں وہاں لے جانا یا متعارف نہیں.....“

”بس کرو، اب یہ پلچر منیبہ! یہ تم ہو کہ اتنی باتیں سنار ہی ہو مجھے، منیبہ کی جرأت نہیں کہ.....“

”یہ تو بات ہے ساجد! بعض اوقات مظلوم چپ رہ کر ظلم سہہ کر جا رہا تو اتنا طاقت ور بنا دیتا ہے کہ.....“

”منیبہ! تم نے آج حد کس کر لی ہے اور..... اور.....“

اور پھر ساجد کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور شاید منیبہ کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا۔ اگر زین اپنا موبائل لینے وہاں نہ جاتا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

☆☆☆

سلیم منزل کی کوئلیں بھی کھل کر پھول بن چکی تھیں۔ سب بچوں پر اپنے والدین یا دوسرے رشتوں کی صاحب تھی، مثلاً غیر اور گلشن جہاں کے صاحب زادے اپنے نانا جان پر گئے تھے۔ وہی دھان پان سراپا، وہی بات بے بات اپنا کمزور سینہ پھلا لیتا۔ کتنی ہی دیر کھانتے رہتا، شوق بھی نانا جان کا اپنا تھا، کبوتر بازی۔ بیٹے کی ان ہی خصوصیات پر تو گلشن جہاں کو ناز تھا، بڑا فخر یہ کہا کرتیں۔

”ماشاء اللہ ہمارے سفیر میاں تو اپنے نانا مرحوم پر گئے ہیں، ہو بہ ہو۔ کاش ہماری دادی ساس سفیر کو لیتیں۔ نوابی چھاپ ہے ہمارے سفیر پر، سب تو بقول ان کے، سب تیز تیز ہیں۔ نوابی خون میں ملاوٹ کر دی ہمارے سر صاحب نے، ایک دیہاتی خاتون سے شادی کر کے۔“

گلشن میں اب حمیدہ خاتون کی روح سرائت کر گئی تھی۔ وہ بالکل حمیدہ خاتون جیسی باتیں کرنا شروع ہو گئی تھیں اور اسی طرح غیر صاحب میں دادا کی سوچ گھر کر گئی تھی، ان کو بھی اب پسندیدہ بیگم کی ہر بات بری لگتی۔

سفیر چار بہنوں کا اکلوتا بھیا جان تھا۔ چار عدد بہنیں، اپنی والدہ جیسی تیز طرار، چڑچڑ چھالیاں چاہتیں۔ پڑ پڑ باتیں بناتیں مگر مجال ہے جو کسی کو ایک آنکھ بھاتیں۔ خفق، مہک، عاتکہ، صبا کو والدہ کی خاص ہدایات تھیں کہ وہ نہ زہ جیوں کی بیٹیوں سے زیادہ بات کر کے اپنے لہجے خراب نہیں کر سگی۔ دیم کی دو بیٹیاں عازرہ اور فائزہ، تین بیٹے راجیل، فیصل، بجیل تھے۔ جبکہ کلیم اور فیصلہ کے دو بیٹے ہارون، شمعون، بیٹیاں ثناء اور زیب تھیں۔ سب کزنز بھی بڑے تھے، کوئی کالج میں تھا، کوئی یونیورسٹی میں تھا۔ سفیر میاں نے بھی تین بار انٹر میں فیل ہونے کی بیڑک کے بعد چوتھی بار امتحان روایتی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ اب مسلسل کہہ رہے تھے۔

”اماں جان! ہم بھی بجیل اور فیصل کی طرح یونیورسٹی جائیں گے۔“

”جانے دیجیے سفیر میاں! کیا کیجیے گا اتنا بڑھ کر، ہم نے اپنے اکلوتے سپوت سے نوکری تو کروانی نہیں۔ آپ اپنے والد صاحب کا کاروبار سنبھالیے گا اور ویسے بھی ہم نے سنا ہے یونیورسٹی میں اکثر حالات خراب رہتے ہیں، گویا مارو کا استعمال بھی ہوتا ہے۔“

”ارے اماں جان! یہ..... یہ سب دیکھنے کے لیے ہی تو ہم بھی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ بس ہم داخلہ لیں گے۔“ سفیر میاں بچوں کی طرح تھکے۔

”غصہ..... جانے دیجیے سفیر! یونیورسٹی ہے کوئی چیز یا گھر تو نہیں کہ آپ وہاں داخلہ لیجیے گا۔“

”دیکھیے تجیل بھیا! آپ ڈھکے چھپے الفاظ میں ہمیں بند رکھ رہے ہیں۔“

”حالانکہ اس میں ڈھکی چھپی کون سی بات ہے۔ وہ میرا مطلب ہے سفیر! آپ فکر نہ کریں ہم یعنی ہم نواب ابن نواب، ابن نواب ہارون کلیم اللہ آپ کا ساتھ دیں گے۔“

”بالکل، ہمیں بھی یقین ہے، ہارون میاں آپ کا ساتھ ضرور دیں گے، آخر ایک بندو ہی دوسرے بندو کا دکھ کچھ سکتا ہے۔“ عازرہ شرارتاً میدان میں اتری تو ہارون نے کشن اس کی طرف اچھالا، جو فیصل نے سچ کر کے صوفے پر رکھا۔

”مجھے بی مینڈ کو کو بھی زکام ہوا۔“

”جی ہوا اور جھینکوں کا نزول بھی آپ پر ہی ہوگا! آ..... آ..... آ جھی۔“ عازرہ نے مصنوعی چھینک شمعون پر ماری تو شمعون نے قریب کھڑی زیب کے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا تو وہ چہرے مارنے لگی۔

”شمعون کے سچے۔“ اور پھر آگے پیچھے بھاگا دوڑی ہونے لگی تو سخت پریشانی شگفتہ بیگم نے چپکے سے اپنے آنسو آچل میں سیٹھ لیے دکھ کی اک لہر اندر تک اتر گئی۔ اخبار کی اوٹ میں سلیم صاحب نے محبوب بیگم کے تحسین چہرے پر اتری شام میں زیر کا عکس دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اخبار سیٹ کر ایک طرف رکھا، ان کو معلوم تھا کہ اب شگفتہ ان کی وجہ سے زیر کا ذکر بھی نہیں کرتی تھیں۔

”کیا سوچ رہی ہیں شگفتہ خاتون آپ، وہ ہی نہ جو ہم سوچ رہے ہیں۔“

”اب مجھے کیا پتا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“

”آپ کو پتا ہے شگفتہ خاتون کہ ان سب بچوں کو دیکھ کر ہمیں زیر کتنا یاد آتے ہیں۔ وہ کہاں ہیں، کس حال

میں ہیں اور..... اور.....“

”اور اس کے کتنے بچے ہیں۔ کتنی بیٹیاں اور کتنے بیٹے ہیں سلیم جی! اگر..... اگر آپ نے اس کو نہ نکالا ہوتا تو..... تو اس کے سونے سونے منڈے کڑیاں یہیں ان سب بچوں کے ساتھ ہتھ کھیلنے نظر آتے۔ مگر..... مگر.....“ شگفتہ کو تو شانہ چاہے تھا اور آج سلیم صاحب نے خود شانہ پیش کر دیا تھا۔

”شگفتہ خاتون! آپ تمام عمر ہمیں الزام دیتی رہیں کہ ہم نے آپ کے آئینے کا پھول توڑ کر پھینکا ہے،

آپ اس بات پر غور کیوں نہیں کرتیں کہ زیر کی بیگم نے معاملہ آ رہا کر دیا تھا اور.....“

”دادی جان..... دادی جان!“ زیب، عاتکہ اور فیصل خوشی سے بھاگتے آ گئے۔ شگفتہ نے جلدی سے

آنسو صاف کیے۔

”کی ہوا پتھر! قارون کا خزانہ ہتھ لگ گیا۔“

”ان ای مجھو دادی جی! وہ..... وہ زین بھائی اور بڑی پھوپھو جان آرہے ہیں۔“

”اچھا، شکر اسے اس کو بھی اپنی ماں کا خیال آیا۔“

”دادی جان! آپ پھوپھو سے کہیں تا کر شانی اور تابی کو لے آئیں، بڑا مزہ آتا ہے جب وہ لوگ آتی ہیں۔“

”ارے تو وہ پچیاں نہیں آ رہیں۔ رو کو میں خود میزہ سے بات کرتا ہوں، رو جیل میاں ذرا اپنی پھوپھو جان کا

نمبر تو ملائے۔“

”جی دادا جان! ابھی لیجیے لیکن موبائل اپنا دیجیے، وہ ہمارے موبائل میں کچھ گڑبڑ ہے۔“

”دادا جان! کوئی گڑبڑ نہیں ہے، بس اپنا سٹیلنس بچانا چاہتے ہیں۔“

”پپ..... پپ.....“ رو جیل نے زیب کو گھورا۔

”ارے بھئی، کیا حرکت ہے۔ اماں جان آپ بھی ناں ہر وقت بچوں کی فضول باتوں میں شامل رہتی ہیں۔

سب کی سب لڑکیاں یہاں جمع ہیں، وہاں باورچی خانے میں کون ہے؟“

کاشن جہاں گھر کے امور خانہ داری کے وزارت کے عہدہ پر فائز تھیں۔ گھر کی لڑکیوں کو کوکنگ سکھانے اور لکھانے ہوانے کی ذمہ داری تھی اس لیے وہ اس معاملے میں لڑکیوں پر کڑی نگاہ رکھتیں۔

”ارے چچی جان! اکیلا تھوڑی ہے، تین عدد فرنیچ، دو عدد فریزر، بے حساب برتن، برتنوں کی دو عدد بڑی

الاریاں اور چار کرسیوں والا ڈائننگ ٹیبل بھی تو ہے کچن میں۔“ فائزہ کی شوخ بات پر کشن جہاں نے اپنی کاجل سے

گھری آنکھوں سے اسے گھورا۔

”فائزہ خاتون! اگر آپ کی والدہ مہ جبین کا تعلق اماں جان کے علاقے سے ہے تو اس کا ہرگز مطلب نہیں

کہ آپ صدا و بھول کر گستاخی کریں۔ چلیے، باورچی خانے میں، کباب کا قیمہ پیس دیجیے۔ خیال رہے قیمہ سل

چرنا ہے گرا سنڈر میں نہیں..... اور عازرہ آپ چچائیوں کے لیے آٹا گوند لیجیے اور تھوڑا سا آٹل ڈالنا مت

بھولے گا۔“ اسی طرح کشن جہاں نے ساس، سر کے سامنے گھر کی لڑکیوں میں تمام کام، نیاز کی طرح ہانٹ

لیے۔

”اور چچی جان! یہ جو چار عدد خواتین ہیں، مطلب عاتکہ آپا، صبا آپا اور شفق، مہک کیا کریں گی۔“ چچی جان کی

اس بے انصافی پر زیب تڑپ اٹھی۔

”ارے لڑکیوں! تم بھی ناں کمال کرتی ہو، یہ چار عدد خواتین فارغ تھوڑی بیٹھیں گی۔ ارے بھئی ان کا

کام تو تم لوگوں سے زیادہ مشکل ہوگا، کیوں شمعون بھیا!“

”اور نہیں تو کیا، عاتکہ آپا تم لوگوں کا بہتا ہوا پسینہ چائے گی، مطلب اپنے دوپٹوں سے صاف کریں گی،

صبا آپا! بہتی ناک کے نیچے ہاتھ رکھیں گی اور شفق مہک تو.....“

شمعون! اس آواز پر سب مڑے۔

☆☆☆

”اوٹی تمہارا نہیں خیال کہ ہمیں اپنا ایک بیٹا بنانا چاہیے اور دیکھ تا تیری واج (آواز) تے بالکل کوئل درگی

آ۔ مائیکل گنار بڑا اودیا بجاندا۔“

”ہوں ناٹ اے بیڈا آئیڈیا، واٹ یو سے۔ مائیکل اینڈ جی۔“ ہر ت سگھ کی آئیڈیے پر سب سے پہلی ٹی

نے پسندیدگی کی مہر لگائی تو جی نے بے متنی سے شانے اچکائے، مائیکل نے انگوٹھا اکر منظور دی۔

”اور..... اور..... تم کیا کرو گے ہر ت سگھ۔“

”اوڑے! آئی ایم گڈ پوٹ، میں گانے لکھوں گا، دھن بناؤں گا۔ تمہارے ساتھ مل کے گاؤں گا وہی۔“

”وہ سب ٹھیک ہے ہر ت! یونو، مائی فادر ٹیکل دیسی مین۔“ ٹی نے مائیکل کے گنار کے تار پھیرتے

نے اداسی سے کہا تو مائیکل جو کہ ایک بار اداسی سے ٹی کا ہاتھ پکڑنے کی سزا میں بری طرح پٹ چکا تھا، سخت

طائفہ رہتا تھا۔

”ہونہ، بیک درڈ۔“ مائیکل ایک طرف ہو کر گنار کے تار کسے لگا۔ جی چپ چاپ باتیں سنتی، اس وقت

اسی کافی ہاؤس نہیں آئے تھے، اس لیے یہ لوگ مزے اڑا رہے تھے۔

”اوٹی تو اپنے پاپا جی کو سمجھاتی کیوں نہیں اوسن لیا کہ وہ دیسی آدمی ہے، مسلمان ہے، راز کو بتاؤ۔“

لکڑی کی دکان



سندر میں چمال مار کے سکا (خٹک) نہیں رہ سکتا۔ خیر چھڈ اس بات کو، یہ بتا تم لوگ بینڈ بنارہے ہو کہ میں کروں کوئی اور بندوبست۔“ ہر ت نے ایک کا بڑا سا کلا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”ہر ت ایک دن رک جاؤ، ہمارے ایک انگل ہیں انور خان، ان کی بیٹیاں اور بیٹا بھی ہے۔ ہم ان کو بھی اپنے گروپ میں شامل کر لیتے ہیں۔“ ٹی جی جو کی گہری سوچ میں تھی، ایک دم چوٹی۔

”ہاں تو ٹھیک ہے، کر لیتے ہیں۔“ دیت، آ یاں نو کا دی جلدی آ، کہو ی سا ڈی ٹرین چھٹ دی پی آ۔“

اسی دوران ٹی نے گلاس وال سے باپ کی گاڑی رکتی دیکھی اور ان سب کو اشارہ کیا اور وہ لوگ پچھلے دروازے سے نکل گئے۔

☆☆☆

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو نجمہ! ہم پاکستانیوں کی بیٹیوں کے لیے رشتوں کا بڑا براہیلم ہو جاتا ہے۔ میری تو ایک ہی بیٹی ہے، تمہاری تو تین بیٹیاں ہیں۔“ انور اور رانی سوچ کے ایک بیچ پر تھے، اس لیے اچھی دوستی ہوئی تھی اسی طرح نجمہ اور روبیکا ہم خیال تھیں۔ مگر اب جبکہ اس ماحول میں پل بڑھ کر نجمہ کی بیٹیاں بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں تو اچھے رشتوں کے لیے پریشان تھیں۔

”اس لیے میں تو بہت پریشان ہوں، روبیکا تم ہی بتاؤ کوئی رشتہ نظر میں ہے تو، لڑکیوں کی عمریں اب شادی والی ہو رہی ہیں۔ انور ہر وقت مجھ سے اسی بات پر لڑتا ہے کہ تم کشتیاں جلا کر آ گئی ہو ورنہ کتنے لڑکے تھے میرے خاندان میں۔ بہن بھائیوں کے لڑکے تھے، بات تو اس کی درست ہے مگر.....“

”ہاں، تو تم نے ایسا کیوں کیا، واپسی کا راستہ کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔“

”بس! مجھے وہاں کا دقیقہ تو سی ماحول پسند نہیں تھا۔ نہیں رہنا چاہتی تھی میں جو اسٹ فیملی سسٹم میں سب رشتے ایک جگہ، ایک گھر میں، ایک سسٹم کے پابند اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بچے بھی اس کنوار ماحول کا حصہ بنیں، ہر وقت ساس سر کا خوف سوار رہتا۔ یہ کہنا وہ نہیں کہنا اور سب سے بڑھ کر میں انور کو ان سب رشتوں میں کبھی شکر بنا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں انور کی محبت اور توجہ کو کسی بھی رشتے کے ساتھ شکر نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے کڑوا کھونٹ بھرا اور نکل آئی اور میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ انور پر میرا حق تھا لیکن اب انور ہر بات کے لیے مجھے قصودار کہتا ہے۔ بچے اس ماحول کے ہو گئے، یہ بھی میرا قصور گردانتا ہے۔ تم..... تم بتاؤ اور ہم کیا کرتے ہیں۔“ نجمہ مسلسل بول رہی تھی، کھڑکی سے باہر ہونی برف پھوار کو دیکھتے ہوئے روبیکا اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمارے شو ہر حضرات یا ایسے بے شمار پاکستانی لوگ بڑی چاہت سے بددلیس تو آتے ہیں، بچوں کو مغربی ماحول کی گود میں ڈال کر خود اپنی زندگی میں کمانے میں بڑی ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے بگڑنے پر یا شادیوں کا سوچ کر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں جیسی تم کر رہی ہو۔“

”پھر..... پھر مجھے کوئی پچھتاوا تو نہیں، بس لڑکیوں کے لیے اچھے لڑکے مل جائیں۔“

”ارے بھئی نجمہ! اتنی پریشانی کی بھی کوئی بات نہیں، پاکستان سے بہت سے لڑکے آتے ہیں۔ انگلینڈ میں سیٹ ہونے، کمانے کے لیے، ایسے لڑکے مل جائیں گے..... ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی نجمہ کہ تعلقات تو تمہارے سسرال والوں سے خراب ہوئے تھے ناں، اپنی فیملی میں لڑکے دیکھو ناں۔“

”ہوں، خیر چھوڑو اس بات کو۔ تمہارے اسٹور اور کافی ہاؤس میں تو بہت لڑکے آتے ہیں۔ رانی بھائی تو پاکستانیوں ہی کو پرموٹ کرتے ہیں ان میں سے دیکھنا۔“

”ہوں، اوکے۔“ روبیکا پر خیال انداز میں کھڑی ہوئی۔

”یہ تم اپنا جانور ہمارے بکروں کے ساتھ کس خوشی میں باندھ رہے ہو؟“ کمر پہ ہاتھ ٹکائے چاندنی نے تھانیداروں والے انداز میں سوال کیا۔

”یار وہاں اکیلا شور مچا رہا ہے۔ میں نے سوچا یہاں اپنے ساتھیوں کے پاس اطمینان سے رہے گا۔“ انمول نے دے کی رسی نلکے کے پاپ کے ساتھ باندھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی پیٹھ پہ ایک چٹکی مار کر واپس چلا گیا۔

دے نے فرش پہ پڑے پٹھوں کے ڈھیر میں جھٹ منہ مارا اور مزے سے پیٹ پوجا کرنے لگا جبکہ پورچ میں چاندنی کھڑی بس ناک منہ چڑھائی رہی۔ اس کے کانوں میں اب تک انمول کے الفاظ گونج رہے تھے۔

”اللہ کا خوف کریں خالہ کون سا چکر، کون سے ڈھکن، میرے اتنے برے دن نہیں آئے جو اس جنگلی بی سے چکر چلاؤں میں۔“

اس بات کو وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ گوبات تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی لیکن انمول کے کہے لفظ چاندنی کے دل پہ نقش ہو چکے تھے۔

خود تو وہ لاٹ صاحب عید کی چھٹی گزار کر واپس چلا گیا تھا اور اب کل رات ہی پلانا تھا۔ صبح ہی اس نے احتشام چچا کے ساتھ جا کر قربانی کے جانور لیے تھے۔ گھر میں ایک احتشام بچا ہی تو تھے جنہیں ان سب چیزوں کا شوق بھی تھا اور تجربہ بھی، اب انمول بھی اس باران کے ساتھ چلا گیا۔ ان کے تین بکرے آئے تھے لیکن انمول نے دنبہ خریدا تھا لیکن چند گھنٹوں بعد ہی وہ اپنا دنبہ ان کے بکروں کے ساتھ باندھ کر چلا گیا تھا۔

”پہلے ہی ان تینوں نے“ میں میں“ کر کے سر میں درد کر رکھا ہے اور اس انمول کے بچے کو دیکھو اس چوتھے کو بھی ہمارے سر پہ چھوڑ گیا ہے۔“ وہ جمل کر کہتی اپنی دو ماہ پرانی خناس نکال رہی تھی۔

گھر میں کسی کو اس متعلق علم نہیں تھا۔ اتنی شدید گرمی اور جھبی کے دنوں میں سب خواتین اپنے اپنے کمروں میں کھبی تھیں اور بچے بڑے کمرے میں ٹی وی میں منہ دیے بیٹھے، محسوس ڈورے سمون دیکھ رہے تھے۔ جب دوبار تیل بجانے پر بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو مجبوراً اسے ہی باہر نکلتا پڑا اور سامنے مل گیا انمول، جس کی آمد کی اطلاع تو اسے کل رات ہی مل گئی تھی البتہ ملاقات اس جتنی دوپہر میں ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چاندنی کے ماتھے پہ ناگواری سے مل نمایاں ہوئے تھے لیکن دوسری طرف اس کا انداز بڑا ہی دوستانہ تھا۔ یقیناً وہ پرانی باتیں بھول گیا تھا اور چاندنی کا اس کو ”لنگور“ کہتا بھی۔ لیکن چاندنی کے تو دل پہ نقش تھے۔ کمر پہ دونوں ہاتھ ٹکائے وہ گہری سوچ میں اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ دماغ اس وقت سازش کا جال بن رہا تھا اور پھر اچانک دماغ کی جلی جل گئی تھی۔

”واہ کیا ہی زبردست آئیڈیا آیا ہے اس انمول سے بدلہ لینے کا۔“ پلان سوچ کر اس نے دل میں چیخ کر کہا اور دونوں ہاتھ ملتی پورچ کی طرف بڑھی۔ مین گیٹ سے کچھ فاصلے پہ پورچ کی صفائی کے لیے ایک تل لگا ہوا تھا جس کے ٹوپے کے پاپ سے سب جانوروں کو باندھا گیا تھا۔ تینوں بکرے قطار میں بیٹھے جو گاٹی کر رہے تھے۔ انمول کا دنبہ بھی پٹھوں کو منہ مار کر اب سستی سے کھڑا تھا۔ چاندنی نے آگے بڑھ کر جھٹ اس کی رسی کھول دی۔ دنبہ جو بیٹھنے کے چکر میں تھا آزادی کا احساس ہوتے ہی چوکنما ہو گیا۔

”گھر میں تو کوئی جانتا ہی نہیں انمول اسے یہاں باندھ کر گیا ہے اور میں صاف مکر جاؤں گی۔ اب اگر یہ بھاگ گیا تو انمول کچھ بھی ثابت نہیں کر پائے گا۔“ چھوٹے دروازے کی کنڈی کھولتے وہ شیطانی انداز میں ہنسی اور پھر سامنے سے ہٹ کر دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔

دنبہ رسی کھٹنے کے بعد مزے سے مزگشت کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چاندنی کی طرف بھی منہ

اٹھا کر اٹھتا اور پھر اچانک اس نے کھلے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارتی چاندنی نے منہ کی تیار کر رہی تھی کہ دروازے سے باہر سے دروازہ پھوپھو کی چیخ سنائی دی۔

”یا اللہ یہ کس طرح باہر نکل آیا۔“ چاندنی کی دلچسپی نے کی خوشی منہوں میں رونچہ چکر ہوئی تھی۔

”الف اب یہ پھوپھو اس سڑی دوپہر میں کیوں دورے پہ نکل آئی ہیں۔“ سر پہ ہاتھ مارتے وہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن دروازے تک پہنچنے نہیں پائی۔

باہر سے پھوپھو کی آوازیں سن کر اندر بیٹھے بکروں نے بے ادب کر دی اور چنگا کی پروگرام کینسل کر کے لڑے ہوئے بلکے ایک نے تو بڑے ابا کی طرف موڑ سائیکل کو ٹکر ماری اور بائیک گرا کر گیٹ ہی بلاک کر دیا۔ اس جارحانہ اقدام سے خوف زدہ ہو کر چاندنی وہیں کھڑی رہی البتہ باہر الگ کمرام چلا ہوا تھا۔ بکروں اور بائیک کی رکاوٹیں عبور کر کے دروازے سے اٹھنا تو مشکل ہی نہیں ناممکن ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اب ہوا کچھ یوں کہ ادھر کھلے دروازے سے باہر لگا اور دروازہ پھوپھو کی آمد ہوئی۔ یہ اطلاع تو ان کو بھی تھی کہ اس بار دنبہ انمول لایا ہے۔ لہذا فوراً سے پہلے عمل ہو گیا۔ پہلے تو شور مچایا ساتھ ہی اسے کی رسی پکڑ لی لیکن وہ برخودار بھی آزادی منا رہے تھے۔ لہذا ٹرم کے چکر میں ایسا داؤ چلایا، رسی پھوپھو کے ہاتھ سے نکل سونکی جھکا لٹنے سے، وہ وہیں گر پڑی اور لگیں وایلا مچانے۔

”ارے باہر نکل کر دیکھو، کم بختوں دنبہ بھاگ رہا ہے۔“ کمر بھلاتے پھوپھو نے پکارا۔ اچانک ہی اسے مہاں نے بھاگنے کا ارادہ ترک کیا اور پلٹ کر پھوپھو کو ٹکر ماری۔

”ہائے میں مر گئی یہ منحوس مارا تو ساڈ کی طرح

نکر میں مار رہا ہے۔ ارے کوئی ہے کہ سب مر گئے۔“

تڑپ کر پھوپھو ایک جست میں کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ساتھ کوٹنے اور بدعاؤں کا کورس بھی جاری تھا۔

”میں آتا چاہ رہی ہوں پھوپھو لیکن یہ بکرے راستہ روک کر کھڑے ہیں۔“ اپنی گناہ گار آنکھوں سے چاندنی نے دے کی پھوپھو کے ساتھ ٹکر بازی دیکھی تھی لیکن افسوس وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بکروں کی فورس راستہ بلاک کیے جو کھڑی تھی۔ وہ تو اس بل کو کوس رہی تھی جب دنبہ کھولنے کا منصوبہ ذہن میں آیا۔ سارا کھیل الٹا ہو گیا۔ پھوپھو اس دنبہ ٹکر کے بعد تو ایک کی دس لگا کر سنائیں گی اور جو بے عزتی گھر والوں نے کرتی ہے اس کا تو شمار ہی نہیں۔

”بکرے ہیں کہ ڈالر جو راستے روک رہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتی منحوس پھوپھو کو مروانا چاہتی ہے۔“

پھوپھو نے جیسے ہی تیزی دکھاتے ساڈ ماری اور دے کی اگلی ٹکر سے بچ کر کھڑی ہو گئیں۔ جھٹ سے کپڑے جھاڑے اور فرار کی راہ لی۔ پتا نہیں دنبے میاں کو پھوپھو بے چاری میں کون سا قوی دشمن دکھائی دیا تھا جو بلا وجہ کی دشمنی لگائی۔ لیکن اس بار پھوپھو بھی ذہنی طور پہ تیار تھیں لہذا بھاگ کر کیاری میں گھس گئیں۔ دنبہ بھی ان کے پیچھے لپکا۔ کیاری میں امرود کا درخت لگا ہوا تھا۔ پھوپھو نے درخت کے تنے کو پکڑ کر اس کے گرد گول گول چکر لگانے شروع کر دیے۔ دنبہ بھی اسی چکر چکر میں چکر لگانے لگا۔

”ارے چاندنی بجا مجھے۔“ پھوپھو نے دہائی دی لیکن چاندنی باہر نکل سکتی تو بچانی۔ اسے تو اب اپنی جان بچانے کی فکر ہو رہی تھی۔

سامنے گلی سے آتے انمول نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے پھوپھو اور دے کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ وہ گھر سے بچنے رکھنے آیا تھا۔ اب یہ تو اس کی چھوٹی سی عقل سمجھنے سے قاصر رہی کہ ان دونوں میں سے کون کس کے پیچھے لگا ہوا ہے البتہ پاس آنے پہ پھوپھو کی آہ و بکا نے کچھ کچھ صورت

حال واضح کی تھی۔ بہر حال اس نے چارہ وہیں پھینکا اور آگے بڑھ کر رسی کے سرے پہ پاؤں مضبوطی سے رکھ دیا۔ دنبہ وہیں رک گیا البتہ پھوپھو اب بھی سر جھکائے گول پکڑ لگا رہی تھیں۔

☆☆☆

”جی جی بتاؤ چاندنی دنبے کی رسی کس نے کھولی تھی؟“ احتشام پچا کے گھر آنے پہ عدالت عالیہ کے سامنے چاندنی بچرم بنی سر جھکائے کھڑی تھی۔ بڑا کمرہ اس وقت سیٹ بائے سیٹ فل تھا۔ جن کو بیٹھے کی جگہ نہ ملی کھڑے ہو کر ٹوٹی کھڑکیوں کے منہ پہ رہے تھے۔ احتشام پچا کے لہجے میں ہلکی سی درستی تھی ایک تو دردانہ پھوپھو کی طرف سے دائر شکایت دوسرے دنبے کے بھاگنے کی صورت ہونے والے نقصان کا سوچ کر بھی وہ غنا دکھائی دے رہے تھے جو ان کی بارگ و بہار طبیعت کے برعکس تھا۔ عام دنوں میں تو وہ بہت ہنس مکھ تھے اور سب بچوں کے ساتھ دوستانہ رویہ برتتے تھے۔

”میں جی کہہ رہی ہوں چاچو یہ انمول اچھی طرح اسے باندھ کر گیا ہی نہیں تھا۔ اس لیے تو رسی اپنے آپ ہی کھل گئی۔“ چاندنی فوراً سے پہلے نکر گئی۔

”اچھا اور دروازہ کس لیے کھولا گیا تھا؟“ انمول نے مداخلت کرتے سوال داغا۔ چاندنی نے گھور کر دیکھا لیکن سامنے بیٹھے احتشام پچا کی سنجیدہ نگاہیں بھی اس وقت اس پہ جمی تھیں۔

”وہ تو میں نے پھوپھو کی وجہ سے کھولا تھا۔“ بھلا تے ہوئے صفائی دینی چاہی لیکن اس بودی دلیل میں وزن نہ ہونے کے برابر تھا تو دوسرے پھوپھو دردانہ بھانڈا پھوڑنے کو وہیں موجود تھیں۔

”لو بھلا میں تو ابھی رکشے سے اتری تھی سامنے دروازہ چوڑ چپٹ کھلا، بھری دوپہر میں۔ اوپر سے وہ ساڈھ جیسا دنبہ باہر نکل رہا تھا۔ کم بخت

مارے نے آج تو جان ہی لے لی تھی میری۔ شکر میرا بچہ وقت پہ آگیا ورنہ اس بار عینہ پہ قل ہو جاتے۔“ وہی ہوا جس کا ڈر تھا پھوپھو نے کوئی بھی لحاظ نہ رکھتے ہوئے صاف صریحاً جی بول دیا تھا۔ ساتھ ہی منہ بناتے اپنے متوقع اقدام کل کو بھی اس کی چارج شیٹ میں شامل کر دیا تھا۔

چاندنی کا دل کیا دھاڑے مار کر رو دے اس وقت کو، جب اس نے شیطان کے درغلانے پہ دنبے کی رسی کھولی۔ بھلا وہ کس طرح بھول گئی تھی کہ اس خبیث شیطان نے تو جنت سے نکلوا تھا اس کی باتوں پہ کان نہیں دھرنے چاہئیں۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چک کیں کھیت۔ جو کیا تھا انجام تو بھگتنا ہی تھا۔ چہرے پہ بلا کی مصیبت اور آنکھوں میں نمی لائے اس نے احتشام پچا کو دیکھا اور بس شاید یہ ان کے صبر کی بھی حد تھی۔ لاڈلی بیٹی پہ اس سے زیادہ ظلم تو وہ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

”چل اب رہنے دے تو اتنی جلدی ہماری جان چھوڑنے والی نہیں ہے۔“ چاندنی کو ڈانٹنے کے بجائے انہوں نے الٹا توپوں کا رخ دردانہ پھوپھو کی طرف کر دیا۔ کمرے میں اس وقت جو سب سانس روکے بیٹھے تھے احتشام پچا کی بات پہ منہ چھپائے ہنسی روکنے لگے البتہ پھوپھو کو تو پتہ چلے لگ گئے جو کہ اس ایک پہ لگتا ان کا جمہوری حق تھا۔

”دیکھ لو امی یہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ بڑا شوق ہے اسے مجھ سے جان چھڑانے کا۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی؟“ دوپٹے میں منہ چھپائی داوی کا بازو جھنجھوڑتے پھوپھو شکایتی انداز میں چیخیں۔

داوی بے چاری کیا کہتیں انہیں تو الٹا اپنے بازو کی فکر لگ گئی تھی۔

”یہ بھائی نہیں قصائی ہے قصائی۔“ ملا متی

انداز میں ہاتھ ہلاتے مزید کہا۔

”کل پھر اس عید پہ تجھے ہی قربان کروں گا۔“ احتشام پچا کو بھی پھوپھو سے سینگ پھنسانے کا موقع اللہ نے دیا تھا۔ بیسی نکالے مزے سے لے لے جیسے ان کا تپنے سے مزے لے رہے ہیں۔

”لیکن حرام جانور کی قربانی جائز نہیں ہوتی۔“ اندازہ نہیں ہوا تھا کون ہے لیکن کسی نے ہولے سے لقمہ دیا تھا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو تم سب؟“ اس حد سے بڑھتی بے ادبی پہ عالیہ نے غصے سے ٹوکا۔ بات واقعی اصل مدعے سے ہٹ کر ہمیشہ کی طرح ایک دوسری طرف جانکلی تھی۔

”چاندنی جی جی بتاؤ یہ سب کیا ہوا ہے اور خبردار جو جھوٹ بولا ورنہ میںیں سب کے سامنے لٹکانی کر دوں گی۔“ ماں کے تیز لہجے نے چاندنی کا سانس خشک کر دیا تھا۔

”امی وہ میں..... اس نے مجھے جنگلی بلی کہا تھا۔“ منناتے ہوئے اس نے وہ وجہ سب کے گوش گزار کر دی تھی جس کی بنا پہ بدلے کی بھاد نال میں جاگی۔

خود انمول بھی تو اس وجہ سے نا آشنا تھا۔ اسے تو یہی حیرت نہیں جارہی تھی چاندنی نے ایسا کیوں کیا۔ اگر محض شرارت کا ارادہ تھا تو کیا وہ اتنی احمق تھی کہ اس کے نقصان کا اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔

بہر حال اب تو اصل بات کا پتا چل ہی گیا تھا اس لیے وہ ستانے کے موڈ میں تھا۔

”تو اعتراض بلی کہنے پہ تھا یا جنگلی؟“ شرارتی لہجے میں کہتے اس نے احتشام پچا کو آنکھ ماری۔

”دیے تو دونوں باتیں ہی کسی حد تک درست ہیں۔“ احتشام پچا کون سا پیچھے رہنے والوں میں سے تھے۔ جھٹ بھانجے کے ساتھ مل کر پیچھے چھاڑ شرع کر دی۔

”چاچو آپ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔“ چاندنی روہا سی ہوئی تو احتشام پچا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوم لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

”ماموں اس نے بھی تو مجھے لنگور کہا تھا۔ تو کیا میں بھی اس سے بدلہ لوں، اس کا بیوی بکس چوری کر کے۔“ انمول البتہ ابھی تک اس کی جان چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔

”خبردار جو تم نے میرے بیوی بکس کو ہاتھ بھی لگایا۔“ وہ واقعی سنجیدہ ہوئی تھی۔ آخر یہ اس کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا۔

”اسنے گھر والوں کی ہمدردی میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بغیر میک اپ کے تمہیں دیکھ لیا تو ان میں سے کسی کا ہارٹ فل ہو سکتا ہے۔“ انمول نے ترکی بات کر کہا تھا۔

”انمول باز آؤ اسے تنگ کرنے سے اور چاندنی تم بھی چپ رہو۔“ مجبوراً رضیہ پھوپھو کو مداخلت کرنا پڑی تھی۔ سنجیدگی سے انہوں نے دونوں کو ہی خاموش کر دیا تھا۔

”لیکن پھوپھو.....“ چاندنی نے کچھ کہنا چاہا لیکن دردانہ پھوپھو کی ہائے سن کر خاموش ہو گئی۔

”دیکھو تو ان دونوں کو اپنی پڑی ہے یہاں میری پسلیاں ہل گئیں۔“ وہ تنگ کر بولیں۔ داوی ساتھ ہی بیٹھی تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر ان کو دبانے لگیں۔

”دیے دردانہ یہ تو بتا تھے اس وقت ہماری طرف مارچ کرنے کی کیا سوچھی۔ تو تو ہر سال عید سے ایک ہفتہ پہلے گھر سے لٹکانہ کر دیتی ہے کہیں کوئی عید کا جانور عید سے پہلے قربان نہ کر دے اور تیرا حصہ نہ مارا جائے۔“ اب وہ احتشام پچا ہی کیا جو ہاتھ آئی پھوپھو کو عاجز کرنے کا کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے دیں۔ ایک

بار پھر شروع ہو گئے۔

”ہائے تو ہمارے محلے میں سب بھیجتے ہیں تا میرے گھر گوشت۔ ماشاء اللہ ہر سال اتنا سارا اکٹھا ہوتا ہے۔“ پھوپھو ایک دم ہی پھیلی گئیں اور دونوں ہاتھ گلو میٹر کے حساب سے کھول کر انہوں نے وہ اتنا سارا گوشت بیان کرنا چاہا جو ان کے ہاں عید کے موقع پر اکٹھا ہوتا تھا۔ اس لمبے چوڑے جھوٹے ہاتھ پر احتشام چچا نے واقعی سر پکڑ لیا۔ ”ویسے تجھے کس چیز کی آگ ہے تجھے تو کبھی توفیق نہیں ہوئی بہن کے گھر دو بولیاں بھجوا دے۔“ اور اس جھوٹ پر اب سر پکڑنے کی باری دادی کی تھی۔

”اوہ شکوے شکایتوں کی پوٹلی۔ یاد کر پھیلے سال بکرا بھیجا تھا پورا۔“ احتشام چچا بھی ان کی عادت سے واقف تھے لہذا برا منائے بغیر صرف شرم دلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”ہاں تو کوئی احسان نہیں کیا تھا بھائی بھیجتے ہیں سب کے۔“ اب وہ پھوپھو ہی کیا جو احسان مان جائیں۔

”لو ابھی مجھے قصائی کہہ رہی تھی۔“ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے احتشام چچا نے اس بیان بدلنے پہ فہم نہ لگایا۔ ایک ساتھ سب کے ہی رکے ہوئے قہقہے گونجنے لگے تھے کہ کمرے کی چھت اڑنے کا خطرہ لاحق ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ دردانہ پھوپھو برا مان جاتی اور نقص امن کی صورتحال پیدا ہوتی رضیہ پھوپھو نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا تھا۔

نا قابل بیان تاثر دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

عید کے اگلے روز ہونے والی چاندنی اور انمول کی مشکلی کی خبر نے ایک ساتھ پورے گھر پر بم پھوڑا تھا۔ رضیہ نے سب کی موجودگی میں چاندنی اور انمول کے رشتے کی بات کی جو عالیہ نے جھٹ قبول کر لی۔ دیگر اہل خانہ تو در خود چاندنی یا انمول سے بھی کسی نے پوچھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ رضیہ نے فٹنٹ مشکلی کا دن بھی وہیں بیٹھے طے کیا۔ ان دونوں کو ان کی ہی مشکلی ہونے کی اطلاع جیسے ملی اس سے زیادہ اہتمام سے لوگوں کو دوستوں رشتے داروں کی شادیوں کی خبر پہنچائی جاتی ہے۔ حیرت اپنی جگہ لیکن گھر میں کسی کو بھی اس رشتے سے اعتراض نہیں تھا کیونکہ سب نے ہی خوش ہو کر مبارک باد دی۔ بظاہر تو دردانہ پھوپھو بھی سب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ اڑاڑ کر مبارک بادیں بھائی اور بہن کو دے رہی تھیں لیکن کچھ ہی دیر بعد چھوٹی چچی کے کمرے میں غصہ میٹنگ بجائے دل کا حال لیوں پہ آ گیا تھا۔

”کہا تھا میں نے اندر ہی اندر کھجوری پک رہی ہے۔ اب آگیا ناچ سب کے سامنے۔“ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے انہوں نے رازداری سے چچی کو مخاطب کیا۔ چچی ٹھہری سدا کی چٹوری اور موقع ملا خدا کر کے، سولگیں چکے لینے۔

”ہاں باجی بات تو آپ نے بالکل صحیح کی تھی۔ واقعی تو اندر خانے رشتے کی باتیں کر رہے تھے۔“ ٹھوڑی پہ ہاتھ ٹکائے حیرت سے بولیں۔

”اوہ گئی ان کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔“ یہاں کہ باجی اور بھائی اپنے بچوں کا رشتہ طے کر رہے ہیں۔“ پھوپھو نے ہاتھ نچاتے کہا۔ ان کا خیال تھا شاید احتشام چچا بھی ان سے متفق ہوں گے لیکن وہ کہاں ان کے ساتھ ملتے تھے۔ لیکن اس میں کھجوری کون سی ہے دردانہ۔ یہ بات تو ابھی سب کے سامنے ہوئی۔ بلکہ باجی نے غصے خاص طور پر بلایا تاکہ جو بھی بات ہو تیری موجودگی میں ہو۔ یہ سچ ہے رضیہ کو بہن کے اعتراضات کا خوب دھیان رہتا تھا اسی لیے انہوں نے ہاتھ و پاؤں بلایا تھا تاکہ پھر شکوہ نہ رہے۔

”سب ڈرامے ہیں ان کے جیسے میں جانتی نہیں نا ان دونوں کو۔ گونگلوں سے مٹی جھاڑی گئی ہے ابھی سب کے سامنے دکھاوا کر کے۔ رشتہ تو یہ کی مینوں سے پکا کر کے بیٹھے ہیں۔“ لو بھلا پھوپھو نے بھی کسی کی مانی ہے، جواب مان جاتیں۔ منہ بنائے ایک نئے الزام سے نوازا گیا تھا۔

”ہاں تو ڈرامے کرنے کا لائسنس بس حیرے پاس ہے۔ کیا۔ خواہ خواہ کسی بات کو چیونٹ کی طرح ملول دیتا۔ ان کے بچے وہ جانتیں۔ ان کی مہربانی انہوں نے ہمیں شامل کیا، نہ بھی کرتے تو ہم کیا کر لیتے۔“ احتشام چچا کے نزدیک ایسی بحث بس درد مری۔ اپنے تئیں مناسب انداز میں جان چھرا لئی۔ پھوپھو کو تو ڈرامہ والی بات ہی آگ لگ گئی تھی اور اب ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھے منہ پھیر کر بیٹھی تھیں۔

”ایسے باجی غلط نہیں کہہ رہی ہیں احتشام۔ ایک گھر ہے تو اتنا تو ہمارا حق بنتا ہے۔ لیکن اب اگر یہ لوگ باتیں چھپائیں گے تو کل ہم سے بھی امید نہ رہیں۔“ چچی نے بھی حسب انتظام جڑی چھوڑی۔

”ایک چل تک تو تم ان سے چھپا کر خریدتی

ہو اور ان سے امید وہ بچوں کے رشتے تمہاری صلاح سے کریں۔ اپنی عقل کے ڈونگرے برسانا بند کرو اور جاؤ کچھ کھانے کا انتظام کرو ورنہ یہی تمہاری باجی طعنہ مارے گی جھوکا گھر بھیج دیا۔“ چچی نے ایک میل کو پہلو بدلا اور کن اکھیوں سے منہ پھلایے بیٹھی نند کو دیکھا پر خود خاموش ہی رہیں کیونکہ میاں کے سامنے وہ کم ہی زبان کے جوہر دکھائی تھیں البتہ چچا کی باتوں نے پھوپھو کو تو پختے لگا دیے تھے۔

”ہائے تو تو جان لے لے میری۔ ہر وقت سنا تا رہتا ہے۔“ پھوپھو نے تنک کر جواب دیا۔ چچی بھاگ کر کچن میں چلی گئیں البتہ وہ دونوں بھائی بہن جانے لگتی ہی دیر تک ایک دوسرے پہ دل ہلکا کرتے رہے۔

☆☆☆

”مرتی مر جاؤں گی لیکن اس انمول گھڑی سے شادی نہیں کروں گی۔ بس کہہ دیا تو کہہ دیا۔“ ایک ادا سے ٹھوڑی اٹھائے اپنے تئیں اس نے ڈائلاگ مارا تھا لیکن سامنے بھی عالیہ تھیں۔ کمرے میں آتے ہی اس نے جو کہرام مچایا تھا اس پہ تو پہلے ہی انہیں اس پہ دبا کے غصہ آ رہا تھا۔ ایک تو دبے والی حرکت کے بعد بھی، رضیہ نے اس کی شرارت کو درگزر کرتے بیٹے کا رشتہ مانا اور یہ میڈم مزاج دکھا رہی تھی۔

”تیرا نام چاندنی اس لیے نہیں رکھا تھا کہ مجھے ایتنا بھ بچن کے ڈائلاگ سنائے۔ دو ہاتھ گدی پہ دوں گی تیری بھی خوشی بھی غم نکال دوں گی بھی۔“ لو بتاؤ بھلا کس بات کی کمی ہے انمول میں۔“ عالیہ نے جل کر کہتے باقاعدہ ہاتھ دکھایا تھا۔ وہ ایک لمحے کو ڈری پر پھر زندگی موت کا معاملہ جان کر ہمت کرتے ہوئی۔

”کئی کوئی نہیں..... زیادتی ہے زیادتی۔“

بے وقوفی کی کہنے پن کی اور..... اور” سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یا شاید ٹینشن میں عقل ہی ماری گئی تھی۔ اچھے اچھے انزام زبان پہ آ ہی نہیں رہے تھے۔ ”بکواس بند کر۔“ عالیہ باواز بلند بولیں تو اس نے فوراً بڑیک لگا لی۔ ”جیسے خود تو کسی اسٹیٹ کی مہارانی ہے نا۔“

”مہارانی نہیں چاندنی تو ہوں اور میری شادی میری مرضی سے ہوگی۔“ وہ منمنائی۔

”بھاڑ میں گئی اس چاندی کی چاندنی کی مرضی۔ یہ جوتا دیکھ رہی ہے نا گھما کے ماروں گی سارے احتجاج بھول جائے گی۔“ عالیہ نے اس بار اپنے مضبوط ہاتھ کی ایک دھپ کر پے لگا لی تو وہ نرپ ہی گئی تھی۔

”پہلے ہی ہاتھ پیر پھولے ہیں میرے۔ ایک تو عید، اس پہ منگنی کی رسم۔ سمجھ میں نہیں آ رہا شروع کہاں سے ہوگا سب اور یہ میڈم ایک نیا ایٹو نکال کر بیٹھ گئی ہے۔“ الماری کا دروازہ کھولے وہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

”ای ایک بات میری سن لیں آپ۔ مرنی مر جاؤں گی اس لنگور سے شادی نہیں کروں گی۔“ ناخن کھرچتے اس نے نروٹھے پن سے کہا۔ ”ہاں تو مر جا لیکن شادی تو تیری انمول سے ہی ہوگی۔“ اپنا دانت ہاتھ میں تھامے عالیہ چلیں اور تیز لہجے میں کہتیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پیچھے چاندنی سر پکڑے اپنی بد نصیبی پہ آنسو بہا رہی۔

☆☆☆

انمول کا حال بھی چاندنی سے مختلف تھا، نہ یہ خبر اس کے لیے کم تشویش کا باعث تھی۔ اس کی تو سمجھ سے باہر تھا کہ ماں نے بیٹھے بٹھائے یہ نیا فتنہ کیوں چھوڑا ہے، وہ بھی اسے بتائے بغیر۔ انکار تو وہ وہیں کر دیتا لیکن سب بڑوں کے سامنے ماں کو ایسا جواب دینا یا ماموں کی بے عزتی کرنا انتہائی

غیر مناسب تھا پھر بھی اسے ماں سے شکوہ تھا جس کا اظہار اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی کر دیا تھا۔ ”یار ایک بار مجھ سے تو پوچھ لیتیں آپ کہ میں چاندنی سے شادی کرنا چاہتا بھی ہوں یا نہیں۔“ لہجے میں بلا کی بے زاری تھی۔

”میں نے سوچا تمہیں سر پرانز دوں گی۔“ انمول نے سر پہ ہاتھ مارا۔ اب ایسی باتوں کے بھی سر پرانز ملا کریں گے۔

”بھئی واہ! یعنی میری ہی شادی کی خبر سب کے سامنے مجھے سر پرانز کی صورت دی جا رہی ہے۔ بڑے ٹھیک جا رہے ہوں جی آپ۔“ رضیہ نے صوفہ پہ بیٹھتے حیرت سے بیٹے کو دیکھا جو چہرے پہ بلا کی کوفت لیے انہیں بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

”تو کیا تم نہیں کرنا چاہتے اس سے شادی۔ کسی اور کو پسند کرتے ہو کیا؟“ بڑی سنجیدگی سے سوال کیا گیا تھا۔

”اچھا اگر ہو تو پھر آپ کینسل کر دیں گی یہ منگنی؟“ انمول نے امید سے پوچھا۔

”اگر کوئی ہے تو اسے بتا دو تمہاری منگنی تمہاری کزن سے ہو رہی ہے۔“ رضیہ نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”امی یہ زیادتی ہے۔“ وہ تڑپا۔

”اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے۔ اتنے اچھے دوست ہو تم دونوں پھر اس سے شادی پہ کیا اعتراض۔“ ان کا اطمینان قابل تحسین تھا۔

”کون سی دوستی..... کہاں کی دوستی؟ دیکھا نہیں آپ نے آج کیا حرکت کی اس نے۔“ انمول نے فی الفور احتجاج کرتے ماں کا دھیان چاندنی کی شرارت کی طرف دلایا۔

”چھوٹی سی شرارت کی تھی۔ اس عمر میں یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔“ رضیہ پہ چنداں اثر نہیں ہوا

”چھوٹی سی شرارت۔ اگر سچ میں دنیہ بھاگ جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔“ وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ کیا پتہ اسی طرح ماں کو معاملے کی سنگینی سمجھ آ جاتے۔

”بھاگنا تو نہیں نا۔ بھول جاؤ سب باتوں کو اور چلو مجھے مارکیٹ لے چلو۔ وقت کم ہے اور تیار پاؤں کی توں۔ سوچ رہی ہوں چاندنی کے لیے انگوٹھی کے بجائے سونے کا سیٹ خرید لوں۔“ ان کے اطمینان میں ہرگز دراڑ نہیں پڑی تھی الٹا انہیں تو اب تیاریوں کی فکر لاحق تھی۔ کچھ سوچتے الٹے الٹے ہاتھ بیک کھولا اور والٹ میں رکھے پیسے نکالے لیں۔

”لو یہاں بیٹا راضی نہیں اور آپ تیاریوں میں لگ گئی ہیں۔“ وہ ناراضی سے بولا۔

”بیٹے کے راضی ہونے میں کون سی صدیاں لگتی ہیں۔ ان چار دنوں میں تیاری ہو جائے تو کچھ معرکہ سر ہوا۔“ پیسوں کی طرف سے تسلی ہاتھوں نے اپنا بیک اٹھایا اور شاہنگ پہ ہانے کے لئے نکل گئیں۔ انمول اپنا احتجاج بھی مناسب انداز میں قلم بند نہیں کر دیا پایا تھا فیصلہ تو پہلے ہی اس کے مخالف ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”یار ماموں یہ آپ کی بہن نے اچھی گڑ بڑ کر دی ہے۔“ آسموں پہ ہاتھ صاف کرتے انمول نے احتشام بچا کو اپنا دماغ سنانا چاہا۔ رضیہ کے مارکیٹ جانے کے بعد وہ خود وہیں چلا آیا تھا اور اب آم لہا کر اپنا غم غلط کرتے، اس نے دوست نما ماموں کے سامنے دل کھول ہی دیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ کھٹکی چوستے احتشام چچا لے لے لے لے سے پوچھا۔

”بھلا یہ کون سا وقت تھا اس طرح اچانک

منگنی کا اعلان کرنے کا۔ کم سے کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا ایک بار۔“ امید کی کرن اب بھی باقی تھی سو بڑے مایوس لہجے میں اپنا مسئلہ بتایا۔

”اچھا میں باجی کو کہوں گا تم سے ایک بار پوچھ لیں۔“ احتشام چچا سر جھکائے ایک بار پھر تسلی سے کھٹکی چوستے لگے تھے۔

”وہ شاہنگ کرتی پھر رہی ہیں۔ تیاریاں کر رہی ہیں۔ اب پوچھنے کا فائدہ؟“ وہ جمل کر بولا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کپتان۔ تم نے کون سا انکار کرنا ہے۔ پہلے پوچھیں یا بعد میں۔“ ارے واہ احتشام چچا آپ کی بھی کیا کمال لا جک ہے بھائی۔“ آپ بھی ان کے ہی بھائی ہیں۔ یعنی مجھے میری ہی شادی کے لیے فیصلے کا اختیار نہیں۔“ بڑے جتاتے سے انداز میں اس نے شکایت کی تھی۔

”بیٹا تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے کہ فیصلوں کا اختیار اپنے پاس رکھو۔ یہاں تو اس عمر میں بھی کوئی کھانا بھی ہم سے پوچھ کر نہیں پکاتا۔ جس دن شکوہ کرو اسی رات تمہاری نانی منڈے پکوا لیتی ہیں۔“ بائیس آنکھ دباتے احتشام چچا اپنی بے بسی پہ ہنسے۔

”نانی نے آپ سے شادی کے متعلق تو پوچھا ہی تھا۔“ انمول نے تنک کے سوال کیا۔

”ہاں بالکل پوچھا تھا۔ کرنی ہے تو بتا دو ورنہ اگلے دس سال تک بھول جاؤ۔“ جواب ایسا تھا کہ دوبارہ سوال کی ہمت ہی دم توڑ جائے۔

”ویسے تم بتاؤ مسئلہ کیا ہے۔ کوئی اور نظر میں ہے کیا؟“ انہوں نے نہایت رازداری سے پوچھا تھا۔

”ارے کہاں ماموں۔ اپنی ایسی قسمت کہاں۔“ انمول نے جھٹ تردید کرتے مایوسی سے کہا۔

”تو پھر شکر کرو گھر سے ہی قسمت نکل رہی ہے۔“ وہ ایسے خوش ہوئے جیسے لائری نکل رہی ہو۔

”اس کا رویہ دیکھا ہے میرے ساتھ۔ ہمیں فوج میں دشمن سے جنگ کرنا سکھائی جاتی ہے شادی کی بات تو پہلی بار سن رہا ہوں۔“ انمول نے اس بار اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی۔ ”تم تو خوش نصیب ہو پہلے سے باخبر ہو۔ ہمیں دیکھو بے خبری میں زندہ ہیں۔ ارے صاحب زادے سب لڑکیاں بیوی بن کر دشمنوں کی صف میں ہی آکھڑی ہوئی ہیں۔“ ایک نہایت سرد آہ بھرتے انمول پچھانے چوتھے آم کی قاشیں پلیٹ میں کاٹنا شروع کی تھیں۔

☆☆☆

ماں اور ماموں دونوں سے ناامید ہو کر اب اس نے ڈائریکٹ چاندنی سے ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں بھی وقت کم تھا۔ تین دن بعد عید تھی اور اس کے اگلے روز ان دونوں کی ممکنہ حالات میں جلد از جلد اسے یہ رشتہ کنسل کروانا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے چاندنی کے فون پہ پہنچ کر اسے چھت پہ بلا دیا۔

چاندنی کا تو دماغ گھوم گیا تھا یہ بلا وہ دیکھ کر ابھی چند گھنٹے ہوئے نہیں زبردستی کا رشتہ طے ہوئے اور موصوف کو عشق بازیاں سو بھر رہی ہیں۔ پہلے تو یہی سوچا انکار کر دے لیکن پھر خیال آیا چھت پہ جا کر جوتے سے خاطر تواضع کرنی چاہیے لہذا جھٹ اور پینچی۔ چہرے پہ بلا کی بنجیدگی لیے آگے بڑھی۔ انمول سامنے ہی کھڑا تھا اسے دیکھ کر خیر سگالی انداز میں مسکرایا تو اس کا شک جیسے یقین میں بدل گیا کہ وہ نہ ہو یہ پھوور پن کے موڈ میں ہے۔

”چاندنی میں تم سے کچھ کہنا چاہتا

ہوں۔“ کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ احتیاطاً چاندنی ایک قدم پیچھے ہٹی لیکن اس کی اگلی بات یہ سن رہ گئی۔

”یار تم ممانی سے کہہ دو کہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں۔“ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ”اتنی رات کو تم نے مجھے یہ مشورہ دینے کے لیے یہاں بلایا ہے؟“ دل میں تو اس وقت انتہائی کمینہ خوشی کا احساس تھا کیونکہ خود اس کا دل بھی یہی ڈونگرے بجا رہا تھا کہ اسے انمول سے شادی نہیں کرنی ہے۔ اب اس کی زبانی اپنے دل کی بات جان کر تو جیسے مانچنے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن بظاہر تنجیدگی کا مظاہرہ کرتے بڑے جتاتے سے انداز میں پوچھا۔

”دراصل کوئی میری بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔ حالانکہ میں نے اُمی کو کہا بھی ہے۔“ انمول نے صفائی دیتے اسے تفصیل بتائی۔

”اور پھوپھو نے تمہاری بات نہیں مانی اس لیے تم چاہتے ہو میں اس رشتے سے انکار کر کے اپنی امی سے جو تیاں کھاؤں۔ تمہیں فوج میں نہیں سیاست میں ہونا چاہیے تھا۔“ ساری بات جان کر اسے شرم دلائی گئی تھی۔

”فوج ہرفن مولا ہوتی ہے بی بی۔ ہر چوتھین کو پینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دیکھنا نہیں آج دے کو کیسے پینڈل کیا تھا۔“ اپنی پولوشرٹ کے کارچرہاتے اس نے اپنے منہ میاں مٹھو بیٹا چاہا۔

”تم صرف بکرے ہی پینڈل کر سکتے ہو۔ اگر تم سے کچھ ہوتا تو یہاں اس وقت مجھ سے مدد مانگنے کے بجائے پھوپھو کو راضی کر رہے ہوتے۔“ اس کی ساری آکر ایک ہی جملے سے اکھاڑ پھینکی گئی تھی۔

”ایک تو تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔

”تم ہی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہوگی امی۔ بات کی لیکن تم کبھی مشکل میں کام آ جاؤ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ الٹا بلائے ناگہانی بن کر شکل بھری جان پہ پڑنے والی ہو۔“ انمول بیٹا سے بچتے تھے۔

”زیادہ نہیں تو چلو بھر پانی میں ہی ڈوب مرو انمول۔“ اشرم نہیں آتی جھوٹ بولتے وہ بھی ہوسے سامنے کھڑے ہو کر۔ تمہارا وہ پچھلا والا مسئلہ بھری وجہ سے ہی حل ہوا تھا، جس پہ تم دن رات روتی صورت بنائے گھومتے تھے۔ اور بلا تو مجھ پہ مسلہ ہو رہی ہے تمہاری شکل میں۔“ وہ اچانک جذباتی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ مزید اس کی شان میں قصیدہ کہتی سامنے سے آتی دردانہ پھر پھوپھو کو دیکھ کر تنجید ہو گئی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں اس وقت؟“ اسے مجھت زدہ دیکھ کر انمول نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ پھوپھو کی پچھلی بار کی جاسوسی کی حسرت اس بار پوری ہو گئی تھی۔ تمہا نے اوروں کی طرح یوں سوال کیا جیسے والی دلوں کو روتے تھے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

”پہ پانچیں کیا کچھ نہیں ہو رہا۔“ انمول اور چاندنی دونوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔

”اچھا تو بتاؤ کیا کچھ نہیں ہو رہا؟“ پھوپھو کو لگا اس بار والی کوئی مسالے دار بات ہاتھ لگنے والی ہے۔

”پھوپھو میں نے انمول سے شادی نہیں کر لی۔“ چاندنی نے پھر پینچیے احتجاجی انداز میں کہا تو پھوپھو کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر اس خوف سے کوئی پھر اندر نہ چلا جائے فوراً ہی بند کر لیا۔

”لو ہمیں منگنی کا بتایا اور یہاں شادی کی خبریں پھیل رہی ہیں۔ بس جی ہماری تو اتنی ہی اوقات ہے اس گھر میں۔ وقت کے وقت بتا دیں گے کل شادی ہے پہنچ جانا پرانے گھسے پٹے کپڑے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	معنی	قیمت
فرول کے ہاتھ	شادی پر ہونے	500/-
نکاح کا دن	شادی پر ہونے	250/-
ہمسفر	فرحت و شادی	400/-
میں دے آؤ	فرحت و شادی	250/-
میں جان بچے	فرحت و شادی	500/-
دل و دلی	فرحت و شادی	350/-
اتنی کا ایک	فرحت و شادی	300/-
دو بیٹی کی رہائی	آپ بے شرمی	400/-
آزاد گھر کی	آپ بے شرمی	400/-
ایک ناپسندیدہ بہت	میرا نام	200/-
وفا میں	میرا نام	180/-
امریکل	میرا نام	450/-
اک دیا ہوا رکتا	اماگ	300/-
میرے دل سے گزرنے	اماگ	120/-
میرے خواب پرورد	اماگ	300/-
میرے دل سے گزرنے	فرحت و شادی	300/-
دل سے گزرنے	آپ بے شرمی	300/-
دن کی اک دلی	دشمنانہ دشمن	500/-
میرے دل سے گزرنے	زیر دست	180/-
میرے دل سے گزرنے	فکر و فکر	180/-
میری جنت	زیر دست	250/-
بہن	فرحت و شادی	150/-
اس وقت کا دل	راحت و شادی	350/-
شادی کا دن	اماگ	300/-
رنگ و بزم کا دن	اماگ	400/-
آپ بے شرمی	فکر و فکر	400/-
میں آؤں	میرا نام	300/-
میرے دل سے گزرنے	گوتہ بہاؤ	400/-

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے بال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت 150 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جزی ٹیبلٹس کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں ڈی ٹریڈا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 950 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے ڈسٹریبیوٹر کرر ہنڈل پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے کو ڈرائس صاحب سے پتہ چائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350 روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500 روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارج شامل ہیں۔

منی آرڈر بھجوانے کے لئے ہمارا ہنڈ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہنڈ آرڈر ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزب مارکیٹ، سیکٹر فور ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

ایک شخص۔ انہیں دیکھ کر ٹوٹ خوش ہوئیں اور انہیں کے حلقے ہاتھ پاتے کرتے لگیں۔
”لو، ابھی اب یہ بھلا نہیں بیٹھے، بھائے معنی کی کیا سوچی۔ نہ صلاح نہ مشورہ۔ بہن سے دور کی بات تم نے تو بیٹھے سے بھی پوچھنا ضروری نہیں کہا۔“ پھر پھر نے جھٹ جھکوا کر دیا ساتھ ہی انمول والی بات بھی کہہ ڈالی۔

”ہائے دروان تجھے تو پتا ہے انمول میرا اکلوتا بیٹا ہے اور پھر ماؤں کو تو کتنے ارمان ہوتے ہیں اس کی شادی کے۔ اب تو خود بتا بھلا چاندنی سے ہر لڑکی ہے ہمارے خاندان میں انمول کے لئے۔“ دیکھ بہن کے مزاج کو اچھے سے جانتی تھیں لہذا ان کے شکوے کو خاطر میں نہ لاتے خوش دلی سے جواب دیا۔

”پھر بھی باہی اب کیا تم بھابھی کی باتوں سے غافل ہو جو جھٹ ان کی بیوی کو بہو بنانے کی کوشش کر رہی ہیں؟ تمہاری جگہ میں ہوتی تو سوچتا ہوں کہ انہوں نے مجھے پر اسرار لہجے میں کہا۔ اور میں کاٹھی کا مٹا ٹھکا پھر بھی انہوں نے خود کا اور لہجہ اور عام سے لہجے میں سوال کیا۔

”پھوٹی مونی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ کیا کچھ کہا ہے بھابھی نے؟“ ساتھ ہی دھیمی آواز میں کہہ اٹھا، واقعی کوئی ایسی بات ہو جو ان کے علم میں نہ ہو۔

اور ان پھر پھر کو لوہا گرم ہوتا نظر آیا اور دل ہی دل میں خود کو چٹکیاں دیتے بات شروع کرتا ہی جاتا تھا کہ اسی وقت انمول اندر آ گیا اور خالہ کو بچھنے لگا لہال ہو گیا۔

”ارے خال آئی ہیں۔“ اسے تو اچھی طرح معلوم تھا کہ آدکس وجہ سے ہوئی ہے اسی لیے آنکھ سے اشارہ کیا، بویا پھر پھوٹنے بھی بھانجے کو آنکھوں میں آنکھوں میں ٹپکی دی کہ صورت حال قابو میں

پایا۔“ انمول نے سر مارتے اچھے لہجے میں کہا۔ پھر پھوٹ کے لیے تو جیسے یہ بریکنگ نیوز تھی۔ اتنا سارا پھندا آنے والے دنوں میں ہونے جا رہا تھا اور سب سے زیادہ مزاح پھر پھوٹو ہی آنے والا تھا۔

”ویسے تیری امی بڑی تیز ہے۔ بیٹی راضی نہیں پھر بھی دیکھو کیسے زبردستی کر رہی ہے اور یہ باجی کو دیکھو اکلوتا بیٹا ہے ان کا لیکن خیال ہی نہیں اس معصوم کا۔ خیر تم دونوں پریشان نہ ہو میرے بچوں۔ میں ہوں تم دونوں کے ساتھ اور جب تک میں ہوں یہاں کسی کی مجال نہیں، تم دونوں کی شادی کروا سکے۔“ ایک ساتھ دونوں کو گلے لگاتے پھر پھوٹنے محبت سے تسلی دی تھی اور اپنی بھرپور حمایت کا یقین دلایا تھا۔

کچھ دیر تک ان کے درمیان اگلے لائحہ عمل کو لے کر گفتگو ہوتی رہی اور جھٹ سے نیچے آتے چاندنی اور انمول دونوں ہی مطمئن تھے کہ اب وہ اس رشتے کے بندھن سے آزاد ہو چکے ہیں۔ بال اب پھر پھوٹ دروان کے کورٹ، میں تھی اور وہ بیک وقت انکس اور ڈیفینڈر بن کر اسے جہاں چاہیں لے جاسکتی تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن وہ سب کام پھر پھوٹ رضیہ کی طرف پہنچ گئی تھیں۔ تمام رات پیٹ درد سے نیند ہی نہیں آئی تھی۔ بس یہی سوچ سوچ رہی تھی کہ ایسا کون سا پھندا ڈالا جائے کہ بھانجے اور بیٹی کے سامنے سرخرو ہو جائیں۔ ایک تو اپنا چمکا دوسرے اپنی ناک اونچی رکھنے کو دعوت بھی اپنے قد سے بڑا کر لیا تھا۔ ظاہر ہے دونوں نے سوچ سمجھ کر رشتہ کیا تھا اب پھر پھوٹ کے روکنے سے تو انہوں نے ممکن روکنی نہیں تھی جبکہ خود ان کے بیچ بھی اپنا اپنا زور لگا چکے تھے۔ پھر بھی ایک اچھی سی شدنی سوچ کر وہ بہن کی طرف آگئی تھیں۔ رضیہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی بازار سے واپس

پہن کر۔ میں بھی دیکھنا چھپکھلے سال والا لان کا جوڑا پہن کر ہی آؤں گی۔ پھر خوب عزت افزائی ہوگی سب کی خاندان میں۔“ وہ اپنا ہی پھندا لے کر رونے لگی تھیں۔

انمول نے ماتھا پیٹ لیا۔
”کون سی شادی۔ کیسی شادی؟ پھر پھوٹ آپ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہیں۔“ چاندنی ہکا بکا پھر پھوٹ کی آہ بقتا سننے لگی۔

”ہائے تو شخص ماری ابھی خود ہی تو کہا تو انمول سے شادی نہیں کرے گی۔“ جل کر کہتے حسب عادت پھر پھوٹ نے اس کی کمر پہ ایک زوردار دھپ رسید کی۔ وہ تلملا ہی تو گئی تھی۔

”تو معنی بھی تو شادی کے لیے ہی ہو رہی ہے نا۔۔۔۔۔ میں تو اس رشتے کی بات کر رہی ہوں۔ مجھے نہیں پسند انمول۔“ چاندنی نے وضاحت دی۔
”میری بات سنیں خالہ۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ یہ پسند نہیں ہے مجھے۔“ انمول نے بازو ہینچ کر انہیں اپنی طرف کرتے ہوئے مخاطب کیا اور اس سے بھی زیادہ ٹائپنڈی کا اظہار کیا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ واقعی؟“ پھر پھوٹ کی آنکھیں ایک سوئس واٹ کے بلب کی طرح روشن ہو گئی تھیں۔
”تو منع کر دو۔ اس میں کون سا مسئلہ ہے۔“ اپنی حیرت پہ قابو پاتے وہ عام سے انداز میں بولیں۔

”کر دیا تھا منع۔“ چاندنی نے بتایا۔
”پھر؟“ مارے جیسے کے پھر پھوٹ نے کر دیا۔

”امی نے کہا گدی کے نیچے دو ماروں گی۔“ چاندنی نے رونی صورت بناتے اندر کی بات بتائی۔

”میری تو امی اور ماموں دونوں سے بات ہوئی تھی۔ مجال ہے جو کسی ایک کو بھی اپنا موقف سمجھا

ہے۔

”ای یہ آب کا شایگ بیک آب گاڑی میں چھوڑ آئی تھیں۔“ خوشی خوشی اس نے ہاتھ میں پکڑا شایگ بیک ماں کو دیا اور خود مطمئن سے انداز میں سیٹی بجاتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھوپھو کے چہرے کی رازدارانہ مسکراہٹ دیکھ کر اسے پورا یقین تھا اس کا کام بن گیا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اس کی شادی اس تک چڑھی چاندنی سے نہیں کروا سکتی ہے۔

”باجی نے تو لگتا ہے شایگ بھی شروع کر دی۔“ انمول کے نکتے ہی دردانہ پھوپھو نے جس سے پوچھا۔ رضیہ انمول کی مداخلت سے پہلے ہی عالیہ والی بات بھول گئی تھیں اب پھوپھو کے اس سوال پر بالکل ہی ذہن سے نکل گیا۔ جھٹ بیک کھول اس میں سے سوٹ نکالا اور بہن کی طرف بڑھایا۔

”وقت ہی پھلا کتنا تھا۔“ منگنی کی چیزیں تو میں کل ہی لے آئی تھی یہ تو صبح اپنا اور تمہارا سوٹ خریدنے گئی تھی۔“ سوٹ دیکھ کر پھوپھو کی باجھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔

”ہیں میرا جوڑا؟ ذرا دکھاؤ تو۔“ رضیہ کے ہاتھ سے جوڑا کھینچ کر فائنٹ انہوں نے کھول کر دیکھا۔ اس وقت ان کے چہرے پہ چھوٹے بچوں والی خوشی تھی۔

”دیکھ کیسا ہے۔ میں نے سوچا دونوں بہنیں ایک جیسا سوٹ پہنیں گی۔ انمول جتنا میرا اتنا تیرا بھی تو بیٹا ہے۔“ رضیہ کی بات سن کر ان کی تو آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔

”ارے ہاں کیوں نہیں بلکہ مجھے تو وہ آپ سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ اللہ کتنا پیارا سوٹ ہے باجی! ویسے ایک بات تو ہے آپ کی پسند کا جواب نہیں۔“ کپڑے کو ہاتھ لگا لگا گرد مکتے وہ نہال

ہو رہی تھیں اور اس سب میں اس وقت وہ قطعی طور پہ بھول چکی تھیں کہ یہاں ان کی آمد رشتہ تڑوانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

”چل شکر، تجھے پسند آ گیا۔“ رضیہ نے ان کی خوشی سے مطمئن ہو کر کہا۔

”لیکن اب یہ سارے عید میں تو دردن باقی ہیں۔ بھلا اتنے کم وقت میں کون سی کر دے گا میرا سوٹ۔“ کوجی آئی تھیں منگنی رکوانے اور اب سوٹ سلوانے کی فکر ہو گئی۔ پھوپھو رے پھوپھو آپ کی کون سی کل سیدھی۔

”اس کی فکر نہ کر میں نے درزی سے پہلے ہی بات کر لی ہے ارجنٹ کے پیسے لے کر سی دے گا۔ فکر نہ کر سلائی بھی میں خود ہی دے دوں گی۔“ رضیہ نے تسلی دی تو پھوپھو بھی پرسکون ہو کر ایک بار پھر اپنے پیور شیفون کے سوٹ کو دیکھنے لگیں۔ ابھی انہیں اس کے ساتھ میچنگ سینڈل اور چوڑیاں بھی ملنی تھیں۔

☆☆☆

عید کی صبح نماز کے بعد قصائی کی آمد ہوئی اور ایک ایک کر کے سب جانور راہ عدم سدھارے۔ گوشت کی کٹائی کے بعد اگلا مرحلہ پکوائی تھا جو خواتین کا ڈیپارٹمنٹ تھا لہذا تقسیم والا گوشت الگ کر کے بقیہ چکن میں منتقل ہوا۔ آج سب لوگ دوپہر کے کھانے پہ مدعو تھے لہذا اسی مناسبت سے بریانی، بھنا گوشت اور نکلے بنے۔ آج حیران کن طور پہ پھوپھو کی آمد بھی صبح ہی ہو گئی تھی۔ عید کی گہما گہما اور مصروفیت میں کوئی بھی کل کی تقریب کے متعلق بات نہیں کر رہا تھا۔ چاندنی کو انمول پہلے ہی بتا چکا تھا کہ پھوپھو ان کے گھر کا دورہ کر چکی ہیں اور اب راوی چین کی بائسری بجا رہا ہے۔ کچھ بھی کیفیت چاندنی کی بھی تھی۔ اسے بھی یہی لگا تھا پھوپھو نے اس سے بات کر کے پروگرام منسوخ

کر دیا ہے لیکن وہ دونوں معصوم پرندے اس لمحے اچانک تھے کہ رضیہ نے سوٹ اور عالیہ کے اہاں اسے گردان پھوپھو کو خاموش کر دیا۔ اور پھوپھو کی چالاکی دیکھو تجھے لے کر ان دونوں کے سامنے ہوا بھی نکلنے نہیں دی تھی۔

”کی طرف تلف ہونے کے ساتھ ڈانٹے میں بھی ہے مثال تھا کہ سب خواتین کی محنت کے ساتھ محنت بھی شامل تھی۔ البتہ پھوپھو نے سب سے زیادہ توجہ دی تھی۔ شاید یہ چند روز پہلے اس کے گھر سے لیا جانے والا اپنی نوعیت کا اہتمام تھا۔ رات تک محفل کشت زعفران بنی رہی۔ چاندنی کی طرف چلی گئی جبکہ انمول اپنے دوستوں سے عید ملنے نکل گیا۔ یوں عید کا دن اپنے اہتمام کو پہنچا۔

لیکن اگلی صبح کھر میں بڑ بونگ بھی تھی۔ فٹکشن تو ہال میں تھا اس لیے کسی کو کوئی ٹینشن نہ تھی لیکن اگلی صبح تو سب نے ہی کرنی تھی۔ اس سلسلے میں زیادہ اہمیت ان مردوں کو تھا کہ عید کی نماز والا اور ان کے دوبارہ بہن کر نکل پڑنا تھا البتہ خواتین ہاں صحت چار بجے پارلیاترہ پہ جانے والی تھیں۔ چاندنی حیران پریشان سب کی تھیں دیکھ رہی تھیں کہ اسے تو ٹینشن کا ل تھا منگنی منسوخ ہو گئی ہے اور وہ اپنی روٹین کے مطابق ناشتے کے بعد گھر کے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ ہوش اس وقت آئی جب عالیہ نے جوڑا اور جیولری تھماتے اسے چھپائی تھی کے ساتھ پارلر جانے کا حکم دیا۔

”لیکن میں پارلر کیوں جاؤں امی منگنی تو کھیل رہی ہے نا؟“ فرط حیرت میں ڈوبے اس نے معصومانہ سوال کیا۔

”تجھے یہ کہنا ہے شکل اچھی نہ ہو تو بات اچھی کر لیتے ہیں۔“ عالیہ نے جلیبی جیت سر پہ لگائی اور اس نے بے بسی سے چچی کی طرف دیکھا

جو خود اس کی بات پہ حیرت زدہ تھیں۔ اسی وقت میں گیٹ کھلا اور کاسی شیفون کے کڑھائی والے سوٹ پہ گولڈن سینڈل پہنے پھوپھو بنی سنوری گھر میں داخل ہوئیں۔

”ہائے میں نے سوچا گھر سے تیار ہو جاتی ہوں پھر یہاں سے تم سب کے ساتھ ہی ہال چلی جاؤں گی۔“ چاندنی نے بے یقینی سے پھوپھو کو دیکھا۔

”ارے واہ باجی سوٹ تو بڑا شان دار پہنا ہے اور یہ جھمکیاں بھی خوب میچ کر رہی ہیں لگتا ہے نئے بنوائے ہیں۔“ چچی نے ایک ہی قاتلانہ نگاہ میں سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لے ڈالا تھا۔

”ہے نا پیاری! یہ مجھے عالیہ بھابھی نے دی ہیں۔ ابھی پہلا پہلا خوشی کا کام کر رہے ہیں جاوید بھائی تو انہوں نے کہا چھوٹی بہن کا حق بنتا ہے۔“ پھوپھو نے آگے ہو کر دکھاتے چالو سانہ انداز میں بتایا۔ چاندنی کا دل کیا سر پیٹ لے۔

”مروادیا نہ پھوپھو۔“ زیر لب بڑبڑاتے وہ اس وقت صرف جل کڑھ ہی سکتی تھی کیونکہ پھوپھو تو اپنی کرچی تھیں اور اب عین وقت پہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد چاندنی اور انمول اسٹیج پہ منہ بسورے ناک چڑھاتے ایک دوسرے کو منگنی کی انگلی پہنارہے تھے اور مبارک باد دینے والوں میں سب سے اونچا دایوم پھوپھو کا تھا۔

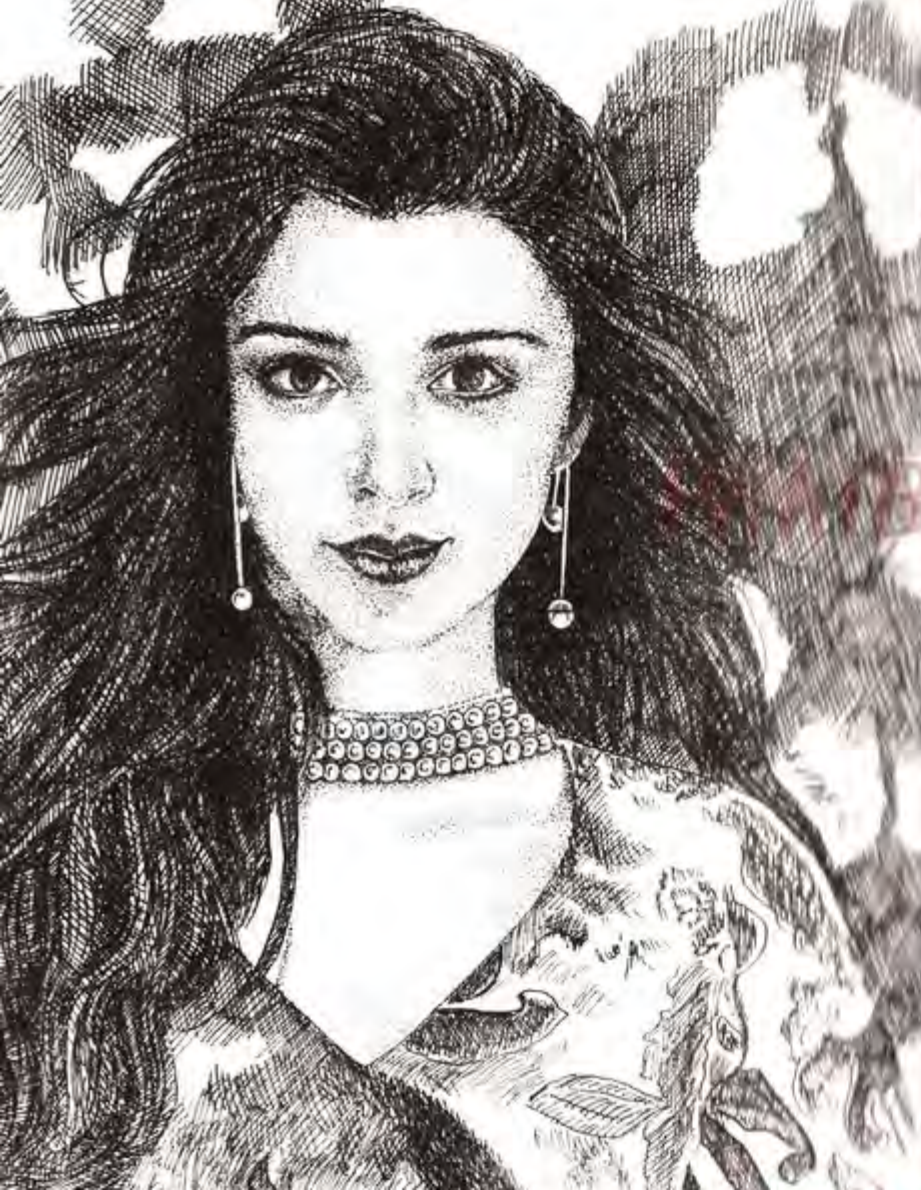
☆☆

سرونی کی شخصیت

ماڈل ————— ماحیہ خان
میلہ آپ ————— روز بیگم ہلالو
شوشی گولائی ————— میسنی رضا

آخری فتح

مکمل فن



اسے دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تاروں کی طرح چلتے تھے اور وہ یہاں اسی منڈیر پر اسی طرح بیٹھا تھا، یوں ہی گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھے۔

تب میں درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے سے اسے یوں چھپ چھپ کر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ وہاں منڈیر کے پاس گھر اسے دیکھتا تھا اور میری آنکھوں سے جیسے شعلے نکلتے تھے جو اسے جلاتے تھے، راکھ کرتے تھے۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتے ہوئے یوں ہونٹ کھولتا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ پاتا ہو اور میں اس کی سنے بغیر اس پر قہر آلود نظر ڈالتا، اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ شاید وہ میرے پیچھے بھاگا تھا، شاید اس نے مجھے آواز بھی دی تھی لیکن میری آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں اور سماعتیں بہری..... یا وہ یہاں ہی پتھر بنا بیٹھا رہا تھا ساکت..... بے جان پتھر..... مجھے ٹھیک سے یاد نہیں اور آج چار سال.....

چار سال بعد بھی وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا اس کی وہ نازک انگلیوں والے ہاتھ اسی طرح گھٹنوں کے گرد بندھے تھے اور اس کے سلیکی بال اس کی پیشانی پر بکھرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چار سال سے یہاں ہی بیٹھا تھا، جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنا ہی مضطرب اور بے چین۔ کیا وہ یہاں ہی بیٹھے بیٹھے پتھر میں ڈھل گیا تھا۔ کسی فوسل میں، لیکن وہ تو صدیوں کے عمل کے بعد فوسل بننے ہیں اور ابھی تو صرف چار سال! ہاں چار سال

وہ اپنی لانی نازک انگلیوں والے ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھے، گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے، تالاب کے کنارے بنی چوڑی لیکن پتی منڈیر پر بیٹھا تھا اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا تھا اور میں تالاب کے دوسرے کنارے پر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپا اسے دیکھ رہا تھا اور اتنے دور سے بھی مجھے لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں آنسو تاروں کی طرح چلتے ہوں اور پھر آنکھوں کو دھندلا کر جاتے ہوں بالکل ایسے ہی جیسے چار سال پہلے جب میں نے آخری بار



پہلے..... میں نے درختوں کے جھنڈ سے ذرا سا جھانک کر اسے دیکھا۔

بچپن سے لے کر جوانی تک میں نے یہاں اس جھنڈ کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھا تھا اور اسے کبھی پتا نہیں چلتا تھا کہ میں اسے چھپ کر دیکھ رہا ہوں۔ جب میں اسے بتاتا کہ آج اس نے دس ٹنکر تالاب میں چھپکے تھے اور تین چکر تالاب کے گرد لگائے تھے اور پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے آخری سیڑھی پر بیٹھ کر پانی میں ہاتھ ڈال کر وہ چھوٹی چھوٹی پھیلیاں پکڑنے کی کوشش کی تھی، جو کبھی بڑی نہ ہو پانی میں اور بچے انہیں پکڑ لیتے تھے اور پھر وہ تالاب کے کنارے ادھر ادھر نالیوں میں مردہ بڑی نظر آتی تھیں لیکن ہم نے بھی ان پھیلیوں کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہمیں تالاب میں تیرتی بھنور بنانی اچھی لگتی تھیں۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرت سی پھیل جاتی تھی۔

”ہمیں کیسے پتا چلا ثانی کہ میں آج تالاب کی طرف گیا تھا اور میں نے.....“

میں اس کی حیرت سے محفوظ ہوتا تھا۔ مجھے اسے حیران کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے متاثر ہو، حیران ہو، تب میں ایسا ہی چاہتا تھا اور کوئی شرارت کر کے اسے حیران کرنے کے لیے، میں یہاں ان درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر اسے دیکھتا تھا۔

لیکن آج میں اسے چھپ کر کیوں دیکھ رہا تھا، شاید مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

میرے قدم اسے منڈیر پر بیٹھا دیکھ کر آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے اور میں درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے سے اسے دیکھتا تھا، دیکھتا جا رہا تھا اور میری آنکھیں بار بار جھلملارہی تھیں۔ دھندلی ہو جانی تھیں، میں نے دیکھا وہ منڈیر سے اتر کر ذرا سا جھک کر کچھ اٹھارہا تھا، پھر وہ سیدھا ہوا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا پتھر اٹھا کر تالاب میں پھینکا۔ تالاب کے پانی میں پتھر گرنے سے یقیناً بھنور سا بنا ہوگا۔ بچپن میں پانی میں پتھر پھینک کر بھنور بننے دیکھنا ہمارا

ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ پتا نہیں ہمیں اس کھیل میں کیا مزا آتا تھا کہ ہم کتنی کتنی دیر پانی میں پتھر پھینک کر خوش ہوتے تھے۔

یہ تالاب ہمارے گاؤں میں رہائشی مکانوں سے پٹ کر تھا۔ اس کے چاروں طرف، چوڑی منڈیر تھی اور نیچے تالاب کے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ مجھے یاد ہے یہ بارہ سیڑھیاں تھیں اور تالاب کے دو اطراف میں بنی ہوئی تھیں۔ اس میں بارش کا پانی اکٹھا ہوتا تھا اور برسات میں تو اس کا پانی اوپر پہلی سیڑھی تک آ جاتا تھا، تالاب کے اطراف میں گھنے درخت تھے اور منڈیر کے گرد گرد کھلا میدان تھا جہاں شام کو بچے کھیلے تھے۔ گاؤں میں بیٹھے پانی کی قلت تھی، اس لیے عورتیں پکڑے وغیرہ دھونے اور دوسرے کاموں کے لیے پانی یہاں سے بھر کر لے جاتی تھیں۔ اس تالاب کو گاؤں والے سرپاک کہتے تھے یعنی پاک پانی۔ بچنے کے پانی کے لیے گاؤں میں بیٹھے پانی کا ایک کنواں تھا۔ اس وقت ہماری واحد تفریح یہاں اس تالاب میں منڈیر پر بیٹھ کر یا کبھی کبھار نیچے سیڑھیوں پر بیٹھ کر پتھر پھینکنا تھی۔ جب ہم اس کھیل سے اکتا جاتے تو منڈیر پر بیٹھ کر گاؤں کے بچوں کو پتھر گرم یا فٹ بال کھیلے دیکھتے تھے یا کبھی کبھی خود بھی ان کے ساتھ کچھ دیر کھیل لیتے تھے۔ کبھی کبھار ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گاؤں سے باہر کھیتوں کی طرف نکل جاتے تھے اور جانوروں کو پانی کے چھڑیا جو ہڑ میں نہاتے دیکھتے تھے۔

درختوں کے جھنڈ میں سے کوئی پرندہ اڑا تو اس کے پروں کی پھڑ پھڑا ہٹ سے میں نے چونک کر اسے دیکھا وہ اب پھر منڈیر پر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس نے ٹانگیں اندر کی طرف لٹکائی تھیں، میں یک دم اندر تک لرز گیا۔ تب ہماری عمریں نو یا دس سال کی ہوں گی جب ہم منڈیر پر اس طرح پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور ہمارے پاؤں پانی کو چھوتے تھے کہ برسات کی دہرے سے پانی اوپر پہلی سیڑھی تک آیا ہوا تھا کہ پتا

میں نے اسے لڑکوں میں سے کس نے اسے لٹکایا تھا، وہ تالاب میں گر گیا تھا اور میں نے بلا سوچے سمجھے اس کے پیچھے ہی چلا گیا لگا دی گئی تھی۔ میں نے اسے بے جا لالوں گا۔ گو ہمیں بابا بھی کبھی لٹکایا تھا۔ میں نے جاتے تھے لیکن وہاں تو ہم لٹکے ہوئے تھے اور اس کا بیٹا نہ گزر رہے تھے اور اس کے شور مچانے پر ادھر متوجہ نہ ہوتے تھے۔ وہاں اسی کہانی وہاں اسی روز ہی ختم ہو گئی ہوئی۔ اس میں ہم نے اس کے بیٹے نے ہمیں بچالیا کہ ہم نے اس کے بیٹے جیسا تیرا اک اگلے دس گاؤں میں ہی نہیں تھا، میں نے جبر جبری سی لی۔

وہاں یوں بیٹھا ہوا تھا اسے بھلا اب اسے کیا ہو سکتی ہے۔ بچپن تو کب کب بیت ہو سکتا تھا۔ کبھی ہائی اسکول میں آنے کے بعد ہم کبھی اسے یہاں روز آتے ہوں، ہاں کبھی کبھار لٹکاتے ہوئے ہم اپنے بچپن کی یادوں کے لیے پتھر نیچے پانی میں پھینک کر محفوظ کرتے تھے۔ وہ یہاں سے اتفاقاً گزرتے تھے۔ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے لیے وہ یہاں لٹکے بیٹھے۔ کیا یہاں منڈیر پر ٹانگیں لٹکا کر لٹکے۔ اسے یاد آیا ہوگا کہ ایک بار اسے بچانے کے لیے وہ لٹکے ہوئے تھے اور اس کے پیچھے کود گیا تھا۔

میں ایک نئے درخت کے تنے پر ہاتھ رکھے لٹکاتا تھا جو ایک بار پھر پہلے کے سے لٹکے ہوئے تھے۔ گرد ہاتھ باندھے ٹھوڑی گھنٹوں کے بعد وہاں سے لٹکے ہوئے تھے۔ درو کی ایک تیز لہر سے دل سے آگے اور پورے وجود میں پھیل گئی۔ میں نے ہاتھ رکھے رکھے نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ میری امداد آگے میں پہلے ہی چھٹی اور پھر وہ برسے گاؤں میں رو رہا تھا، گھنٹوں پر سر رکھے میں رو رہا تھا۔ میں نے وہاں سے خود پتا نہیں تھا لیکن میں نے بے نیاز رو رہا تھا اور وقت رفتہ بھر کر پیچھے

بہت پیچھے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک بڑی سی حویلی تھی۔ ایسی ہی جیسے گاؤں میں بڑے زمین داروں کی ہوتی ہیں۔ یہ حویلی چوہدری محسن علی کی تھی۔ چوہدری محسن علی کو بہت بڑے جاگیرداروں تھے لیکن اپنے اس گاؤں میں ان کے پاس سب سے زیادہ زمین تھی۔ ساری زمین انہوں نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی، تاہم اپنی زمین کے معاملات میں وہ ذاتی دلچسپی بھی لیتے تھے اور اپنی زمین پر کام کرنے والوں کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ کبھی دجھی کر گاؤں میں سب لوگ نہ صرف ان کی عزت کرتے تھے بلکہ ان سے محبت بھی کرتے تھے۔

محسن علی نے زرعی یونیورسٹی سے ماسٹر کر رکھا تھا اور اب محکمہ زراعت میں ڈائریکٹر تھے۔ سرگودھا کے نواح میں بھی ان کی کافی زمین تھی جسے گاؤں کی زمین کی طرح انہوں نے ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ وہ اپنی جاب کے سلسلے میں شہر میں رہتے تھے البتہ ہر ایک اینڈر گاؤں آتے تھے۔ حویلی میں ان کی بیگم عالیہ خاتون اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ حویلی سے حق جدید انداز کی بنی ہوئی کوٹھی عالیہ خاتون کے بھائی مظہر حسین کی تھی جو عیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے اور اپنی جاب کے سلسلے میں شارجہ میں مقیم تھے جب کہ ان کے بیوی بچے گاؤں میں اسی کوٹھی میں رہتے تھے۔ عالیہ خاتون بھی چوہدری محسن علی کی طرح بے حد ہمدرد اور گاؤں والوں کا خیال رکھنے والی خاتون تھیں۔ سو ہر وقت گاؤں کی کوئی نہ کوئی عورت اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتی رہتی اور وہ حتی الامکان اسے حل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اس وقت بھی حویلی کے زمانہ حصے میں عالیہ خاتون برآمدے میں بیٹھے تخت پر بیٹھی پانچ چھ سال کی بچی کو نورانی قاعدہ پڑھا رہی تھیں۔ برآمدے میں ایک کمرے کا دروازہ کھول کر ایک آٹھ نو سال کا بچہ باہر نکلا اور تیز تیز چلتا ہوا تخت کے پاس آ کر رکھا۔ صحت کی سرخی

الف لیله

شعرا و داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب 1200/- روپے
ڈسکاؤنٹ 300/- روپے
آج ہی 950/- روپے
مئی آڈر سال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

مستان ہو جاتی۔ یوں عالیاں چھٹی تک اس کے پاس ہی بیٹھا رہتا۔

گاؤں میں یہ انگش میڈیم اسکول ایک ملازمت کرکے حیدر نے قائم کیا تھا اور یہ اسکول کسی بھی لڑکے سے کسی بڑے اسکول سے کم نہ تھا۔ اسٹاف بھی ہائی کوالیفائیڈ اور تجربہ کار تھا۔ حسن علی جانتے تھے کہ ان کو مری یا ایسٹ آباد کے کسی رہائشی اسکول میں داخل کروایا جائے لیکن عالیہ خاتون اتنی چھوٹی عمر میں ان کو خود سے جدا کرنے کی قائل نہ تھیں۔ انہوں نے چوہدری حسن علی سے کہا تھا کہ اگر وہ کرل حیدر کے اسکول کے ماحول یا پڑھائی سے مطمئن نہ ہوں تو پھر وہ بھی بچوں کے ساتھ اسلام آباد، راولپنڈی، راولاں ہو جائیں گی لیکن بچوں کو ہرگز ہوش میں نہیں چھوڑیں گی۔ عالیاں نے اسکول جانا شروع کیا تو چند ماہ میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسکول کا معیار کسی اور اسکول سے کم نہیں ہے۔ سو ایک سال بعد شایان کو بھی انہوں نے اسی اسکول میں داخل کروادیا تھا لیکن شایان نے تو مسئلہ کھڑا کر دیا تھا کہ کرل حیدر نے عالیہ خاتون اور حسن علی سے شایان کا مسئلہ دسکس کیا۔

”اسی طرح عالیاں کا بھی حرج ہو رہا ہے، وہ اپنی کلاس میں بیٹھنے کے بجائے شایان کے پاس بیٹھا رہتا ہے، نہ ہی عالیاں شایان کو چھوڑ کر اپنی کلاس میں جانے کے لیے تیار ہوتا ہے اور نہ شایان اسے جانے دیتا ہے۔ مار، پیار، ڈانٹ کچھ بھی شایان پر اثر نہیں کرتا، اس کا کوئی مناسب حل ہونا چاہیے۔“ تب عالیہ خاتون نے فیصلہ کیا، عالیاں بھی شایان کے ساتھ دوبارہ مری میں بیٹھ جائے۔

چوہدری حسن علی نے اعتراض کیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ دو چار دن روئے گا تو وہ اپنی ٹھکانہ ہار کر چپ کر جائے گا۔ پھر نے شایان کی خدمت عالیاں کو بلا کر اس کے پاس بٹھانے کی غلطی کی ورنہ اب تک عادی ہو چکا ہوتا۔ بہر حال اب بھی اگر بچہ عالیاں کو نہ بلائے تو شایان کب تک

”تو میں زمین کو ساتھ لے جاؤں باغ میں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور ابھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اسی کمرے سے عالیاں کتاب ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔ سرخ و سپید رنگت، براؤن آنکھیں، سنہرا پن لے ایسے ہی سلی بال۔ وہ دیکھنے میں شایان کا ہم عمر ہی لگتا تھا لیکن وہ اس سے بڑا تھا، ایک سال اور چار ماہ۔ دیکھنے والوں کو بھی ان کی عمر میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا، وہ انہیں جڑواں ہی سمجھتے تھے اور وہ پڑھتے بھی ایک ہی کلاس میں تھے اور یہ ایک ہی جماعت میں پڑھنے کی کہانی بہت دلچسپ تھی۔ جب شایان کو اسکول میں داخل کروایا گیا تو رورو کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ عالیہ خاتون کے بغیر اسکول جانے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔

”بھائی بھی تو اسکول جاتا ہے نا۔“ عالیہ خاتون نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن شایان رورو کر حشر کر دیتا۔ عالیاں بھی چار سال کی عمر میں اسکول گیا تھا لیکن اس نے شایان کی طرح تنگ نہیں کیا تھا۔ عالیہ خاتون ملازمہ کے ساتھ خود اسے چھوڑنے جاتیں اور اسے زبردستی اس کی ٹیچر کے حوالے کر کے واپس آتیں لیکن وہ تو کلاس روم کے دروازے کے پاس ہی لیٹ جاتا اور یوں چل چل کر روتا کہ بہ مشکل چوکیدار اسے قابو میں کر کے سیٹ پر بٹھاتا۔ وہ روتا اور پھلتا رہتا۔

”میرے بھائی کو بلاؤ۔“ جانتا تھا کہ عالیہ خاتون جا چکی ہیں۔ عالیاں جو رپ میں تھا اور اس کا روم دوسرے بلاک میں تھا، پھر تنگ آ کر اسے بلا لیتی۔ شایان کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ شایان اس کا ہاتھ پکڑ لیتا دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے ہوتے۔ شایان کا رونا بند ہو جاتا تھا لیکن اس نے عالیاں کا ہاتھ اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوتا کہ پھر لاکھ کوشش کرتی وہ اس کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا اور اگر زبردستی ہاتھ چھڑا کر عالیاں کو اپنی جماعت میں بھیجا جاتا تو شایان پھر یوں چل چل کر روتا کہ ٹیچر بھی

سے چپکے ہوئے گندم رنگ رخسار گھور سیاہ آنکھوں میں بے تحاشا چمک چمک تھوڑے تھوڑے سے گھٹکھٹکے بال بھی بے حد سیاہ تھے۔ یہ شایان علی تھا اور تخت کے پاس کھڑا عالیہ خاتون کو دیکھ رہا تھا۔

”اماں جان آپ اس مینا مینا کی بچی کو کب تک پڑھائیں گی۔“

”کیوں، کیا آپ کو پڑھنا ہے؟“ عالیہ خاتون نے بے حد شفقت اور محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں، میں نے صبح مولوی صاحب سے پڑھ لیا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس کے ساتھ باغ میں جا کر کھیلنا ہے۔“

”تو آپ عالیاں کے ساتھ باغ میں جا کر کھیل لیں، بھلا زمین آپ کے ساتھ کیا کھیل سکتی ہیں۔“ عالیہ خاتون کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”لیکن مجھے تو اسی کے ساتھ کھیلنا ہے۔ آپ پلیز اسے میرے ساتھ باغ میں جانے دیں، مجھے عالی کے ساتھ نہیں کھیلنا۔“

زمین عالیہ خاتون کی بھتیجی تھی اور عالیہ خاتون ہی نہیں چوہدری حسن علی اور دونوں بچے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

”کیوں، کیا عالیاں کے ساتھ آپ کی لڑائی ہوئی ہے۔“

”نہیں تو..... بھلا میری عالی کے ساتھ کیوں لڑائی ہوگی۔ وہ تو میرا بھائی ہے اور بھائیوں کی تو بھی لڑائی نہیں ہوتی اور ہم تو بھی نہیں لڑتے۔“

اسے عالیہ خاتون کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور اس نے قدرے ناگواری سے انہیں دیکھا تھا۔

”اور بھی آپس میں مت لڑنا میری جان! زندگی بھر نہیں۔“ عالیہ خاتون کی آنکھوں میں محبت کا شگفتہ مارتا دریا بہہ رہا تھا، انہوں نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

”ہمیشہ ایسے ہی رہنا، اسی طرح محبت اور پیار سے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

روئے گا۔ عالیان کا سال کیوں ضائع کرنا چاہتی ہیں، ویسے بھی آج کل نرسری، پریپ، ون کتنے سال ضائع ہو جاتے ہیں بچے کے۔

”اچھا ہے نا چوہدری صاحبہ عالی کی بنیاد اچھی ہو جائے گی۔ ہمارا عالی تو پہلے ہی اپنی کلاس کا سب سے ذہین بچہ ہے اور سو فیصد مارکس لے کر پریپ میں آیا ہے۔“

چوہدری محسن کو عالیہ خاتون کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ یہ بات عالیہ خاتون بھی جانتی تھیں کہ عالیان کتنا ذہین ہے لیکن وہ اپنے دل کا کیا کر تیں جو شایان کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ تب انہوں نے شایان کا ایڈیشن بھی پریپ میں کروا دیا۔

”اس کی نرسری کی تیاری میں خود گھر میں اسے کروالوں گی۔“ انہوں نے کرل حیدر سے کہا تھا۔

”اور فرض کریں وہ اچھا رزلٹ نہ دے سکا تو ایک سال مزید پریپ میں رہ لے گا تب تک وہ سیٹ بھی ہو جائے گا۔“

”اب یہ آپ شایان کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔“ محسن علی کو پھر بھی اعتراض تھا۔

”اس کے ختمے سے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔“ لیکن عالیہ خاتون نے انہیں قائل کر ہی لیا تھا، گو انہیں شایان کے ساتھ بہت محنت کرنا پڑی تھی اور اس طرح عالیان کچھ نظر انداز بھی ہوا تھا لیکن انہوں نے شایان کو نرسری کا کورس کروا دیا تھا اور ساتھ میں پریپ کی بھی تیاری کروا رہی تھیں۔

”آپ کو بھائی سے کم نمبر نہیں لینے، آپ کو ان سے زیادہ نمبر لینے ہیں۔“

وہ اس کے دل میں پڑھائی کا شوق پیدا کرنے کے لیے اکثر چرب و پز ہننے کے لیے کسی صورت تیار نہ ہوتا کہا کرتی تھیں۔ یوں دونوں ایک ہی کلاس میں تھے اور عموماً دونوں کے نمبروں میں ایک یا دو نمبروں کا ہی فرق ہوتا تھا۔

☆☆☆

”اماں جان! میں نے اپنا سبق یاد کر لیا ہے۔“

عالیان نے ان کے قریب آ کر کہا۔

”شباباش بیٹا!“ انہوں نے شایان کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور سکرائیں۔

”اماں جان! اب میں زمین کو باغ میں ساتھ لے جاؤں۔ آپ نے کہا تھا نا پہلے سبق یاد کر لوں اور زمین بھی اپنا سبق سنالے تو پھر چلے جانا باغ میں۔“

”ہاں ہاں چلے جاؤ۔“

عالیہ خاتون کو یاد آیا کہ انہوں نے عالیان سے کہا تھا کہ وہ پہلے سبق یاد کر لے پھر چلا جائے باغ میں۔ زمین فوراً ہی تخت سے کود کر اترتی تھی اور نورانی قاعدہ عالیہ خاتون کو پکڑا کر عالیان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”چلیں عالی!“

دراصل عالیان نے اپنے باغ میں خرگوش کے بچے دیکھے تھے اور وہ یہ بچے زمین کو بھی دکھانا چاہتا تھا۔

”لیکن اماں جان! میں نے عالی سے پہلے آپ سے کہا تھا کہ مجھے زمین کے ساتھ باغ میں جا کر کھیلنا ہے۔“ شایان نے غصے سے زمین پر پاؤں چنپا، وہ ایسا ہی تھا۔ غصیلا اور خلاف مرضی بات پر فوراً منہ پھلکا کر ناراض ہو جاتا تھا۔

”لیکن ہم کھیلنے نہیں جا رہے، عالی مجھے خرگوش کے بچے دکھائے گا۔“ زمین کو شایان کا ضد کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ عالیان نے ایک نظر ناراض سے شایان اور پھر عالیہ خاتون پر ڈالی جو پریشان سی ہو کر شایان کو دیکھ رہی تھیں۔

”اوکے شانی! آپ چلے جائیں زمین کے ساتھ باغ میں کھیلنے۔ میں..... ہاں مجھے یاد آیا ابھی مجھے ایک مضمون بھی تو لکھنا ہے۔ مائی بیسٹ فرینڈ پر۔“ عالیہ خاتون کے لبوں پر یک دم مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے تشکر نظروں سے عالیان کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ عالیان نے مضمون صبح ہی لکھ لیا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بہت صلعو تھا۔ وہ شایان کی طرح ضد نہیں کرتا تھا اور کئی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ شایان کے ضد کرنے پر وہ اپنی چیزوں سے دست بردار ہو جاتا تھا۔ وہ عالیہ خاتون کو پریشان نہیں دیکھ

”اماں مجھے عالی کے ساتھ ہی جانا ہے خرگوش کے بچے دیکھنے۔“ وہ زمین تھی، عالیان نہیں جو کلاس کی بات مان لیتا تھا۔

”تو میں آپ کو دکھاؤں گا نا خرگوش کے بچے، عالیہ! آپ لے کر خرگوش کے دو بچے آپ کو لے آؤں گا۔ آپ لے جانا۔“

وہ چار سال کی بچی ہی تو تھی، خوش ہو گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے معذرت طلب نظروں سے عالیان کی طرف دیکھا تھا جیسے اسے عالیان کے ساتھ جانے کا احساس تھا۔

”عالی آپ بھی چلیں نا۔“ زمین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ہاں آپ دونوں بھائی چلے جائیں۔“ عالیہ خاتون نے بھی تائید کی تھی۔

”نہیں، زمین شانی کے ساتھ چلی جائے۔“

عالیان نے انکار کر دیا تھا شایان کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے زمین کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اب اس کا ہاتھ باز۔ زمین کی طرف جا رہا تھا۔ محسن میں سے ہی ایک دردناک آواز باغ میں کھلتا تھا۔ حویلی سے ملحق ہالک آواز تھا جس میں آم، امرود، جامن، انار، گندم، چولہا اور است تھے۔ کئی اقسام کے پھول کھل رہے تھے۔ ان کی بو بھی آ رہی تھی۔ چوہدری محسن کی اہلی زوجہ کی وجہ سے یہ چھوٹا سا ایک بڑا باغ تھا۔ بچوں کے لیے جھولے اور لڑائیوں کے لیے جگہ تھیں۔ بچے یہاں آ کر خوش ہوتے تھے اور پہلے پہل عالیان نے ہی اسے باغ میں لے جاتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی طور پر مقررہ ایک بھائی کے ساتھ حویلی سے ملحق ہالک آواز میں رہتا تھا۔

عالیان زمین کا ہاتھ پکڑے جا رہا تھا، اس کی آنکھوں میں ہلکی سی آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ۔ اس کی فارغ کے لبوں پر اپنی فتح پر نمودار

ہوتی ہے اور یہ کوئی پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا کہ عالیان اس کی خوشی کے لیے اپنی خواہش سے دست بردار ہوا ہو کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی بہت بڑا تو نہیں تھا صرف دس سال کا تھا لیکن اس کے ذہن میں تھا کہ وہ بڑا ہے اور اسے ہمیشہ شایان کا خیال رکھنا ہے۔ شاید عالیہ خاتون نے بھی ایسی ہی بات کہی تھی کہ اسے بھائی کا خیال رکھنا تب شاید تب جب شایان پہلی بار اسکول گیا تھا اور تب سے لے کر اب تک وہ ہمیشہ ہی شایان کا خیال رکھتا آ رہا تھا۔ اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ جب وہ زمین کے ساتھ باغ میں جائے گا تو اسے خرگوش کے دو بچے گفٹ کرے گا لیکن شایان کی خوشی کی خاطر اس نے اپنی خواہش دل میں چھپالی تھی جبکہ شایان صبح کے احساس سے سرشار زمین کا ہاتھ تھامے جا رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے جب عالیان نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنا سبق یاد کر کے زمین کے ساتھ باغ میں جائے گا تو تب ہی اس نے سوچا تھا کہ وہ زمین کے ساتھ باغ میں جائے گا اس لیے تو وہ جلدی جلدی کام کر کے باہر آ گیا تھا۔ اسے ہر کام میں عالیان سے آگے رہنا ہوتا تھا۔ وہ عالیان سے پہلے زمین کو خرگوش کے بچے دکھانے لے گیا تھا اب بھلا وہ دس بار زمین کو لے جائے خرگوش کے بچے دکھانے اور یہ پہلی اور آخری بار نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ ہی عالیان سے سبقت لے جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ یہ رہتا تھا کہ اسے عالیان سے آگے رہنا ہے۔ ہر میدان میں اور اس کے لیے وہ بھرپور کوشش کرتا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ عالیان سے جلتا اور حسد کرتا تھا۔ وہ تو اس پر جان دیتا تھا، دونوں میں مثالی محبت تھی۔ پتا نہیں کب اور کیسے وہ خود کو عالیان سے برتر سمجھنے لگا تھا شاید تب سے جب وہ تحریر کلاس میں تھے۔ ایک روز بریک میں عالیان کا ہاتھ لگنے سے ایک بچہ کا سوسہ بچے گر گیا، جسے وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ لڑکے نے جو ان کا ہم جماعت ہی تھا یک دم ہی ایک زوردار ٹھٹھرا عالیان

کے رخسار پر مارا۔

”اندھے ہو، میرا سموسہ گرا دیا۔“ اس نے پہلے کہ وہ ایک پتھر اور عالیاں کو لگاتا، شایان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم..... تم نے میرے بھائی کو مارا۔“ شایان کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے لڑکے کو دکھانے کے لیے نیچے گرایا تھا اور اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار رہا تھا۔ وہ شایان کے مقابلے میں دبلا پتلا اور کمزور سا تھا۔

”بس کرو شانی! پیلز چھوڑ دیں اسے۔ کوئی بات نہیں اگر اس نے مجھے پتھر مارا ہے، میری وجہ سے اس کا سموسہ بھی تو گر گیا تھا۔“ لیکن عالیاں کے منع کرنے کے باوجود اس نے لڑکے کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر دی تھی اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے لڑکے کو وارننگ دی تھی۔

”آئندہ میرے بھائی پر ہاتھ نہ اٹھانا۔“ اس نے زبردستی دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑا لیا تھا۔

”اور یہ دوس روپے اپنے سموسے کے۔“ اور پھر مسکرا کر عالیاں کی طرف دیکھا تھا جو پریشان سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اب عامر آپ کی شکایت کر دے گا اور نیچر آپ کو سزا دیں گی۔“

”تو.....“ اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے عالیاں کا بدلہ لے لیا تھا اور وہ خوش تھا۔ عامر نے ہی نہیں دوسرے لڑکوں نے بھی اس کی شکایت کی تھی کہ اس نے بریک میں عامر کو مارا ہے اور نیچر نے سزا کے طور پر اسے کلاس روم سے باہر کھڑا کر دیا تھا لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ عالیاں بھی پانی پینے اور بھی کسی اور بہانے سے باہر آتا تھا۔

”شایان آپ سوری کر لیں عامر سے بھی اور نیچر سے بھی۔ آپ نے خواہ خواہ اسے مارا۔“

”اس نے پہلے آپ کو پتھر مارا تھا اور جو بھی آپ کو مارے گا میں ضرور اسے ماروں گا۔“

شایان کی اپنی سوچ تھی۔ اسے ذرا سی بھی

شرمندگی نہیں تھی اور وہ فخر سے گردن اکڑائے کھڑا تھا اور عالیاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اسے کلاس روم میں بھیج کر خود اس کی جگہ کھڑا ہو جائے۔ اس نے خود ہی اس کی طرف سے عامر اور نیچر سے سوری کر لیا تھا۔ لیکن پھر بھی نیچر نے دو پیریدہ اسے کلاس روم سے باہر کھڑا رکھا تھا اور یہ پہلی اور آخری لڑائی نہیں تھی جو اس نے عالیاں کی خاطر کی تھی اس کے بعد بھی کئی بار عالیاں کی وجہ سے اس کی دوسرے لڑکوں سے لڑائی ہوئی تھی۔ ایک بار تو اپنا بازو بھی تڑوا بیٹھا تھا تب وہ آٹھویں جماعت میں تھا۔ عالیاں ہر بار شرمندہ ہوتا اور ہر بار ممنون ہوتا اور اسے سمجھاتا کہ وہ خود کو مشکل میں نہ ڈالا کرے۔ کلاس فیلوز میں ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے اور لڑائیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن وہ بھی شایان علی تھا۔ اس کے سامنے کوئی عالیاں سے جھگڑا کرے۔ اسے گالی دے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ عالیاں کا بدلہ لے کر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا کہ جو کام عالیاں نہیں کر سکتا تھا وہ کام وہ کر سکتا تھا۔ یہ کام اسے اپنے اندر مغرور سا کر دیتا تھا۔ وہ عالیاں سے برتر تھا اور اسے ہر لحاظ سے عالیاں پر فوقیت حاصل تھی یہ خیال جانے کب اور کیسے اس کے دل میں جا گزریں ہوا تھا لیکن جا گزریں ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اسے ہر مقام پر خود کو عالیاں سے برتر ثابت کرنا تھا اور وہ کرتا تھا۔ وہ عالیاں کے مقابلے میں صحت مند تھا، بھرا بھرا جسم، بے پناہ خوب صورت آنکھیں، قد اگرچہ دونوں کے برابر ہی تھے لیکن عالیاں کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ بے حد گلابی ہونٹ سنہرا پن لیے براؤن آنکھیں، براؤن سلی بال، پیچھے کرنے کے باوجود ماتھے پر بکھر جاتے تھے۔ بلاشبہ ایک خوب صورت لڑکا تھا لیکن شایان بھی کم نہ تھا۔ اس کی گھور سیاہ آنکھیں اور چہرے کے دلکش نقوش میں بلا کی جاذبیت تھی۔ عالیاں سارا کا سا عالیہ خاتون پر گیا تھا جبکہ شایان کی تھوڑی بہت محرومی علی سے مشابہت تھی خاص طور پر اس کی گھور سیاہ آنکھیں اور ہلکے ہتھکڑے یا بال بالکل چوہدری محسن علی جیسے تھے۔

شایان کا دل بڑھائی سے زیادہ کھیل کود اور دوسری سرگرمیوں میں لگتا تھا لیکن وہ کسی طرح بھی عالیاں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا سب سے حد محنت کرتا تھا اور ہمیشہ عالیاں سے ایک دو نمبر زیادہ لے لیتا تھا۔ یوں وہ فرسٹ اور عالیاں سکینڈ ہوتا۔ جب عالیہ خاتون فخر سے محسن علی کی طرف دیکھتیں تو اسے انجانی کی نوٹی ہوتی تھی۔ شروع شروع میں تو انہوں نے چوہدری محسن علی کو بتایا بھی تھا کہ ان کا فیصلہ غلط نہیں تھا اور یہ کہ شایان نے ایک سال کی کمی پوری کر لی ہے اور ان کے خدشے کے مطابق وہ کلاس میں پیچھے نہیں رہا تھا۔ محسن علی مسکرا دیتے تھے کہ شایان کی کامیابی انہیں بھی خوش دیتی تھی۔

یہ سب آپ کی محنت اور لگن ہے عالیہ!“ وہ اعتراف کرتے تھے لیکن عالیہ خاتون کی محنت کی ایک اور بات بھی تھی جو وہ نہیں جانتے تھے۔ شایان علی کے لاشعور میں چھپی خواہش عالیاں سے برتر ہونا، اسے ہر انا لاشعوری طور پر اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ خود بھی اپنے لاشعور میں جیسے اس جذبے سے بھرا ہوا تھا۔ شاید یہ جذبہ اس وقت اس کے دل میں پیدا ہوا تھا جب عالیہ خاتون اسے نرسری کی تیاری کراتے ہوئے دیکھیں۔

”آپ کو بہت اچھی طرح سے پڑھنا ہے اور عالیہ خاتون ہونا ہے ورنہ بابا آپ کو نرسری میں بھیج دیں گے۔“

ہر حال یہ جذبہ جیسے بھی پیدا ہوا تھا، جوں جوں وہ بڑھتا گیا وہ سوچنے لگا تھا کہ وہ صرف جیتنے کے لیے لڑتا ہے۔ وہ عالیاں ہو یا کوئی اور اسے سب سے بہتر بنانا ہے۔ وہ کھیلوں، تقاریر، مباحثوں سب میں عالیہ خاتون لیتا تھا۔ عالیاں کو ان غیر نصائی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ شایان کے اصرار پر ان میں حصہ لیتا تھا اور دوسری تیسری باتوں سے لیتا تھا لیکن بڑھائی میں شایان کو سر توڑ

محنت کرنا پڑتی تھی، وہ عالیاں کے بنائے نوٹس سے بھی فائدہ اٹھاتا اور ضرورت پڑنے پر اس سے مدد بھی لے لیتا تھا۔ عالیاں نے بھی اس سے مقابلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی روٹین سے پڑھتا تھا اور شایان کی کامیابی پر اس سے زیادہ خوش ہوتا تھا۔ اگر محسن علی کے مقابلے میں عالیاں اور وہ مقابل لے آ جاتے تو اسے لگتا جیسے وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہو۔ اگر وہ عالیاں سے ہار گیا تو اماں جان کا وہ مان جو اس پر بے ٹوٹ جائے گا۔ نہیں اسے عالیاں سے نہیں ہارنا اور وہ جیت بھی جاتا تھا اور پھر ایک بار اسے لگا تھا وہ عالیاں سے ہار گیا ہے عالیاں اس سے برتر ہے اور وہ..... وہ تو کچھ بھی نہیں۔

میٹرک کے ایڈمیشن جارہے تھے اور فارم فل کرنے سے پہلے نیچر نے انہیں برتھ سٹیفیکٹ یا ”ب“ فارم کی کاپیاں لانے کے لیے کہا تھا۔ ان دنوں نویں دسویں کا اکٹھا امتحان ہوتا تھا۔ عالیہ خاتون عصر کی نماز پڑھنے لگی تھیں کہ شایان نے ان سے آ کر کہا۔

”اماں جان مجھے عالی کا اور اپنا برتھ سٹیفیکٹ چاہیے اس کی کاپی کل اسکول لے کر جانا ہے۔ میں شہر جا رہا ہوں، وہاں ہی پرکاپی کرواؤں گا۔“

”شہر کیوں جارہے ہیں آپ؟“

”عادل کے ہاں دعوت ہے، اس کے بھائی نے سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کی ہے تو اسی سلسلے میں وہ لوگ ایک بڑی دعوت کر رہے ہیں۔ عادل نے بہت اصرار کیا تھا۔“

عادل کا خاندان سال بھر پہلے تک یہاں گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ اچھا کھاتے پیتے لوگ تھے۔ عادل، عالیاں اور شایان کا ہم جماعت تھا۔ وہ لوگ سال بھر پہلے ہی شہر شفٹ ہوئے تھے۔

”عالیاں بھی جارہے کیا؟“ عالیہ خاتون نے پوچھا۔

”نہیں، اس کے سر میں درد ہے اور کچھ فلو سا بھی ہے۔“

”تو آپ اکیلے جائیں گے۔“ وہ کچھ پریشان

کی ہو گئی تھیں۔

”اوہ..... ہوا ماں جان! بچہ نہیں ہوں میں۔“

”پھر بھی بائیک پہ مت جا بے گا، گاڑی لے

جانا اور شاہو چاچے کہنا احتیاط سے ڈرائیو کریں۔“

”اوہ کے اور کچھ..... اب پلیز وہ شفیقیت دے

دیں۔ عادل نے کہا تھا جلدی آنا اور پھر مجھے کچھ

شاپنگ بھی کرنا تھی۔ کہاں ہیں۔“

”کہاں ہونا ہے سارے ضروری کاغذات،

آپ کے بابا کے لاکر میں ہی ہوتے ہیں۔ لاکر کی

چابی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہوگی۔“

اور وہ ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا، عالیہ

خاتون نے نماز کی نیت کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر

ایک دم ہی گرا لیے۔

”برتھ شفیقیت۔“ انہوں نے زیر لب کہا۔

”شایان کا برتھ شفیقیت.....“ کبھی نہ کبھی تو یہ وقت آتا

تھا اور یہ وقت آ گیا تھا۔ ایک سال سے چوہدری حسن

علی ان سے کہہ رہے تھے کہ شایان سمجھ دار ہو گیا ہے

بہتر ہے کہ اسے حقیقت بتادی جائے اور یہ اس کا حق

ہے لیکن پتا نہیں کیوں وہ ڈر جاتی تھیں۔

”نہیں ملک صاحب! ابھی نہیں۔ ابھی اسے

کچھ اور پیچور ہونے دیں۔ آپ کو پتا ہے نا وہ تھوڑا

ضدی ہے۔ پتا نہیں سب جان کر اس کا کیا رد عمل ہو،

وہ کیسا سوچے اور آج اس وقت جب چوہدری حسن علی

بھی گھر پر نہیں ہیں وہ اسے کیسے پینڈل کر پائیں گی۔

کیسے سمجھا پائیں گی کہ بے شک انہوں نے اسے جہنم

نہیں دیا لیکن وہ انہیں عالیان سے بڑھ کر پیارا ہے۔

کتنی بڑی غلطی ہو گئی ان سے انہوں نے بلا سوچے

سمجھے اسے لاکرز میں سے شفیقیت لینے بھیج دیا۔ وہ

اسے ٹال دیتیں، رات کو جب حسن علی آتے تو خود ہی

مناسب انداز میں اسے بتا دیتے۔

اسنے سال گزر گئے تھے، انہوں نے کبھی ایک

لبے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ شایان کو انہوں نے

جہنم نہیں دیا لیکن ان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔

حقیقت تو بہر حال حقیقت تھی اور اسے ایک روز ظاہر

ہونا ہی تھا۔ عالیان ابھی ایک سال کا ہی تھا کہ ریان

ان کی گود میں آ گیا تھا۔ جب انہیں اس کی آمد کا پتا

چلا تھا تو وہ بے حد گھبرا گئی تھی۔

”یا اللہ اب کیا ہوگا۔ ابھی عالی بہت چھوٹا ہے،

میں کیسے سنہنیاں پاؤں گی دونوں کو۔ پلیز کچھ کریں،

مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے ابھی۔“

”نا شکری مت کریں عالیہ! اور اللہ تعالیٰ کا شکر

ادا کریں کہ وہ ایک بار پھر آپ کو ماں بننے کے رتبے

سے سرفراز فرما رہا ہے۔“ حسن علی کو ان کی بات بہت

بری لگی تھی۔

”آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گی جس سے بچے کو

نقصان پہنچے۔“ انہوں نے سختی سے کہا تھا اور وہ کبھی

بظاہر تو خاموش ہو گئی تھیں لیکن باروں میں خیال آیا

کہ اللہ کرے ایسا کچھ ہو جائے کہ یہ سلسلہ خود ہی ختم

ہو جائے بلکہ دو تین بار تو انہوں نے جان بوجھ کر

بھاری بھاری سامان اٹھایا لیکن جس روح نے دنیا

میں آنا ہوتا ہے وہ آ جاتی ہے۔ وہ ایک بار پھر ایک

بیٹے کی ماں بن گئی تھیں۔ جب نرس نے پٹی بار ریان

کو ان کی گود میں دیا تو وہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھتی

رہ گئی تھیں۔ عالیان بھی بہت پیارا تھا لیکن ریان تو

جیسے چاند کا ٹکڑا تھا اور وہ اتنی ناشکری تھیں کہ اس کے

دنیا میں نہ آنے کی دعا میں کرتی تھیں۔ چوہدری حسن

علی نے ریان کے لیے الگ سے گورنس رکھ دی تھی

گو جو جلی میں عالیان یا ریان کو سنبھالنے والوں کی کمی

نہ تھی۔ لیکن جس طرح عالیہ خاتون ریان کی آمد کی خبر

سے لے کر اب تک پریشان رہی تھیں چوہدری حسن

علی نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ ریان کی مکمل ذمہ داری

ایک سمجھ دار اور ذمہ دار نرس یا آیا کو دے دی جائے۔

لیکن عالیہ خاتون نے صاف انکار کر دیا۔

”ہرگز نہیں۔ بھلا اتنے چھوٹے بچے کو آپ ماں

سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا ایک ماں سے بڑھ کر کبھی

کوئی اس کے بچے کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔“

”میں نے آپ کی پریشانی کے خیال سے

انہیں رکھا ہے۔ اچھی قابل اعتماد خاتون ہیں، کچھ

کوہدری صاحب است کے بچوں کی بھی دیکھ بھال

کرتی تھیں۔“

”میں ایک دم یہ خبر سن کر گھبرا گئی

تھی لیکن اپنے بچوں کو خود سنبھال سکتی ہوں اور

چوہدری صاحب نے اسے صاف اور صدف تو ہیں نا۔“

وہ کس جلی لے اصرار کے باوجود انہیں رکھنے کو

لائی تھیں۔ ”کی ممکن۔ عالیان اور ریان دونوں بچے ہی

ملنے کی نہیں تھے اور نہ ہی تنگ کرتے تھے۔ عالیان کو تو

ایک سالہ ہی تھا وہ سنبھال سکتی لیکن ریان کو تو کبھی

انہوں نے نہ دیکھا تھا۔ اس کے حوالے

سے وہ کبھی پریشانی محسوس نہیں کرتی تھیں۔ اس کا فیڈر

کے ہاتھ صحت مند تھے۔ شاید وہ میں کہیں کوئی وہم سا

تھا کہ اسے کبھی ہاتھ نہ ہونے ہو جائے کہ انہوں نے اس

بچے کو اپنا نہیں نہ آنے کے لیے کئی بار دعائیں کی

تھیں اور پھر ان کا وہم سچ ہو گیا تھا صرف چھ ماہ

ساعت دن کی عمر میں ریان کو اللہ نے واپس لے لیا

تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رات کو انہوں نے خود اسے کاٹ

کر ڈالا تھا۔ وہ بچے کو نہ ہی دیر تک ان کی

گود میں رکھتا رہا تھا۔ وہ ڈرا سا اس کی

گود میں رکھتا رہا تھا۔ کھٹکھٹانے لگتا تھا۔

رات کو وہ بار بار انہوں نے اسے دیکھا تھا

وہ ہاتھ ملانے سے ڈرتا تھا لیکن جب وہ انہیں اور

اپنے ہاتھ لگاتے۔ لے کاٹ پر چھیں تو ان کی جگہ نکل

گئی۔ اس کے ہاتھ نیلے ہو رہے تھے اور آنکھوں

کے پیرے ہاتھ مدام تھا اور اس کا جسم ٹھنڈا تھا۔

پھر اس کی ال سے ہاتھوں نے محسوس کی تو وہ چیختی

پڑ گئی۔ ”کی ممکن۔ عالیان نے یقین نہیں آیا تھا۔

مالی کو کو، انہیں تو اس طرح ٹپ ٹپ کر روتیں

تھیں۔ ”کی ممکن۔ عالیان نے یقین نہیں آیا تھا۔

”آتا رہوں گا بھائی صاحب! لیکن مستقل

رہنا مشکل ہے۔“

”جیسے پہلے آئے ہو تو سال بعد۔“

حسن علی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی زمین، اپنی

مٹی چھوڑ کر جائیں۔

”اب تو اس کے لیے آنا ہی بڑے گا۔“

فراموش کر بیٹھی تھیں۔ ایسے میں چوہدری حسن علی کے

بھائی چوہدری احسن علی اپنے دوماہ کے بیٹے کو اچانک

امریکا سے لے کر آ گئے تھے۔ ان کی بیوی اچانک دو

ماہ کے شایان کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ وہ چند سال

پہلے چوہدری حسن علی کے منع کرنے کے باوجود امریکا

چلے گئے تھے اور دو سال قبل انہوں نے وہاں ہی کسی

امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

”بھابھی اسے اپنا ریان ہی سمجھے گا۔“

شروع شروع میں تو اپنی ذہنی حالت کی وجہ

سے وہ شایان کی طرف متوجہ نہ ہو سکتی تھیں۔ بس خالی

خالی آنکھوں سے اسے روتے دیکھتی رہتی تھیں۔

ایک روز جو اس نے رونا شروع کیا تو صالحہ صفوحی

کہ چوہدری احسن کی گود میں جا کر بھی چپ نہ ہوا

تب لے کر رار ہو کر انہوں نے اسے گود میں لے لیا اور

وہ ان کی گود میں آتے ہی خاموش ہو گیا تھا اور انہوں

نے شایان کو ریان کا نعم البدل جان کر سینے سے لگا لیا

تھا۔ ان کی روز بروز خراب ہوئی ذہنی حالت بھی بہتر

ہونے لگی تھی۔ وہ جب اسے گود میں لے کر فیڈ

کروا تیں تو انہیں لگتا وہ شایان نہیں ریان ہے۔ اللہ

نے ریان لے کر انہیں شایان دے دیا تھا۔ اللہ نے

انہیں معاف کر دیا تھا۔ وہ شایان کا عالیان سے بھی

زیادہ خیال رکھتی تھیں۔

انہوں نے شایان کو صرف دودھ ہی نہیں پلایا

تھا انہیں لگتا تھا جیسے انہوں نے ہی اسے جنم دیا ہے۔

شایان کی طرف سے مطمئن ہو کر احسن علی واپس

امریکا چلے گئے تھے۔ حالانکہ حسن علی نے انہیں بہت

روکا تھا لیکن سات آٹھ سال سے امریکا رہنے والے

احسن علی کو اب یہاں رہنا بہت مشکل لگتا تھا۔

”آتا رہوں گا بھائی صاحب! لیکن مستقل

رہنا مشکل ہے۔“

”جیسے پہلے آئے ہو تو سال بعد۔“

حسن علی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی زمین، اپنی

مٹی چھوڑ کر جائیں۔

”اب تو اس کے لیے آنا ہی بڑے گا۔“

لیکن واپس جانے کے صرف ڈیڑھ سال بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا اور دیر سے اطلاع ملنے کی وجہ سے چوہدری حسن علی ان کی ڈیڑھاڑی بھی پاکستان نہیں لاسکے تھے۔ دونوں بھائی آپس میں رابطے میں رہتے تھے۔ چوہدری حسن علی ہفتہ دس دن بعد نہیں ضرور فون کرتے تھے اور احسن علی خود بھی فون کرتے رہتے تھے۔ جب ایک ماہ رابطہ نہ ہو سکا تو انہوں نے گھبرا کر اپنے ایک جانے والے کو امریکا فون کیا تو اس نے چند دنوں بعد اطلاع دی کہ احسن علی کسی کام کے سلسلے میں نیویارک سے ٹیکساس گئے ہوئے تھے، وہاں ہی حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی بیوی نے جو امریکن نیشنل انڈین مسلمان بھی انہیں وہاں ہی دفن دیا تھا۔ صرف ایک ہفتے پہلے انہوں نے شادی کی تھی اور اس کے متعلق چوہدری حسن علی کو بتایا تھا کہ وہ شادی کرنے والے ہیں اور شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ وہ پاکستان آئیں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کی بیوی ان کا ایئر ٹکٹ بند کر کے کہیں چلی گئی تھیں۔ اگر احسن علی زندہ رہتے تو بیٹے سے ملنے سال دو سال بعد آتے رہتے تو شایان کو بھی علم ہو جاتا کہ اس کے حقیقی والد احسن علی ہے۔ لیکن ان کے بعد کسی نے اسے نہیں بتایا تھا حتیٰ کہ عالیہ جب اسے اسکول میں داخل کروانے گئیں تو انہوں نے ولدیت کے خانے میں احسن علی کے بجائے چوہدری حسن علی کا ہی نام لکھا تھا جس پر حسن علی بہت ناراض ہوئے تھے۔

”کیوں کیا، وہ ہمارا بیٹا نہیں ہے۔“ ان کی اپنی منطق تھی۔

”ہاں وہ ہمارا بیٹا ہے۔ عالیان کی طرح ہی عزیز ہے مجھے لیکن اس کا باپ احسن تھا اور اللہ کا حکم ہے کہ وہ اپنے لے پالکوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے پکارو۔“ انہوں نے حتیٰ سے تاکید کی تھی کہ وہ جا کر اپنی غلطی درست کر لیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اسے پتا چلا کہ وہ ہمارا بیٹا نہیں ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا ان کی سوچ تھی

لیکن اب ہاں اب وہ ان کے بیڈ روم میں شوقیت لینے گیا تھا لیکن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ وہ یوں ہی جا نماز پر بیٹھی تھیں ساکت اور خاموش اور اپنے دل کو تسلیاں دے رہی تھیں۔

”لگتا ہے اسے نہیں ملے..... اور اللہ کرے نہ ملیں۔ کیا خبر حسن علی نے کہیں اور رکھ دے ہوں۔“ لیکن اسے تو شوقیت مل گئے تھے۔ چند فائلیں دیکھنے کے بعد اسے پہلے عالیان کا شوقیت ملا۔

عالیان علی
والد کا نام..... چوہدری حسن علی
والدہ..... عالیہ خاتون
جائے پیدائش..... ہولی فیملی ہسپتال راولپنڈی
چند ایک کاغذات آگے پیچھے کرنے کے بعد اسے اپنا شوقیت مل گیا تھا۔ یہ انگلش میں تھا۔
شایان علی..... قادر نسیم چوہدری احسن علی
مدرسیم..... ماریانہ
اور ٹیکس آف برتھ..... نیویارک۔
”نہیں.....“ اس نے آنکھوں کو ملا۔ کئی بار پڑھا۔
قادر نسیم احسن علی، مدرسیم ماریانہ۔
”نہیں.....“ اس نے غلط نہیں پڑھا تھا۔ ایسا ہی لکھا تھا اس کے بار بار پڑھنے سے حقیقت بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ چوہدری حسن علی اور عالیہ خاتون کا بیٹا نہیں تھا اسے لگا تھا جسے وہ یک دم آسان کی بلندی سے زمین پر آگرا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ جو سولہ سال تک خود کو عالیان سے برتر سمجھتا آ رہا تھا تو برتر تو عالیان تھا۔ یہ گھر، ماں باپ سب کچھ عالیان کا تھا اور وہ کون تھا، اس کے ماں کہاں تھے۔ اس نے والدین کے ناموں پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کے ذہن میں تو جھکڑ چل رہے تھے، وہ یہاں کیوں ہے؟ اپنے والدین کے گھر کے بجائے یہاں.....

کیا وہ لاوارث تھا اور عالیان کے باپا اور ماں جان نے ترس کھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اسے اپنی محبتوں میں عالیان کا شریک بنایا تھا۔ وہ اس سے

عالیان سے کتنی زیادہ محبت کرتے تھے۔ وہ بابا ہوں
عالیان جان۔ عالیان کی بات وہ بعض اوقات نال
کے اس لڑکے پر درج تھا۔ اس کی آنکھیں
ال دی تھیں اور اندر جیسے دھول اٹھتی تھی۔ اپنا آپ
اسے کچھ یاد تھا بہت کتر لگ رہا تھا۔ بابا اور ماں
عالیان نے اب تک اسے بتایا کیوں نہیں کہ وہ ان کا
بچہ نہیں ہے اور اگر نہیں بتایا تھا تو اب..... اب
کون جانتا ہے یہ..... کاش اس پر ہمیشہ پردہ پڑا
رہتا۔ کچھ بھی کیوں احساس نہیں ہوا کہ میں کوئی
لاوارث ہوں۔ اس پر بابا اور ماں جان نے ترس کھا
کر نہ صرف اپنے گھر میں رکھا ہے بلکہ اپنی سگی اولاد
کی طرف بھی.....

عالیہ خاتون نے بہ مشکل نماز ادا کی اور پھر گھبرا کر اللہ کڑی ہوئیں۔ وہ ابھی تک ان کے بیڈ روم سے باہر نہیں آیا تھا تو کیا..... ذرا سی دیر کو ان کا دل
لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئیں اپنے
گھر میں آگئے۔ وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھا تھا
اس کی کوئی براؤن فائل پڑی تھی اور
بالکل اسی کاغذ تھا۔ اس کے ہونٹ جھپٹے ہوئے
تھے اور آنکھوں سے کرب جھانکتا تھا یقیناً وہ جان
لے چکی تھی۔

”کیا ہوا مہری جان! آپ ایسے کیوں بیٹھے
وہ آپ تو عادل کی طرف جارہے تھے نا۔“ اس نے
اپنی لڑکیوں سے عالیہ خاتون کی طرف دیکھا تو بے
حوالہ ہو کر انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
”کیا اشیان آپ تھک تو ہوتا۔“

”میں کون ہوں ابلی جان؟“ اس کے لبوں
پر سوال ہوئی سی آواز لگی تھی۔
”تو وہ جان چکا تھا، اس نے دیکھ لیا تھا۔
”آپ شایان ہو، میرے بیٹے! میرے جگر

”اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ میں
آپ لاہور میں ہوں۔ میرے والدین کہاں ہیں؟

میں یہاں کیوں ہوں؟“ زخمی نظریں، ٹوٹا بکھرا الجھ۔
عالیہ خاتون نے بے اختیار اس کے قریب بیٹھتے
ہوئے اس کا سر سینے سے لگایا۔

”آپ یہاں اس لیے ہو کہ آپ کو یہاں ہی
ہونا تھا شایان! آپ کوئی غیر نہیں ہو، ہمارے اپنے
ہو۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ احسن آپ کے بابا کے
سگے بھائی تھے۔ احسن بھائی کے یہاں سے واپس
جانے کے چند ماہ بعد ماریانہ آپ کی امی کا دماغ کی
رگ پھٹ جانے سے انتقال ہو گیا تھا۔“ وہ ہولے
ہولے اسے بتا رہی تھیں۔

”میں نے آپ کو عالیان سے زیادہ چاہا۔
ریان کے حصے کی محبت بھی آپ کو دی۔ آپ میرے
شایان بھی تھے اور ریان بھی۔“

”آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں ماں جان!“
اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”آپ کے بابا جان کا خیال تھا کہ آپ ذرا
بڑے ہو جائیں، سمجھ دار ہو جائیں تو..... لیکن پتا نہیں
کیوں مجھے لگتا تھا کہ اگر آپ کو پتا چل گیا کہ ہم آپ
کے حقیقی والدین نہیں ہیں تو آپ کے اندر جھجک پیدا
ہو جائے گی۔ آپ اس طرح مان اور لاڈ سے بات
نہیں منواتے گے۔ آپ کے اندر شاید وہ اعتماد پیدا
نہیں ہو سکے گا جو اب ہے۔ ہم جانتے تھے کہ جب
آپ کا شناختی کارڈ بنے گا تو ولدیت کے خانے میں
احسن بھائی کا ہی نام لکھا جائے گا لیکن مجھے یہ خیال
کبھی نہیں آیا تھا کہ اس سے پہلے اس کی ضرورت
پڑ جائے گی ورنہ آپ کے بابا تو کب سے کہہ رہے
تھے کہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔“
انہوں نے تھو بھر ٹھہر کر اس کی طرف دیکھا وہ یوں ہی
سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”بے شک میں نے آپ کو جنم نہیں دیا لیکن
آپ کی ماں تو میں ہی ہوں نا، آپ دو ماہ کے تھے
شایان! صرف دو ماہ کے۔ میں نے آپ کو دودھ
پلایا، سنبھالا، راتوں کو آپ کے لیے جاگی۔ عالی بھی
کوئی بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن آپ اس سے چھوٹے

اپنے لاشعور میں ہوتی کشش سے بے خبر۔ ”ابھی الجھا الجھا سا کچھ دیر لائبریری میں بیٹھا کسی کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا اور پھر عالیاں کو بتا کر گھر آ گیا تھا۔

اور پھر صرف چند دنوں بعد ہی سب نے حیرت سے دیکھا کہ وہ علیزہ احمد جو عالیاں کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی اور اپنے گروپ میں بہت بے باکی سے کہتی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی عالیاں کی محبت کا شکار ہو گئی ہے۔ اب شایان کے ساتھ گھومنے لگی تھی اور اسی بے باکی سے اپنے گروپ کی لڑکیوں میں وہ شایان علی کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی۔

”عالیاں اور شایان میں بہت فرق ہے یا! اور ہمیشہ سے میرا سبیل شایان علی جیسا شخص ہی رہا ہے۔ میں وقتی طور پر عالیاں کی وجاہت اور اس کی شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ یہ محبت ہے۔“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ عالیاں علی کو چھوڑ کر کیسے شایان علی کی اسیر ہوئی تھی۔ کوئی بھی نہیں سوائے شایان کے کہ اس نے کیسے علیزہ احمد کو اپنی طرف مائل کیا تھا۔ اب یہ محض اتفاق تھا یا اس کی قسمت کہ عالیاں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے فلو ہو گیا تھا اور علیزہ احمد اس سے عالیاں کا پوچھنے آئی تھی کہ وہ یونیورسٹی کیوں نہیں آیا۔ یوں عالیاں کے حوالے سے ان کے درمیان بات چیت شروع ہوئی تھی۔ عالیاں صرف دو دن یونیورسٹی نہیں آتا تھا۔ ان دو دنوں میں ان میں خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی، اس کا بولڈ انداز، اس کی شوخی و برہنہ گئی اعتماد ہمیشہ ہی اسے عالیاں سے ممتاز کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

علیزہ احمد کو بتایا نہیں چلا تھا کہ وہ کب عالیاں اور شایان کا موازنہ کرنے لگی تھی اور کب اسے لگا تھا کہ اس نے انتخاب میں جلدی کی تھی۔ اس کا آئیڈیل تو شایان تھا۔ عالیاں کم گو تھا، خاموش طبع تھا۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں کئی بار اپنی پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھی۔ وہ صرف مدہم سا مسکراتا تھا تو وہ اس کی بات سمجھتا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔ لیکن شایان کے شوخ معنی خیز جملے یاد

کر کے اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں اور وہ بات جو عالیاں کی سنجیدہ فطرت کی وجہ سے وہ اس سے نہ کہہ سکتی تھی وہ اس نے عالیاں سے کہہ دی۔

”آئی ایم فل ان لوڈ پوٹنٹی!“

اور اس روز شایان کو لگا تھا کہ وہ نامعلوم سی بے چینی اور اضطراب جو اسے کئی دنوں سے گھیرے ہوئے تھے، یک دم جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اس نے عالیاں کو ہرا دیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ فارغ ہونے کا وہی ٹھہرے گا سو وہ علیزہ احمد کا دل جیت چکا تھا جس کے متعلق خاور ربانی نے کہا تھا کہ عالیاں علی نے اس کا دل جیت لیا ہے اس روز بڑے دنوں بعد وہ علیزہ کو نظر انداز کیے سارا وقت عالیاں کے ساتھ رہا تھا۔ ایک بار پھر سے وہ اور عالیاں ساتھ نظر آنے لگے تھے اور علیزہ احمد شایان علی کو تلاش ہی رہ جاتی۔

”کیا بات ہے شانی! کیا علیزہ سے ناراضی ہو گئی ہے تمہاری۔“ عالیاں کے لبوں پر ساداسی مسکراہٹ تھی۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔ شایان علی نے اسے بغور دیکھا۔

”وہ خواہ مخواہ ہی فری ہونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ بقول اس کے اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“

”تو کیا نہیں ہو سکتی محبت۔۔۔۔۔ میرا بھائی اتنا

شان دار ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس کی محبت میں مبتلا

ہو سکتی ہے۔“ عالیاں کا لہجہ سادا سا تھا اور اس نے

بہت محبت سے شایان کو دیکھا۔

”لیکن میں تو صرف تمہاری وجہ سے اس سے

اچھی طرح ملتا تھا میں نے سنا تھا کہ تم اس سے محبت

کرتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔“ عالیاں حیران ہو

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے

ذیل اڑتے ہیں۔“ وہ یہاں جتنی جتنی کچھ دیکھتا

تھا۔ ”میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں

صورت تھی لیکن اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی تھی کہ وہ اس کے سامنے دل ہار جاتا۔

☆☆☆

اس روز وہ عالیاں کے ساتھ گھر جا رہا تھا کہ علیزہ نے اچانک ہی آکر اسے روک لیا۔

”پلیز شانی! ایک منٹ میری بات سن لو۔“

اس نے عالیاں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ لہجہ

بھر کے لیے ایک کینیسی خوشی نے اس کے دل میں

سر اٹھایا اور وہ اس کی بات سننے کے لیے رک گیا۔

عالیاں اسے پارکنگ میں انتظار کرنے کا کہہ کر چلا

گیا تھا۔ علیزہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کسی اچھی

جگہ پر بیچ کرے اور پرسکون ماحول میں وہ کچھ دیر

سکون سے بات کر سکیں۔

وہ اسے اپنے ڈیڑی کے متعلق بھی بتا رہی تھی

کہ وہ چند دنوں تک اسلام آباد آرہے ہیں اور وہ

چاہتی ہے اسے اپنے ڈیڑی سے ملوئے۔ وہ بہ مشکل

اس سے جان چھڑا کر پارکنگ کی طرف بڑھا ہی تھا

کہ ایک بعد دیگرے دو گولیاں چلنے کی آواز آئی اور

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ فائر کہاں ہوئے ہیں کہ

ایک کلاس فیلو دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔

”شایان۔۔۔۔۔ شایان۔۔۔۔۔ عالیاں کو گولی لگ

گئی ہے۔“

اور اسے لگا تھا جیسے اس کا دل دو ٹکڑے ہو گیا ہو۔

وہ بھاگتا ہوا پارکنگ تک آیا تھا اور لڑکوں کا دائرہ توڑ کر

عالیاں کے پاس بیٹھنے ہوئے اس کا سر گود میں رکھا۔

”عالیاں۔۔۔۔۔ عالی۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔“

وہ رورہا تھا۔ اسے پکار رہا تھا پاگوں کی طرح

بلا رہا تھا جب علیزہ نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ

رکھا تو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اس سے اسے

علیزہ سے بے حد نفرت محسوس ہوئی تھی اگر یہ وہاں

اسے روک نہ لیتی تو اب تک شاید وہ پارکنگ سے نکل

کر روڈ پر پہنچ چکے ہوتے۔ اسی کی وجہ سے ہوا تھا،

شاید وہ غصے میں علیزہ کو کچھ کہہ بھی دیتا کہ ایبولینس کا

سائرن سنائی دیا تھا۔ کسی نے ایبولینس کے لیے کال

کردی تھی۔ عالیان کو ہاسٹل پہنچا دیا گیا تھا۔
 ”گوئی بالکل گردے کے پاس گئی ہے، شاید گردے کو
 بھی نقصان پہنچا ہو۔ خون بھی بہت نکل گیا ہے۔“
 پتا نہیں کس نے کہا تھا، کسی نرس نے یا کسی
 ساتھی اسٹوڈنٹ نے۔
 ”پلیز میرا گردہ لے لیں، میرے جسم سے
 سارا خون نکال لیں لیکن میرے بھائی کو بچالیں۔“
 اس نے آپریشن تھیٹر سے باہر نکلتے ہوئے
 ڈاکٹر کی منت کی۔

”ریلیکس ایک مین! گوئی نکال دی گئی ہے اور خون
 کی وہی ایک بوتل کافی ہے جو آپ دے چکے ہیں۔“
 وہ پھر جتنے دن ہاسٹل میں رہا شایان اس کے
 پاس ہی رہا۔ عالیہ اور سن چوہدری کو وہ زبردستی گھر
 بھیج دیتا تھا اور عالیان اپنے لیے اس کی اتنی محبتیں
 دیکھ کر مومن ہو جاتا۔
 ”تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہوگا شانی! تم
 یونیورسٹی چلے جایا کرو۔ دن کو اماں جان آ جاتی ہیں،
 بابا بھی ہوتے ہیں اور شاہو چاچا تو ہر وقت باہر ہی
 ہوتے ہیں۔“

”پڑھائی تم سے زیادہ اہم نہیں ہے عالی!“
 اور عالیان کی آنکھوں میں کی پھیل گئی تھی۔
 ”میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم میرے بھائی ہو۔“
 ”یہ ہی بات میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا
 ہوں، اگر میں یہاں ہوتا تمہاری جگہ تو کیا تم مجھے
 ہاسٹل چھوڑ کر یونیورسٹی جاسکتے تھے۔“ عالیان نے
 نفی میں سر ہلایا۔

”تو..... اگر میں تمہارے لیے کچھ کروں گا تو
 تمہارا حق ہے مجھ پر اور تم میرے لیے کچھ کرو گے تو
 میرا حق ہے تم پر اور اس کے لیے میں بھی تمہارا
 شکریہ ادا نہیں کروں گا۔“
 اور عالیان مسکرا دیا تھا۔

”اور میں نے کون سا تمہارا شکر یہ ادا کیا تھا۔
 میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ تمہاری پڑھائی کا حرج نہ
 ہو، آخر تمہیں مجھ سے زیادہ نمبر لینے ہوتے ہیں۔“

”وہ تو میں اب بھی لے لوں گا۔ تم مجھ سے کبھی
 نہیں جیت سکتے عالی!“ اور دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔
 ”اور میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ اگر
 خدا نا خواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی خود کو ختم کر لوں
 گا اور مرنے سے پہلے اماں جان کو وصیت کر جاؤں گا
 کہ پہلے میرا جنازہ اٹھایا جائے پھر تمہارا۔ یعنی سفر
 آخرت میں بھی تم سے چند قدم آگے۔“
 وہ ہولے سے ہنسا لیکن عالیان کا رنگ زرد
 پڑ گیا تھا۔

”یکومت۔“

”بک نہیں رہا، کچ کہہ رہا ہوں۔ اگر مرنا چاہتا
 اپنے اختیار میں ہو تو موت میں بھی تم سے سبقت
 لے جاؤں۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔
 ”بھی کبھی مجھے تمہاری ان شدتوں سے ڈر
 لگنے لگتا ہے۔“ عالیان سنجیدہ تھا۔

”میں کبھی بھی تم سے جیتنا نہیں چاہتا شانی!
 مجھے تمہاری جیت سے ہمیشہ ایسی ہی خوشی ہوتی ہے
 جیسے یہ میری اپنی جیت ہو۔ تم فرسٹ آتے ہو تو مجھے
 لگتا ہے میں فرسٹ آیا ہوں لیکن اگر کبھی اتفاق سے
 کچھ ایسا ہو گیا کہ کسی مقام پر میں تم سے آگے نکل گیا
 تو..... تم نہ جیت سکتے تو مجھے اس لمحے سے بہت خوف
 آتا ہے، پلیز تم اپنے اس کریر کو کم کرو۔“
 ”ایسا بھی ہو نہیں سکتا عالی!“

وہ ہمیشہ ہی پر یقین رہتا تھا۔ اسے اپنی ذات
 پر اعتماد تھا کہ وہ کبھی عالیان سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔
 ”مجھے ہمیشہ فتح یاب ہونا ہے اور فتح میرے
 مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ سو تم کسی ایسے نادیدہ لمحے
 سے پریشان مت ہو جس نے بھی ہماری زندگیوں
 میں نہیں آتا۔“

”شایان ازدی گریٹ۔“

مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور دیر
 تک رہی۔ عالیان نے دل ہی دل میں ہمیشہ اس کی
 کامیابیوں کی اور اس کا یقین نہ ٹوٹنے کی دعا کی۔
 لیکن کبھی بھی آدمی کا یقین اس بری طرح ٹوٹتا

نہیں کہ وہ خود کو اس کے ساتھ بھی
 اپنا حصہ لے لیتا۔ اس کا یقین ٹوٹ گیا تھا۔ محبت کی بازی
 میں عالیان کا قرار پایا تھا اور وہ شکست خوردہ۔
 اس کا دل ان کی بازی ہار گیا تھا اور خالی ہاتھ تھا
 اس کا دل خالی تھا، باری ہوئی بازی جیتنے کا ہنر
 نہ تھا۔ ہارنا چاہتا ہر طریقے سے بلا خرچ کا
 ایک آدمی کے سر پہ جاتا تھا۔

”نہیں۔“

عالیان کے چھوٹے ماموں کی
 ان کا بچپن اکٹھا کھیلتے کودتے گزرا
 تھا۔ ان کے سال ہی عمر میں مظہر چوہدری جو شارچہ
 میں اکٹھے تھے اپنی بیٹی کو ساتھ لے گئے تھے۔ جب
 ان کے کمرے میں رہی۔ شایان کی خواہش ہوئی
 کہ وہ صرف اس کے ساتھ کھیلے اسی کی ساتھی
 ہو جائے۔ وہ ہمیشہ عالیان کی ساتھی بننا چاہتی
 تھی۔ ان کا عالیان شایان کا خراب موڈ دیکھ کر اسے
 ان کا ساتھی بننے پر رضامند کر لیتا تھا۔ جب تک
 وہ ان کے ساتھ تھا۔ ان کے سال کا دل میں ایک ماہ کی چٹخیاں
 لگتی تھیں۔ لیکن جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ایک سال شاہو چوہدری کے بعد کینیڈا شفٹ ہو گئے
 اور اب وہ سال بعد ملن واپس آئے تھے۔

شایان اور عالیان بھی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے
 بعد ان دنوں گاؤں کی زندگی انجوائے کر رہے تھے۔
 سب معمول ایم ایس سی میں بھی سات نمبروں سے
 عالیان کی پہلی پوزیشن رہی تھی اور عالیان کی
 دوسری۔ دونوں نے میٹری میں ایم ایس سی کیا تھا
 اور ان کا نواب آباد انجمن میں جاب کرنا تھا۔
 ان کے والدین ان کے آئیڈیل تھے، انہیں ان کے
 ساتھ والے والی زیادتی کا بہت دکھ تھا لیکن وہ
 دوسرے پاکستانیوں کی طرح کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

عالیان نے سنا تھا کہ ایک روز ڈاکٹر عبدالقدیر کی
 طرح وہ بھی کوئی کارنامہ سر انجام دیں گے۔ جاب
 ان کا مسئلہ کس تھا سو پورے ایک سال تک انہوں
 نے ایک ایک دن میں جابز کھانے کا انتظار کیا تھا اور

اب جب کچھ آسامیوں کی ضرورت تھی تو دونوں
 اپنا پی کیا ہوا تھا اور انڈو کو کال کے منتظر تھے ایسے
 چوہدری مظہر کی آمد نے زندگی میں رنگ بھر دیے تھے
 زمین پر پہلی نظر پڑتے ہی شایان اپنا دل
 بٹھا تھا۔ وہ غریبی کی زمین بے تماشاً خوب صورت
 ہوئی تھی۔ سیاہ اسکارف کے بالے میں گھرے اس
 چہرے کی طرف اس کی نظر اٹھی تو پھر واپس آنا بھولا
 گئی تھی۔ اسے زمین مظہر سے محبت ہوئی تھی.....
 نظری کی محبت۔ وہ رات کو بستر پر لیٹا تو آنکھوں کے
 سامنے زمین کا سرایا آ جاتا۔ دلکش، ہولے ہوئے
 باتیں کرتی نرمی سے مسکراتی، نگاہیں جھکائے اس کے
 اور عالیان کے سوالوں کے جاب دیتی وہ اسے کس کے
 اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی تھی۔
 ”لگتا نہیں زمین کہ آپ اتنے سال کینیڈا میں
 رہی ہیں۔“ وہ یوں ہی اس سے باتیں کرنے کے
 بہانے ڈھونڈتا تھا۔

”کیوں، کیا کینیڈا سے آنے والوں کے ماتھے پر
 کوئی چھاپ لگی ہوتی ہے؟“ زمین کے لبوں پر مدھم مدھم
 مسکراہٹ نمودار ہوئی تو وہ بھی قدرے شرمناک ہوا تھا۔
 ”نہیں لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ
 کینیڈا سے نہیں چک بافر شاہ سے آ رہی ہیں۔“ اس
 نے اس کے اسکارف کی طرف اشارہ کیا۔

”اس لیے کہ میرے والدین نے مجھے اپنی
 روایات، ثقافت اور مذہب کی پہچان اچھی طرح سے
 کروادی تھی اور میں یہ بھی نہیں بھولی کہ میرا مذہب
 اور میری روایات کیا ہیں لیکن لگتا ہے کہ آپ مجھے
 پور پی رنگ میں رنگا دیکھنے کے متنبی تھے۔“ اس کی
 نظریں ذرا کی ذرا اس کی طرف اٹھی تھیں۔
 ”ہرگز نہیں۔“ شایان نے فوراً کہا۔

”یقین کریں زمین! آپ کے اس روپ نے
 تو اسیر کر لیا مجھے۔ بخدا آپ تو اسکارف میں کسی حور
 کی طرح لگ رہی ہیں۔“

زمین ذرا سی چوکی پھر عالیان کے آنے پر وہ
 اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی اور گفتگو یورپ میں رہنے

والمے مسلمانوں اور اسلام کے متعلق ہونے لگی تھی۔ وہ ایک ہفتہ حویلی میں رہ کر اپنے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ جسے عالیہ خاتون نے ان کے آنے سے پہلے نیا رنگ دروغن کروا کے صاف کروا دیا تھا۔

اس ایک ہفتے میں کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ زمین کو بتائے کہ وہ اس کی محبت میں چلا ہو گیا ہے لیکن وہ علیرہ احمد یا کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس حویلی کی عزت تھی، وہ کیسے منہ پھاڑ کر اس سے یہ سب کچھ کہہ سکتا تھا۔ اسے بس اماں جان سے یات کرنا تھی، انہیں بتانا تھا کہ زندگی بھر کی رفاقت کے لیے اسے زمین منظر کا ساتھ چاہیے اور بس۔ لیکن اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں لودہ بننے لگی تھیں اور اس نے سنا تھا عورت مرد کی نظر پچھانتی ہے تو کیا زمین نے اس کی جذبے لٹائی آنکھوں سے کچھ اخذ نہ کیا ہوگا۔ وہ سوچتا تھا، ضرور اسے کچھ نہ کچھ احساس تو ہوا ہوگا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر معدوم ہو جاتی، یہ لڑکیاں بڑی گھٹی ہوتی ہیں۔ بھی خود سے دل کی بات نہیں کہیں۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتا تو ایک پر غور سی چمک اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتی۔

”ہاں شایان علی ایسا ہے کہ کوئی بھی لڑکی جس کی طرف وہ دیکھے اپنا دل اس کے آگے ہار دے۔“ اسے اپنی شخصیت، اپنی برکتی پر بے طرح ناز تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی عالیان کے متعلق نہیں سوچا تھا کہ آخر وہ بھی تو اس گھر میں ہے۔ خوبرو، وجہہ اور اس کا ہلکا سا پوائنٹ زمین منظر کا رگڑا پھوپھی زاد ہونا لیکن اسے تو خود پر بے تحاشا مان اور یقین تھا کہ وہ جب بھی زمین کے آگے دامن دراز کرے گا، رد نہیں کیا جائے گا۔ لیکن زمین سے کچھ کہنے سے پہلے اسے اماں جان سے بات کرنا تھی اور ابھی وہ اماں جان سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی انٹرویو کال آ گئی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ عالیان کی کال نہیں آئی تھی۔ حالانکہ میرٹ تو تقریباً برابر ہی تھا دونوں کا۔ مچ مندی کے احساس سے دل ہی دل میں مغرور ہوتے ہوئے وہ عالیان

کے روم میں آیا تھا۔

”برادر سنو! میرا انٹرویو لیٹر آ گیا ہے جب کہ تمہارا نہیں آیا۔ پرسوں میرا انٹرویو ہے۔ میں کل صبح عادل کی طرف چلا جاؤں گا۔ اس کے چاچا اٹاک انرجی میں ہیں نا، انٹرویو کے سلسلے میں ان سے پوچھوں گا۔ عادل نے بات کر لی ہے ان سے، تم بھی چلو نا ساتھ دونوں تیاری کر لیں گے۔“

”میں جا کر کیا کروں گایار! جب میرا انٹرویو لیٹر ہی نہیں آیا۔“

”تمہیں افسوس تو ہو رہا ہوگا عالی!“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”نہیں تو، بھلا افسوس کیوں ہوتا۔ اچھی بات ہے نا تمہاری خواہش ہوئی ہے نا مجھ سے آگے رہنے کی سو تمہاری خواہش پوری ہوگئی۔ میرا جب آنا ہوا آ جائے گا، نہ آنا ہوگا تو نہیں اور وراثی کر لیں گے۔“

”وہ بے حد مطمئن سا اس کی بات کا جواب دے کر پھر سے اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔“

”تم بھی عجیب ہو عالی! میں تمہاری جگہ ہوتا تو جل کر کباب ہو جاتا کہ میرا لیٹر کیوں نہیں آیا جب کہ میرٹ تو دونوں کا ہی بنتا ہے۔“

”تم چاہتے ہو شانی کہ میں تم سے تمہاری کامیابیوں سے جلوں؟“ عالیان ہنسا تھا۔

”لیکن بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے شایان کہ کوئی بھائی اپنے بھائی سے جلے اور تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی میری کامیابی سے ایسے ہی خوش ہوتے جیسے میں۔ ایک کریز ہے تمہیں آگے رہنے کا ورنہ اگر اس کے برعکس بھی ہوتا تو تم خوش ہوتے۔“

اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ لہجہ بھر کے لیے شایان خاموش ہو گیا تھا، کیا واقعی ایسا ہوتا اور کیا وہ عالیان کی خوشیوں اور کامیابیوں پر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے وہ ہوتا ہے۔ وہ عالیان سے بہت محبت کرتا تھا اس کے لیے شاید جان بھی دے سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ عالیان اس سے جیت

جائے یا وہ چیز جو اسے بھی پسند ہو عالیان لے لے۔ یہ وہ جگہ تھی جسے صرف وہ جانتا تھا۔

وہ عالیان کے کمرے سے نکلا تو زمین کی طرف چلا آیا اور جب سے وہ لوگ اپنے گھر منتقل ہوئے تھے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دو تین دفعہ ان کے گھر کی نہ کی بھانے سے اکیلا ہی چلا گیا تھا۔ منظر ماموں اور شمیمہ ممانی بہت محبت سے ملتے اور زمین بھی خوش اخلاقی سے بات کر رہی تھی اگرچہ دس پندرہ منٹ کے لیے ہی سب کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی پھر اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ آج بھی جب زمین کے گھر آیا تو اس کے پاس بھانہ موجود تھا۔

”ماموں، ماما جی! میرا انٹرویو لیٹر آ گیا ہے۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا، کل صبح میں چلا جاؤں گا۔ پرسوں میرا انٹرویو ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”ان شاء اللہ، اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔“

منظر چوہدری نے کہا۔

”اور دعا بھی ضرور کریں گے تمہارے لیے۔“ ممانی نے بھی دعا دی تھی۔ کچھ دیر بعد زمین کے کمرے کے ساتھ چائے لے کر آئی تو اس نے زمین سے بھی دعا کی درخواست کی اور ساتھ ہی بتایا بھی کہ اسی عالی کا انٹرویو لیٹر نہیں آیا اس کے لیے بھی دعا لیجیے گا۔ زمین کے لبوں پر ایک معنی خیزی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

سفید لباس میں زمین آج بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ اس کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھتی اور پھر جھٹکا جھٹکا جاتی تھیں۔ زمین کی پیشانی پر ہلکی سی ناگواری کی لکیر نمودار ہوئی تھی اس کو شاید شایان کا دل دیکھنا برا لگ رہا تھا اس لیے وہ اپنا چائے کا کپ اٹھا کر مندرت کر رہی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کا یہ گریز اچھا لگتا تھا۔

”کب تک..... کب تک..... یہ گریز.....“ اس نے دل ہی دل میں کہا اور کچھ دیر بیٹھ کر ایک بار دعا کے لیے کہتا ہوا گھر واپس آ گیا۔

☆☆☆

اس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا اور اس نے سوچا تھا وہ واپس جا کر اماں جان سے زمین کے لیے بات کرے گا۔ اس نے ایک دن زمین کو نہیں دیکھا تھا تو اسے لگتا تھا جیسے کہیں کچھ ہو گیا ہو۔ اسے پہلی فرصت میں اماں جان سے بات کر لی چاہیے، کہیں وہ دیر نہ کر دے۔ ماما بھی تو کہہ رہی تھیں نا کہ جیسے ہی زمین کی گریجویشن مکمل ہوگی، ہم پاکستان آ گئے کہ لڑکیوں کے لیے یہی بہترین عمر ہے شادی کی۔

زمین کی شادی کے بعد شاید منظر صاحب تو واپس جا سکیں لیکن میرا ارادہ نہیں ہے۔ اپنے ملک اور اپنی زمین کی بات ہی اور ہوتی ہے۔

کیا انہوں نے زمین کی کہیں شادی طے کر دی ہے، اس کے دل میں یک دم وہم پیدا ہوا تھا۔

لیکن نہیں، ایسی کوئی بات ہوئی تو کوئی تو ذکر کرتا پھر ماما نے بھی تو یوں ہی سرسری سا ذکر کیا تھا جیسے مامیں کرتی ہیں۔

اس نے اپنے دل کو تسلی دی لیکن دل کو دھڑکا سا لگ رہا تھا اور پھر انٹرویو کے بعد وہ عادل کے اصرار کے باوجود نہیں رکا تھا۔ حالانکہ پہلے اس کا ارادہ شام کو واپس کا تھا لیکن اب وہ جلد از جلد جا کر اماں جان سے بات کرنا چاہتا تھا۔

وہ سارے راستے سوچتا رہا، پلان بناتا رہا کہ ایسے بات کروں گا، یوں کہوں گا کہ بس اب میں برسر روزگار ہو گیا ہوں۔ جاب تو ظاہر ہے مل ہی جائے گی تو جلدی سے میرے سر پر سہا باندھنے کی تیاری کریں..... نہیں یوں نہیں..... یوں کہوں گا۔ وہ خود ہی جملے سوچتا رہا اور رد کرتا رہا۔ کچھ بھی نہیں صاف صاف کہہ دوں گا۔ اماں جان! مجھے زمین اچھی لگتی ہے اور یہ کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، بس یہ ٹھیک ہے۔ ہاں ایسے ہی ٹھیک ہے۔

حویلی پہنچتے ہی وہ سیدھا عالیہ خاتون کے کمرے میں گیا تھا، وہ زیورات کا صندوق کھولے بیٹھی ایک ایک زیور نکال کر دیکھ رہی تھیں۔

”ارے آپ آ گئے شایان! کیا ہوا انٹرویو۔“

”بہت اچھا۔ ایک دو روز میں اپائنٹمنٹ لیٹرل جائے گا۔“ وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”اور آپ یہ دکان کیوں سجائے بیٹھی ہیں؟“
 اس نے ایک بریلیٹ اٹھا کر دیکھا۔
 ”کیوں بھی، اب تم دونوں کی شادیاں نہیں کرنی ہیں ہم نے۔“ عالیہ خاتون کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی۔ یوں تو تم دونوں کی دہلیوں کے لیے سارا زور دیا ہی ہے گا لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ کچھ پرانا زور بھی نکال لوں، نرمین کو بھی دکھا لوں گی۔“
 ”نرمین!“

اس کا دل جیسے سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہوا۔ اب اسے تمہید نہیں یا ندھی پڑے گی، اماں جان نے خود ہی بات چیت کر دی تھی۔
 ”کیا آپ نے ہمارے لیے لڑکیاں دیکھ لیں؟“ اس نے بریلیٹ نیچے رکھا۔
 ”عالیان اور نرمین کی بات تو بچپن سے طے ہے۔ میں نے نرمین کے پیدا ہوتے ہی اسے عالیان کے لیے مانگ لیا تھا۔ ہاں آپ کے لیے دو تین لڑکیاں ہیں نظر میں، آپ کے بابا کہہ رہے تھے کہ آپ آج تو آپ کی رائے لے لیں تو دونوں بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دیں۔ مجھے تو عالیہ آپا کی آمنہ بہت پسند ہے۔“

وہ کہہ رہی تھی اور شایان کو لگ رہا تھا کہ اس کے سر پر عالیہ خاتون نے کوئی ہم بلاسٹ کر دیا ہو اور اس ہم کی زد میں آکر اس کا پورا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہو۔

”ان دنوں آمنہ گاؤں آئی ہوئی ہے، اپنی دادی کے پاس۔ آپ ان کو دیکھ لیں، بات چیت کر لیں۔ کیا روز میں آمنہ کو گھر بلا لوں گی، یوں تو وہ کل بھی آئی تھی مجھ سے ملنے پر آپ نہیں تھے۔ بہت پیاری بچی ہے لیکن آپ کے بابا کہہ رہے تھے کہ آپ کی پسند اور مرضی کے بغیر کسی سے بات نہ کروں۔“

”میری پسند اور مرضی؟“

اس کی سوالیہ نظریں عالیہ خاتون کی طرف اٹھیں، جن میں عجیب سرد مہر سی بے گانگی تھی۔
 ”ہاں ظاہر ہے زندگی آپ نے گزارنی ہے اور آپ کی پسند اور مرضی ضروری ہے۔“
 وہ کچھ زیورات الگ کرنے کے بعد باقی واپس صندوقچی میں رکھ رہی تھیں۔

”تو میری پسند نرمین ہے اماں جان! مجھے نرمین سے شادی کرنی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا جھومر عالیہ خاتون کے ہاتھوں سے گر پڑا تھا، وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے شایان! نرمین تو بچپن سے ہی عالیان سے منسوب ہے اور مظہر بھائی اس کی شادی کے لیے ہی آئے ہیں۔“

”آپ نے میری پسند پوچھی تھی، میں نے بتا دی۔ اب یہ آپ جانیں کہ کیسے ہو سکتا ہے لیکن شادی مجھے نرمین سے کرنا ہے اور کسی سے نہیں۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکائیں تھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔“ عالیہ نے سر پکڑ لیا۔
 یہ عالیان کا کوئی کھلونا یا کپڑا پسند کرنے والی بات تو نہ تھی کہ بچپن کی طرح وہ اس کی ضد پر اسے دے دیتیں۔ نہیں یہ ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے نرمین کے علاوہ۔ جو لڑکی بھی آپ کو پسند ہو بھلے وہ غیروں میں سے ہی ہو میں آپ کے بابا کو مٹا لوں گی۔“

”لیکن میں نرمین سے محبت کرنے لگا ہوں۔ پلیز آپ بابا کو مٹا لیں۔۔۔۔۔ ماموں جان سے بات کریں۔ مجھ میں کیا کمی ہے آخر میں عالیان سے کسی بھی لحاظ سے۔۔۔۔۔“

”بات کمی کی نہیں ہے شایان۔“ عالیہ خاتون نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ کیسی صورت ممکن نہیں ہے۔ نرمین عالیان کی منگ ہے۔ مظہر بھائی بھی

نہیں مانیں گے۔“

”آپ چاہیں تو ممکن ہو سکتا ہے اماں جان۔“
 ”بے وقوفوں کی سی باتیں مت کرو شایان۔“
 عالیہ خاتون از حد پریشان تھیں۔

”یہ بے وقوف والی بات نہیں یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“ تب گھبرا کر انہوں نے حسن علی سے بات کی اور چوہدری حسن علی کو پتا چلا تو وہ عالیہ خاتون پر ناراض ہو گئے۔

”ساری غلطی آپ کی ہے عالیہ! بچپن میں جب پہلی بار اس نے عالیان کے کھلونے پر ہاتھ رکھا تھا تو آپ کو سمجھا دینا چاہیے تھا لیکن آپ عالیان کا کھلونا اٹھا کر اسے دے دیتیں لیکن نرمین کو کھلونا یا چیز نہیں ہے۔ میں آپ کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ مظہر سے بات نہیں کریں گی اور ان سے بات کر کے نزدیک ترین کی کوئی تاریخ لے لیں شادی کی اور عالیان کے آنے سے پہلے اپنے صاحبزادے کو سمجھائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا یہ سب جان کر ہرٹ ہو۔ آپ ہمیشہ عالیان کی حق تلفی کرتی رہی ہیں لیکن اب نہیں عالیہ! اب میں اپنے بیٹے کی حق تلفی نہیں ہونے دوں گا۔“

”وہ بھی ہمارا بیٹا ہے حسن صاحب!“
 ”ہاں ہے مجھے اس سے کب انکار ہے۔ مجھے بھی وہ اتنا ہی پیارا ہے جتنا عالیان لیکن میں اس کی ناجائز اور بے جا ضد نہیں مان سکتا۔“

عالیان کو انہوں نے اپنے کسی کام سے جان بوجھ کر سرگودھا بھیج دیا تھا۔ نہیں چاہتے تھے کہ اسے اس سارے معاملے کی خبر ہو اور وہ شایان کے لیے کوئی قربانی دے۔

”دو دن بعد وہ واپس آ رہا ہے اس کے آنے سے پہلے پہلے یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے، آئندہ اس موضوع پر پرکونی بات نہ ہو۔“

چوہدری حسن علی اپنا فیصلہ سن کر جا چکے تھے وہ راکت بیٹھی تھیں۔ چند دن پہلے انہوں نے چوہدری حسن علی کو صرف شایان کی خواہش بتائی تھی لیکن آج

انہوں نے اسی کی تھی کہ وہ مظہر سے اور عالیان سے بات کریں۔ کیا خبر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ عالیان اور شایان آخر دونوں ہمارے بیٹے ہیں اور چوہدری حسن علی بھڑک اٹھے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ بھی نہیں مانیں گے۔ لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھیں ورنہ جانتی تھیں کہ یہ کتنی نامناسب بات ہے لیکن کیا کریں۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ ان سے ناراض تھا۔ بات نہیں کر رہا تھا، کھانا پینا بھی تقریر چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اسے منامنا کر، سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں تو مجبوراً بات کر بیٹھی تھیں اور اب نادم اور شرمندہ سی بیٹھی تھیں کہ وہ آیا۔

”آپ نے بابا سے بات کی؟“
 ”وہ نہیں مانتے۔“ عالیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اس لیے ناکہ میں ان کا سنا نہیں ہوں۔“ عالیان اگر میری جگہ ہوتا تو وہ اس کی بات مان لیتے۔“

”عالیان ہرگز ایسا بے ہودہ مطالبہ نہ کرتا جو تم کر رہے ہو، وہ بھی اپنے بھائی کی ہونے والی بیوی پر بری نظر نہ ڈالتا۔“

پتا نہیں آج کیسے عالیہ خاتون نے پہلی بار اس سے اس طرح اس لمحے میں بات کی تھی۔ شاید یہ حسن علی سے ہونے والی گفتگو کا اثر تھا یا انہیں احساس ہو رہا تھا کہ واقعی شایان کے اس بگاڑ کی وہ قصور وار ہیں۔

”مجھے اس کا علم نہ تھا جب مجھے اس سے محبت ہوئی۔“

”بس کرو یہ محبت محبت۔۔۔۔۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”ذرا جانیں رہی آپ میں۔“
 ”آج ثابت ہو گیا ہے کہ آپ عالیان کی ماں ہیں۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔ ”صرف عالیان کی۔۔۔۔۔ بے شک آپ نے مجھے دودھ پلایا، پالا پوسا لیکن ماں صرف آپ عالیان کی ہیں۔“ وہ غصے سے دروازے

کوٹھو کر مارتا ہوا باہر نکلا تھا۔ اندر آتے عالیاں سے کرا گیا۔

”کیا ہوا شانی؟“ عالیاں نے اس کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ ہاتھ جھٹکتا ہوا چلا گیا۔ حیرت زدہ سا عالیاں کمرے میں آیا جہاں عالیہ خاتون زار و قطار رو رہی تھیں۔

”کیا ہوا اماں جان! اور یہ شانی اتنے غصے میں کیوں تھا؟“

”آپ کو تو آج نہیں آتا تھا عالیاں! دو دن بعد آنے کا تیار ہے تھے آپ کے بابا۔“ عالیہ خاتون اسے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

”بس کام ہو گیا تھا تو میں آ گیا۔“

عالیاں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنا بازو ان کے گرد حائل کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔

”ہاں اب بتائیں کیا ہوا؟ آپ اس طرح کیوں رو رہی تھیں؟ ضرور شایان نے آپ سے کہا ہو گا کہ اسے جاب نہ ملی تو وہ امریکا چلا جائے گا۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں وہ نہیں جائے گا۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

”پلیز اماں جان! اگر آپ کے دل میں ایسا کوئی وہم ہے تو نکال دیں۔“

اور ان کے آنسو پھر سے بہنے لگے اور پھر چوہدری محسن علی کے منع کرنے کے باوجود وہ عالیاں کو سب کچھ بتاتی چلی گئیں۔ عالیاں کی گرفت ان کے گرد ڈھیلی ہو گئی تھی اس کے ہونٹ جھنجھتے ہوئے تھے۔ انہوں نے پر امید نظروں سے اسے دیکھا۔ شاید ہمیشہ کی طرح وہ کہہ دے۔

”ٹھیک ہے اماں جان! آپ زمین اور شایان کی شادی کر دیں۔“ لیکن وہنا کچھ کہے سخت چہرے کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور کہتا بھی کیسے، کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ زمین کو کتنا چاہتا ہے اور ان کے پاکستان آنے سے کتنا خوش ہے اور زمین بھی تو..... دونوں کے

جذبات سے بے خبر تو نہیں تھیں پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ چاہتی تھیں کہ عالیاں ہی اس کے حق میں دست بردار ہو جائے۔

وہ بڑا ہے، سمجھ دار ہے جبکہ شایان جذباتی ہے۔ جلد باز ہے، تھردلا ہے۔ لیکن عالیاں اتنی بڑی قربانی دینے کے لیے خود کو تیار نہیں کر پارہا تھا۔ صرف اس کی اپنی ذات کی بات ہوتی تو وہ اماں جان کے آنسوؤں اور عالیاں کی ضد کی خاطر قربانی بھی دے دیتا۔ لیکن بات زمین کی بھی تو تھی اور زمین کسی نہ مانتی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا اور جوابات وہ نہیں جانتا تھا وہ شایان کی ہر جائز اور ناجائز طریقے سے جیت لینے کی خواہش کی شدت تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے وہ جان کی بازی لگا دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

وہ عالیاں سے کبھی نہیں ہار تھا۔ سو اس نے نیند کی گولیاں کھالی تھیں۔ گو صالحہ نے اس کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے حلق سے نکلنے والی خرخراہٹ کی آواز سن کر شور مچا دیا اور یوں بروقت اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا اور فوری طور پر معدہ دہاش کر دیا گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے خطرہ بتایا تھا کہ اس نے بہت زیادہ گولیاں کھالی تھیں۔ اگر صالحہ اپنے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے آواز نہ نہتی تو.....

کافی دنوں بعد اس نے رات سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا نارمل انداز میں باتیں کی تھیں اور کچھ دیر بی وی لاؤنڈ میں بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور اتنے دنوں بعد عالیہ خاتون اطمینان کی نیند سو گئیں کہ شور سے آنکھ کھل گئی۔ چوہدری محسن علی نے اپنے تعلقات سے کام لے کر پو پو کیس کیس نہیں بننے دیا تھا۔

آئی سی یو کے باہر بیٹھے عالیاں کو یاد آیا تھا کہ جب اسے گولی لگی تھی تو وہ اپنا گردہ دینے کو تیار ہو گیا تھا وہ کہتا تھا کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں بھی اپنی زندگی ختم کر لوں گا تو کیا وہ اپنے اس بھائی کی خاطر

اپنی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ مشکل تھا بہت مشکل شاید جان دے دینے سے بھی زیادہ مشکل۔ لیکن اسے ایسا ہی کرنا تھا اور اس نے کیا۔

عالیہ خاتون نے مظہر چوہدری کے سامنے جھولی چھلادی۔

”وہ میرا بیٹا ہے، اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی جی نہیں پاؤں گی مظہر۔ عالیاں نہ سہی شایان سہی۔ اسے علم نہیں تھا کہ عالیاں اور زمین کی نسبت طے ہے۔“

”آپ کی بات صحیح ہے آیا! لیکن یہ فیصلہ میں نے نہیں کرنا۔ زمین نے کرنا ہے کہ اسے عالیاں کے بجائے شایان کا ساتھ قبول ہے یا نہیں۔ میں نے بہت پہلے زمین کے کان میں ڈال دیا تھا کہ وہ عالیاں کی امانت ہے اور اسے اس امانت کی حفاظت کرنا ہے۔ پچھلے آپ نے بچوں کو کچھ نہیں بتایا تھا اس رشتے کے متعلق لیکن میں جس آزاد ملک میں رہ رہا تھا وہاں میں نے ضروری سمجھا تھا کہ زمین کو اس بات کی خبر ہو کہ مجھے یقین ہے کہ گیارہ سال کی عمر سے اب تک عالیاں کو اس روپ میں دیکھنے کے بعد زمین بھی شایان کو یہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہو گی پھر بھی آپ کی خاطر میں زمین سے بات کروں گا۔“

اور زمین نے انکار کر دیا تھا اور عالیاں جانتا تھا کہ وہ انکار کر دے گی اور اسے انکار ہی کرنا تھا۔ بارہ سال پہلے جب وہ آئی تھی جب بھی وہ اپنے اور عالیاں کے رشتے سے آگاہ بھی اور شایان سے چڑتی تھی۔ ”تم اسے اتنا بچہ مت کیا کرو عالی۔ وہ بچہ تو نہیں ہے اب“ اور عالیاں کو یہ مرحلہ خود ہی سر کرنا تھا اور زمین سے خود ہی بات کرنا تھی۔ سو اس نے خود ہی زمین سے بات کی تھی اس نے زمین کو کیسے منایا تھا اہمیت کی قسم دے کر اپنی زندگی کی..... وہ خود ہی جانتا تھا۔ زمین مان گئی تھی اور شایان کے ہسپتال آنے کے ایک ہفتے بعد ایک مختصر تقریب میں شایان کے نام کی انگوٹھی زمین کو پہنا دی گئی لیکن

رخصتی ایک سال بعد رکھی گئی کہ زمین فی الحال وہی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ سب جانتے تھے کہ زمین کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا سوائے شایان کے جو کسی فلاح کی شان سے آنکھوں میں جھٹ کی چمک لیے سوچتا بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے ٹھکرا دیا جاتا۔ جب عالیاں اور شایان میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق زمین کو دیا جاتا تو اسے شایان کو ہی چننا تھا اور اس نے شایان کو ہی چنا تھا۔ وہ فخر سے آئینے میں اپنے کسرتی جسم کو اپنے سیاہ گھٹنگھٹے بالوں کو اپنی بے حد دلکش گھور سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر فخر سے مسکراتا۔

☆☆☆

جب سے مفتی کا فنکشن ہوا تھا اس نے زمین کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ تو وہ حویلی آئی تھی نہ یہ وہ ان کے بیٹے میں گیا تھا کہ اماں جان نے سختی سے منع کیا تھا کہ اسے اب مظہر بھائی کے گھر یوں ہی نہ اٹھائے نہیں جانا چاہیے تھا۔ مظہر بھائی اسے اچھا نہیں سمجھیں گے۔

”لیکن کیوں اماں جان۔“ اس نے احتجاج کیا وہ زمین سے ملنا چاہتا تھا اس کے احساسات جانا چاہتا تھا اور اپنے جذبات سے اس کو آگاہ کرنا چاہتے تھا۔

”کبھی تو بات مان لیا کرو شایان!“ ان کے لہجے کی بے بسی نے جس میں نمی کھل سی تھی اسے مزید کچھ نہ کہنے دیا۔

”اوکے اماں جان۔“

انہوں نے اپنے گئے بیٹے کی خواہش پر اس کی خواہش کو ترجیح دی تھی تو اسے بھی ان کی بات ماننی چاہیے تھی۔ اس نے اپنی خوشی میں کسی بات پر غور نہیں کیا تھا نہ عالیہ خاتون کی ہر وقت غم رہنے والی آنکھوں پر نہ زمین چوہدری کی سنجیدگی پر اور نہ ہی عالیاں کی گوشیز پر۔ وہ بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا بہت کم اس سے ہم کلام ہوتا تھا۔ وہ تو اپنی

ہی فتح میں سرشار زمین سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا۔ گھر کے نمبر پر وہ فون کرنا نہیں چاہتا تھا اور زمین کے بل کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ اور وہ کسی سے لینا نہیں چاہتا۔

بس ایک بار..... ایک بار وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ بھی بہت خوش ہوگی۔ اسے خوشی نہیں تھی، یقین جیسی خوشی نہیں اور پھر ایک روز اسے موقع مل گیا۔ محسن علی اسلام آباد میں تھے اور عالیہ خاتون کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ عالیان کو بھی کچھ دیر پہلے اس نے گھر سے باہر جاتے دیکھا تھا اور اس کے دل نے دعا کی کہ کاش اس وقت زمین آجائے وہ کوئی قبولیت کالمحہ تھا کہ اس نے زمین کو عالیہ خاتون کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔

”زمین“ وہ تیزی سے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تھا۔ ”اماں جان تو شاید زیتون خالہ کے گھر گئی ہیں ساتھ والے گاؤں میں۔“

زمین نے وہاں سے ہی قدم موڑ لیے۔

”زمین پلیز ایک منٹ رکو۔ میری بات سنو لو۔“

وہ رک گئی تھی لیکن اس نے لگا ہیں اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”تم خوش ہونا زمین اس نئے تعلق، نئے رشتے سے۔“ اس کی مشتاق نظروں نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ ”میں بہت خوش ہوں زمین۔ بہت خوش کہ میں نے تمہیں پالیا۔ میں تم سے بے حد بے حساب محبت کرتا ہوں۔ مجھے تمہارے بغیر زندگی بالکل بے معنی اور بے کار لگتی تھی۔“

وہ اس کے جواب کا انتظار کے بغیر بول رہا تھا۔ آج کتنے دنوں بعد اسے موقع ملا تھا کہ وہ اپنے دل کی بات اس سے کر سکتا اسے بتا سکتا کہ وہ پہلی نظر میں ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جب بارہ سال بعد اچانک اس نے اسے بچی سے ایک خوب صورت و شیرہ کے روپ میں دیکھا تھا۔

زمین نے بہت جمل سے اس کی بات سنی تھی اور پھر نگاہیں اٹھائی تھیں۔

”لیکن میں خوش نہیں ہوں۔“ اس نے بے حد نفرت سے اسے دیکھا۔

”آپ ایک خود غرض، خود پسند اور مطلبی شخص ہو، ایسے شخص کی رفاقت کسی کو اذیت تو دے سکتی ہے خوشی نہیں۔“

”زمین کیا کہہ رہی ہو۔“ شایان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”وہ جو آج تک آپ سے کسی نے نہیں کہا اور وہ جو جج ہے۔ آپ کو ہمیشہ ہی عالیان سے جیتنے کا شوق رہا اور آپ جیتتے رہے اس لیے کہ عالیان چاہتا تھا کہ آپ ہمیشہ فاتح رہو اسے آپ کی آنکھوں کی اس چمک سے اس خوشی سے محبت تھی جو عالیان کو ہر اکرا آپ کو ہوتی تھی۔ بچپن سے ہی اس کی پسندیدہ چیزیں آپ لیتے رہے ہیں کہ وہ آپ کو بھی پسند تھیں اور عالیان کے لیے بھائی کی خوشی مادی چیزوں سے زیادہ تھی۔“

لیکن میں چیز نہیں تھی کہ آپ کی ضد پر وہ آپ کو دے دیتے تو آپ نے اپنی موت کا ڈراما چاکر انہیں بے بس کر دیا۔ اور عالیان نے اپنی موت کا منظر دکھا کر مجھے مجبور کر دیا کہ میں یہ انگوٹھی پہن لوں۔“

اس نے دایاں ہاتھ آگے کیا جس میں ڈائمنڈ کی وہ خوب صورت رنگ جگمگا رہی تھی جسے وہ انہجائی شوق سے خود پٹیلہ جیولرز سے لے کر آیا تھا کہ وہ ممکنہ کائناتشن کرنا اور زمین کے ہاتھ میں خود انگوٹھی پہنانا چاہتا تھا۔

”اور یہ تمہاری آخری فتح تھی شایان علی! وہ ایک دم آپ سے تم پر آگئی تھی۔“

”جو تم نے میرے ہاتھ میں یہ انگوٹھی پہنا کر حاصل کی لیکن اس کے بعد تم ہمیشہ ہارو گے اپنی زندگی کے آخری سانس تک کیونکہ میرا دل اور روح صرف اور صرف عالیان کی ہے تم سر کر بھی میرا دل

نہیں جیت سکتے۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں شایان علی۔ شدید نفرت۔ تم مجھے حاصل کر کے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔“

وہ بول نہیں رہی تھی، پھنکار رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں جو شایان کے تئیں اور دل پر آبلے ڈال رہی تھیں۔

”عالیان مجھے اپنی محبت کا واسطہ دے کر اور اپنی موت سے ڈرا کر مجھے تمہارے نام تو منسوب کر سکتا ہے لیکن مجھے تم سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔“ وہ طنزیہ تھی۔

”سو اپنی اس آخری فتح پر جو مجھے اپنے نام سے منسوب کر کے حاصل کر چکے ہو، خوب جی بھر کے ان مناد کیونکہ پھر عمر بھر تم نے اپنی ہار پر روتا ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی وہ سائیکل سے اتر کر آگے دیکھ رہا تھا۔ برآمدے سے محسن اور محسن سے باہر والے گیٹ کی طرف جاتے لیکن وہ مانو پتھر کا دیکھا تھا۔ اس کا رنگ یوں پیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ نہ جانے کب تک اپنی نظر اڑھاتا اگر صالحہ اپنے کوارٹر سے نکل کر محسن میں اور پھر محسن سے برآمدے میں آکر اسے مخاطب نہ کرتی۔

”آپ کو کہیں جانا ہے۔ میں ذرا چھوٹی کو لے چلی گئی تھی اسے بخار ہے نا۔ کچھ چاہیے، ہاں کے جوس۔“

اس نے چونک کر صالحہ کی طرف دیکھا۔ خالی عالی نظریں جن میں اس سے زندگی مفقود تھی اور نفی میں سر ہلاتا وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آیا تھا۔

”نہیں..... نہیں..... یہ کیا کہا تھا زمین نے وہ جیتا زمین تھی۔ ہاں زمین ہی تھی۔“

”یہ تمہاری آخری فتح تھی شایان علی یاد رکھنا اگلی۔“ اس کی باتیں ہتھوڑے کی طرح اس کے سامنے پڑھ رہی تھیں۔

یہ عالی تھا جو ساری زندگی تمہاری چھوٹی میں کی بھیک ڈالتا رہا اور یہ آخری بھیک تھی آخری

فتح۔“

اسے لگا جیسے کمرے کے ہر کونے سے زمین کی ہنسی کی آواز آرہی ہے۔ طنزیہ ہنسی جیسے کمرے کی دیواریں، بیڈ فرنیچر سب اس پر ہنس رہے ہوں۔

”نہیں۔“ اس کے حلق سے کھٹی کھٹی سی آواز نکلتی تھی۔ اسے لگا جیسے میز پر رکھے کرشل کے خوب سورت گل دان نے قہقہہ لگایا ہو۔

سنو شایان علی..... یہ آخری فتح تھی۔

اس نے گل دان اٹھا کر دیوار پر مارا..... ایک چھناکے سے کر چیاں بھر گئیں..... پھر نیل لیب، گلاس، جگ کتابیں قیمتی ڈیکوریشن جو جو کچھ اس کے ہاتھ میں آتا رہا وہ پھینکتا رہا۔ اس کے اندر جیسے طوفان برپا تھا آگ لگی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جیسے تھک کر شکست خوردہ سا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ارگردو ٹی ہوئی چیزیں بکھری پڑی تھیں اس کے اندر بھی ایسی ہی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور اپنی ضروری چیزیں کاغذات، اسے ٹی ایم کارڈ، چیک بک اور چند جوڑے کپڑے، ایک بیک میں ڈال کر گھر سے نکل پڑا۔ اسے کہاں جانا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس وقت وہ بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑا تھا۔ اسے یہاں نہیں رہنا تھا اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

اسی جوتی میں جس کی ایک ایک اینٹ اس پر ہنس رہی تھیں اس کا تسخیر اڑا رہی تھی۔ اور اگر جو وہ جلد بازی نہ کرتا اور نیند کی گولیاں نہ کھاتا تو..... اس نے غلط طریقہ اختیار کیا تھا اسے وہی طریقہ اختیار کرنا تھا جو اس نے علیرہ کے لیے اختیار کیا تھا۔ پھر دیکھتا میں کہ کیسے زمین منظر خود کو میرے سحر سے بچا سکتی۔ پھر عالیان علی کو مجھ پر احسان نہ کرنا پڑتا۔ اسے ابھی بھی خود پر مان تھا اور ابھی بھی اسے اپنی کوئی غلطی نظر نہیں آرہی تھی۔

اس کے پاس گاڑی نہیں تھی وہ پیدل بسوں کے اڈے کی طرف جا رہا تھا جب سر پاک کے پاس

سے گزرتے ہوئے اس نے عالیاں کو دیکھا تھا۔ منڈ پر پر بیٹھا گھنٹوں کے گرد بازو جامل کئے، ٹھوڑی گھنٹوں پر رکھے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی براؤن آنکھوں میں اداسی کا سنہرا سا غبار پھیلا ہوا تھا۔ وہ جب اس کے قریب آ کر لہجہ بھر کے لیے رکھا تھا تو اسے گمان گزرا تھا کہ اس کی آنکھوں کی سطح گیلی تھی اور آنسو ستاروں کی طرح ان میں چمکتے تھے۔ ان کیلی آنکھوں میں اسے دیکھ کر حیرت سی اتری تھی۔

”شانی تم کہاں جا رہے ہو۔“

اور وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر بیگ گھسیٹا آگے بڑھنے لگا تھا۔ ”شانی“ وہ بے چین ہو کر منڈ پر سے اتر تھا اور اس کے بازو کو پکڑا تھا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”کیا ہوا ہے اتنے ناراض کیوں ہو اور یہ بیگ۔“ اور پھر پتا نہیں غصے میں اس نے کیا کیا کہا تھا۔

کچھ کہنے کی کوشش کرتے عالیاں کو وہاں ہی چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اور پھر بہت سارے دن وہ ایک ہوٹل میں رہا تھا۔ یوں تو وہ عادل کے پاس کی اور دوست کے پاس بھی جاسکتا تھا لیکن وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ کسی ایسی جگہ پر جہاں عالیاں ڈھونڈتا ہوا آجائے اور عالیاں اسے ضرور ڈھونڈتا ہوا آتا۔ شاید عالیہ خاتون اور حسن چوہدری بھی ساتھ ہوں۔ اسے یقین تھا اور اس کا یہ یقین غلط تو نہیں تھا۔ عالیاں مہینوں اسے ڈھونڈتا پھرا تھا۔ ہر کلاس فیلو ہر دوست سے اس کا پتا کیا تھا لیکن اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

وہ چند دن اس ہوٹل رہا پس اور وہاں ہی اس کی ملاقات حماد سے ہوئی تھی۔ حماد کالج میں ان کا کلاس فیلو تھا اور کالج کے بعد وہ لاہور چلا گیا تھا۔ وہ راولپنڈی کی ایجنٹ سے ملنے آیا تھا اور اسی ہوٹل میں ان کی ملاقات طے تھی اس نے بتایا تھا کہ وہ اس ایجنٹ کے ذریعے امریکا جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ امریکا پہنچانے کے اٹھارہ لاکھ لے گا تو پہلے نو بعد میں اور اس نے حماد سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے بھی ایجنٹ سے بات کر لے۔ پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ چوہدری حسن علی اس کے حصے کی ساری رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتے تھے۔ یوں وہ حماد کے ساتھ ہی لاہور آ گیا تھا۔ لاہور میں بھی وہ ہوٹل میں ہی ٹھہرا تھا اور پھر ٹھیک چار ماہ دس بعد وہ امریکا پہنچ گیا تھا وہ امریکا کیسے پہنچے یہ بھی ایک الگ کہانی تھی تاہم وہ جب غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے امریکہ میں پہنچے تو وہاں حماد کے ماموں انہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ آگے کے سب معاملات انہوں نے ہی سنبھالے تھے۔

انہوں نے انہیں جاب بھی دلوا دی تھی گو شروع میں انہیں چھپ کر ایک تہ خانے میں کام کرنا پڑتا تھا پھر ہولے ہولے وہ سیٹ ہوتا گیا۔ اسے سب یاد آتے تھے اماں جان بابا عالیاں، اپنا گاؤں حویلی سب راتوں کو وہ بے قرار ہو کر جاگتا رہتا شروع شروع میں تو زمین کی باتیں یاد آتیں تو اس کا دماغ کھولنے لگتا تھا۔ اعصاب یوں تن جاتے جیسے ذرا سے کھچاؤ سے ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن پھر ہولے ہولے وہ زمین کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ شاید نہیں یقیناً وہ کبہر ہی تھی وہ غلط تھا۔ خود غرض اور خود پسند تھا۔ جوں جوں وہ اپنا احتساب کرتا اسے اپنا آپ مجرم لگنے لگتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی عالیاں کے ساتھ زیادتی کرتا آ رہا تھا۔ اس نے علیزہ کو عالیاں سے دور کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور کامیاب ٹھہرا تھا پھر اب زمین۔

اور زمین نے کیا کہا تھا کہ عالیاں جان بوجھ کر کسی ایک پیپر میں ایک آدھ سوال چھوڑا تھا تاکہ وہ.....

اور اس نے کیا کیا تھا اس کی محبت اس کی منگ چھیننا چاہی تھی۔ زمین نے کہا تھا تم احسان فراموش ہو۔

ہاں میں احسان فراموش ہو۔ وہ اعتراف

کرتا۔ اسے عالیہ خاتون کی محبتیں، چوہدری حسن علی کی شفقتیں اور عالیاں کا پیار یاد آتا تھا۔ وہ کیسے اس کا حال رکھتا تھا اپنی محبت سے دست بردار ہو جانا کتنا مشکل ہوتا ہے بلکہ ناممکن اور عالیاں نے یہ ناممکن کام کیا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگتا چاہتا تھا بلکہ سب سے لیکن پھر بھی وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عالیاں، زمین، اماں جان کی کا بھی سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اس نے چار سال گزار دیے تھے۔

ایک سال قبل اس نے ایک مختلف نام سے عالیاں علی کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں ایڈ کیا تھا۔ عالیاں نے اسے اور اس کے بچپن کی تصویر لگا رکھی تھی وہ توں ایک ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔ پھر وہ بھی کھار ہاں اسٹھ کے نام سے عالیاں سے چیٹنگ کرنے لگا۔ عالیاں نے چٹ کرتے ہوئے وہ مامی بے آب کی طرح نہ پتا۔ اس نے بھی اپنی تصویر نہیں لگائی تھی۔ اس مختلف مناظر، پھول، بچے، وہ بہت لم آن لائن ہوتا تھا کہ جدائی کی اذیت بڑھ جاتی تھی۔

☆☆☆

دو سال پہلے نیویارک سے واشنگٹن آتے ہوئے فاطمہ حسن سے اس کی ہوائی جہاز میں ملاقات ہوئی تھی اور پھر اتفاق یہ ہوا کہ وہ اس کی بلڈنگ کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ اس کے والدین نیویارک میں تھے اور وہ یہاں جاب کرتی تھی۔ اور اس نے ہی اسے اس لیے میں جاب دلوا دی تھی۔

ہاں وہ جاب کرتی تھی یہ جاب پہلی جاب سے اور بہتر تھی اور اس کی تعلیم کے مطابق تھی۔ اور پھر پتا نہیں کب کیسے فاطمہ حسین اور اس درمیان دوستی رشتہ گہرا اور مضبوط ہوتا گیا۔ اور فاطمہ حسن اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے دل کو ٹوٹا تو فاطمہ حسن کے لیے ایسا دل نہ پاتا۔ فاطمہ حسن اس کے ساتھ ہوتی تو

اسے علیزہ احمد یاد آتی۔ کتنا ہرٹ کیا تھا اس نے اسے۔ وہ فاطمہ حسن کو ہرٹ نہیں کرتا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے دل سے زمین کی محبت کو نہیں نکال سکتا تھا۔ بے شک اس نے علیزہ احمد کے ساتھ محبت کا ڈرامہ کیا تھا لیکن زمین کے ساتھ اس کی محبت ڈرامہ نہیں تھی۔ زمین کا تصور آتے ہی دل میں آج بھی کک جاگ اٹھی تھی اور وہ بے اختیار زمین اور عالیاں کی خوش گوار زندگی کی دعا کرنے لگتا تھا۔ اور فاطمہ حسن کی اپنی طرف اٹھتی نظر آنکھوں سے نظریں چرا لیتا۔

اس روز وہ کئی مہینوں بعد آن لائن ہوا تھا اور اس نے فیس بک کھولی اور اس کا دل ڈوب گیا۔ عالیاں نے پوسٹ لگا رکھی تھی۔

”میری مدد شدید بیمار ہیں پلیز آپ سب ان کے لیے دعا کریں۔“

”اماں جان!“ اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔ وہ عالیاں سے بات کرنا چاہتا تھا پوچھنا چاہتا تھا کہ اب وہ کسی ہیں لیکن وہ آف لائن تھا وہ بے چین تھا مضطرب تھا۔ وہ ذرا سا بیمار پڑتا تو کیسے عالیہ خاتون ساری ساری رات اس کے سر ہانے بیٹھی رہتی تھیں۔ اور کیسے وہ نگرے کرتا اور اپنے لاڈ اٹھواتا تھا۔

بے چین ہو کر اس نے اپنے گھر کا نمبر ملا لیا تھا۔ ایک بار نہیں کتنی ہی بار اور ہر بار یہ سن کر کہ یہ میری کے استعمال میں نہیں اس کا جی جاہادہ فون کو دیو اب مار کر توڑ دے۔ بابا اور عالیاں کا سیل نمبر بھی اسے یاد نہیں تھا۔ اس کا پرانا فون امریکا آتے ہوئے گر گیا تھا۔ فاطمہ حسن جب ملاؤ بنا کر اسے دینے آئی تو وہ رو رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی چیز پکاتی اس کے لیے ضرور لے کر آتی۔

”کیا ہوا شایان! کیوں رو رہے ہو۔“

”میری اماں جان بیمار ہیں۔“

اور پہلی بار اس نے فاطمہ حسن کو مختصر بتایا کہ چار سال پہلے وہ معمولی سی بات پر گھر سے ناراض ہو کر آ گیا تھا۔

”الحق بھلا ماں باب سے بھی کوئی ناراض ہوتا

ہے۔ ”اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے تسلی دی۔ امید دلائی اور دعا مانگتے کو کہا تھا۔ اور پھر بغیر اس سے پوچھے وہاں ہی بیٹھے بیٹھے اس کے لیے آن لائن پاکستان کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔ وہ اسے منع ہی کرتا رہ گیا تھا۔

”نہیں فاطمہ! میں وہاں نہیں جاسکتا۔ میں نے ان کا بہت دل دکھایا۔ میں نے ان سے زیادتی کی میں خود غرض اور خود پسند تھا۔“

”تو؟“ فاطمہ کی دلکش آنکھیں سوالیہ انداز میں اس کی طرف اٹھیں اور اسے پہلی بار لگا کہ اس کی آنکھیں بے حد خوب صورت ہیں اور ان میں وہ بے پناہ متینا طبیعت ہے جو اسے زمین کی آنکھوں میں محسوس ہوتی تھی۔

بے وقوف لڑکے ماں باپ کے ظرف اور دل بہت بڑے ہوتے ہیں اور انہیں یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ تم نے کبھی ان کے ساتھ زیادتی کی ہوگی ان کا دل دکھایا ہوگا۔ وہ تو تمہارے لیے تڑپتے ہوں گے۔ بالکل میرے والدین کی طرح جو میرے بھائی کی ہر زیادتی کو بھلا کر اس کی جدائی میں تڑپتے ہیں۔ اس سے ملنے کی اور اس کی خوشیوں کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ بس اب پاکستان جانے کی تیاری کرو۔“

ٹھیک چار دن بعد وہ فاطمہ کے ساتھ ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ عالیان کی نئی پوسٹ سے اسے پتا چل گیا تھا کہ اماں جان ہاسپٹل سے گھر آگئی ہیں اور پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ فاطمہ کے ساتھ ہی اس نے سب کے لیے شاپنگ کی تھی۔ لیکن ایک وہم ایک خوف ساتھ کیا پتا وہ مجھ سے ملنا پسند نہ کریں۔ کیا جبر وہ مجھے حویلی سے نکال دیں مجھ سے بات ہی نہ کریں۔

”باگل ہو تم۔“ فاطمہ حسن نے اس کی بات سن کر اسے ڈانٹ دیا تھا جب وہ بورڈنگ کے لیے جانے لگا تو اس نے دیکھا فاطمہ کی خوب صورت آنکھوں میں پانی پھیلتا جا رہا تھا۔ ”تم واپس تو آؤ گے نا۔۔۔ اور اگر نہ آسکو تو

مجھے یاد رکھنا شان۔۔۔ اور یہ بھی کہ میں تمہیں بھی بھول نہیں پاؤں گی۔۔۔ اور یہ کہ میں۔۔۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بہت بے حد۔“

آنسو اس کی آنکھوں کے کونوں سے پھیل کر رخساروں پر اٹک گئے۔

”تم بہت پیاری ہو فاطمہ بہت اچھی۔ میں واپس آؤں گا۔“

”میں ہمیشہ آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔“ اس نے رخ موڑ لیا تھا اور وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

درختوں کے اوپر ایک ساتھ کئی پرندوں نے اڑان بھری تو ان کے پروں کی پھر پھر اڑت سے چونک کر میں نے سر اٹھایا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور میں نے ماضی سے حال تک کا لمبا سفر طے کیا تھا اور وہ ابھی تک وہاں ہی بیٹھا تھا یوں ہی افسردہ اور اداس سا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا میری نظریں اس پر پڑیں۔ یہ میں تھا شایان علی تھا اور وہ عالیان علی پھر وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید وہ کھر کی طرف جا رہا تھا۔

”عالی۔۔۔“ میں نے اسے پکارا لیکن میری آواز حلق میں ہی پھنس گئی تب میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اسے آواز دی۔

”عالی۔۔۔ عالیان!“ وہ ٹھٹھک کر رک گیا تھا اور ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھایا۔ میں ایئر پورٹ سے سیدھا ایک ہونٹ میں گیا تھا اور اپنا سامان وہاں رکھ کر وینگ سے گاؤں آیا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ مایوس سا نظر آنے لگا تھا کہ میں بیک اٹھائے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا۔ ”عالی۔“ میری آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے میری آواز سن لی تھی اور اب کے مجھ دیکھ بھی لیا تھا۔

”شانی۔۔۔ شایان“ وہ اندھا دھند میری طرف بھاگا تھا میرے ہاتھ سے بیک گر گیا تھا۔ قریب آتے ہی اس نے مجھے دونوں بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

”کہاں چلے گئے تم۔۔۔ شانی۔۔۔ ظالم۔۔۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔ گویا چلے گئے تھے ہمیں چھوڑ کر۔“

وہ رو رہا تھا۔ بار بار میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر مجھ دیکھتا اور پھر مجھ سے لپٹ جاتا۔

”مجھے لگا تھا میرے کان بج رہے ہیں۔ مجھے تو لگزیوں ہی تمہاری آوازیں آتی تھیں۔“

میرے آنسو بھی میرے رخساروں کو بھگوتے تھے۔ میں کیا کہتا کیوں چلا گیا تھا۔ مجھ سے اپنی ہار برداشت نہیں ہوئی تھی یا زمین نے مجھے جو آئینہ دکھایا تھا اس میں مجھے اپنی مکر وہ صورت برداشت نہیں آئی تھی۔ سو میں نے صرف اتنا کہا ”سوری عالی!“

میں نے تم سب کو بہت تکلیف پہنچائی مجھے معاف کر دو پلیز۔ میں شرمندگی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”تم آگے ہوتا سمجھو ساری تکلیفیں ختم ہو گئیں سارے درد ماند پڑ گئے۔“ اس نے جھک کر میرا بیگ اٹھالیا۔

”عالی تم نے مجھے معاف کر دیا نا۔“

”بھائی میں کیسی معافی تلائی۔ اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی تھی تو دو چار سنالیتے مجھے اور بس معاملہ ختم۔“

”اماں جان اور بابا کیسے ہیں وہ تو مجھ سے بہت ناراض ہوں گے وہ مجھے معاف کر دیں گے تا تم میری سفارش کرو گے نا۔“

”اماں جان کو تمہارے جانے کے بعد انجانا کا الگ ہوا تھا اور ابھی چند دن پہلے مائیز ساہارٹ ایک ہوا ہے۔ چند دن پہلے ہی ہاسپٹل سے گھر آئی ہیں۔ اب ٹھیک ہیں اور بابا، وہ بھی کچھ کمزور ہو گئے ہیں جاب انہوں نے چھوڑ دی ہے۔ گھر پر ہی ہوتے ہیں وہ کبھی باہر نہیں ہیں لیکن شانی انہوں نے تمہارا غم دل سے لے لیا ہے۔“

میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ سادگی سے

بتا رہا تھا اور میں اندر سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ ”اور تم سے کوئی ناراض شادراض نہیں ہے سمجھ۔“

”اور تم کیا کر رہے ہو آج کل۔“

”کچھ نہیں۔“ اس نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”کیوں کیا تمہاری انٹرویو کے لیے کال نہیں آئی تھی۔“ میں حیران ہوا۔

”آئی تھی اور میں سلیکٹ بھی ہو گیا تھا لیکن پھر میں نے جاب نہیں کی۔“

”کیوں۔“

میری حیرت میں اضافہ ہوا۔

”یار مجھے تو ہمیشہ تمہارے پیچھے رہنے کی عادت تھی تو تم نہیں تھے اور میں کیوں جاب کرتا۔“

”فضول تم نے چار سال ضائع کر دیے۔“

”فضول کہاں یہاں بابا کے ساتھ زمینوں وغیرہ کو دکھتا رہا۔“

”لیکن میں تو وہاں جاب کرتا ہوں۔ ادھر امریکا میں۔“

تم امریکا بھاگ گئے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑیں۔

”اور میں یہاں سارے پاکستان میں تمہیں ڈھونڈتا پھرا۔ خیر! تاکہ انرجی میں دونوں ایک بار پھر کوشش کریں گے۔“

وہی لا پرواہ اور سادہ سا انداز جو مجھے بار بار شرمندہ کر رہا تھا۔

”اور شادی تو کر لی ہوگی تا تم نے بچے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”شادی کیسے کرتا تم سے پہلے اب پہلے تمہاری شادی ہوگی اور پھر میں بھی کر لوں گا اچھا ہوا تم آگے۔“

زمین کی وجہ سے مظہر ماموں بہت پریشان رہتے ہیں۔ چند ماہ پہلے وہ بھی مستقل طور پر پاکستان آگئے ہیں۔ بس اب فوراً تمہاری اور زمین کی شادی ہو جائے تو ان کی پریشانی ختم ہو۔“ چلتے چلتے مجھے ٹھوکر لگی۔

عقلمند کی شادی

تشریف یاض

چھٹی قسط

کالمیٹ

”زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔ پتا تو ہے تمہیں ادھر زمین اونچی نیچی ہے۔ سنبھل کر چلو۔“ وہ تشویش سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے زمین سے شادی کیوں نہیں کی عالی میں تو چلا گیا تھا۔“

”کیسے کر لیتا کیا بھول گئے تم نے اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔“ اس نے نظریں چرا لی تھیں لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں پھلتے کرب کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

”میں نہیں جانتا تھا زمین نے تم سے کیا کہا تھا لیکن جو کچھ بھی کہ اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں پتا تو ہے تمہیں یہ لڑکیاں کتنی احق ہوتی ہیں۔“ وہ ٹکا ہوا جھکے کھڑا تھا۔

”معافی تو مجھے تم سے مانگنی ہے عالیان۔ میں تم دونوں کے درمیان آ گیا تھا۔“

ایم ریڈی دیری سوری۔ میری آواز بھر آ گئی تھی۔

”میں اس لیے تو چلا گیا تھا کہ تم زمین سے شادی کر لو اور تم بے وقوف کیا میں تمہیں اتنا ظالم نظر آتا ہوں کہ تم سے تمہاری محبت کی قربانی مانگتا۔“

”لیکن تم بھی تو شادی..... تم بھی تو زمین سے..... اور تم نے خود شادی کی.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”وہ جنس ضد تھی..... بس اور کچھ نہیں..... میری پیارز ہنیت۔“ میں نے دل پر صبر کا پتھر رکھا۔

”خیر اب جو ہوا سوا ہو۔ مظہر ماموں اور سب چار سال سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تو تم ان کا انتظار ختم کر دو کل ہی سہرا باندھ کر چلے جاؤ ماموں کے گھر میں تو شادی کر چکا ہوں۔“ میں زبردستی ہنسا۔

”یعنی“ اس نے میری پیٹھ پر مکا مارا۔

”ہمیشہ کی طرح تم یہاں بھی بازی لے گئے۔ اور مجھ سے پہلے ہی شادی کر لی۔“

اس کی آنکھوں سے اداسی کا غبار یک دم چھٹ

دوستو! یہ میری داستان کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس حصے میں آپ ایک بات ضرور سیکھ لیں گے کہ فہم و فراست کسی کی میراث نہیں ہوتی اور عقل و شعور کسی کو ترکہ میں نہیں ملا کرتا اور تباہی کسی کی دولت اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہی دانش ور ہوگا اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ روپے پیسے سے ہی انسان کے کردار کو جانچا جائے۔ عام انسان بھی اچھے ہوتے ہیں قیمتی ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کی انسان سمجھ کر بھی عزت کرنا شروع کریں۔

آسان الفاظ میں کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ بہت ہنسی آرہی تھی نا آپ کو اس انکشاف پر کہ میں ایک کپڑے سینے والا عام سائیلر ماسٹر ہوں۔ اس بار آپ کو پتا چلے گا کہ ایک ٹیلر ماسٹر بھی کسی بھی معاشرے کا اہم ترین رکن ہو سکتا ہے بلکہ ٹیلر ماسٹر ہی نہیں بلکہ دھوبی، موچی قصائی ناٹی۔ سب کے سب اہم ہوتے ہیں۔ اگر آپ سمجھیں تو۔۔۔۔۔

اس لیے اگلی مرتبہ جب کسی بھی ایسے شخص سے ملیں جو کسی ایسے پیشے سے وابستہ ہو تو اس کی دل سے عزت کیجیے گا کیونکہ وہ بھی اس کا حق ہوتا ہے۔ اس کی بھی اولاد ہوتی ہے جس کے لیے ان کا باپ بادشاہ ہوا کرتا ہے۔

جی جی مجھے پتا ہے آپ بورہور ہے ہیں۔ آئیے بتاتا ہوں۔ آپ کو آگے کا قصہ۔

☆☆☆

"انتش کہتے ہیں مجھے۔ یہ جتنا ہے مجھ پر۔ انتش کہتے ہیں مجھے۔ وہ جتنا ہے مجھ پر۔۔۔۔۔" مہناز بیگم نے منہ بنا کر اور ناک چڑھا کر بیٹے کی نقل اتاری تھی۔

"ہر وقت کی اس گردان نے دکھایا ہے یہ دن۔ آج ثابت ہو گیا کہ غرور کا سر ہی نیچا نہیں ہوتا۔ میں تو اتنا جانتی ہوں ماسٹر جی کہ اگر غرور اتنا ہو جتنا آپ کے ہونہار سپوت کو لائق ہے تو پھر غرور کا سر ہی نہیں بلکہ ٹانگیں بازو، سر دھڑ سب کا سب نیچا ہو جاتا ہے۔" انہوں نے تو یوں کارن ان کی جانب کیا۔ وہ چائے کے انتظار میں ڈانگ ٹیبل پر آ بیٹھے تھے ورنہ

دل تو اتنا بھجا ہوا تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ بس لحاف تک چڑھائیں اور کسی کی جانب نا دیکھیں۔ میڈم تہینہ نے چند گھنٹوں میں ان کا سالوار کایا اعتماد مٹی میں ملا دیا تھا۔

مہناز بیگم نے ساس پین کو پانی سے بھر چولے پر پھینکنے والے انداز میں رکھا اور ان کی جانب رخ کیا۔ سونیا نے آگے ہو کر ساس پین کو سنبھال لیا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ممانی کے غصے سے ابھی ڈر لگ رہا تھا آخر اس کار خیر میں اس کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ اس نے بھی تو انہیں زمین کے جانے کے لیے کتنی مشکل سے رضامند کیا تھا۔ ان کی جانب دیکھے بنا وہ چائے کی پتی اور چینی وغیرہ نکالنے کے لیے کینٹ کی جانب ہوئی تھی۔ مہناز بیگم ماسٹر جی کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی تھیں۔

"بہت شوق تھا آپ کو بھی ماسٹر جی بیٹے کی کے مطابق چلنے کا۔ اس کی پسند کی ہوئی لڑکی کے جانے کا۔ اسے بہو بنانے کا۔ بہت بھر و سنا تھا آپ اپنے بیٹے کی عقل و دانش پر۔ آپ کا فرمان تھا نا انتش نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ اب آیا۔ پتا چلا۔ دھلے دھلائے منہ پر بڑی ہے نا چیمبر اب تو بہت خوش ہوں گے آپ۔ اتنی تو بہن کروا سکون مل ہو گیا ہوگا آپ کو اور آپ کے بیٹے کو بھی جن کا اصول ہی یہ ہے کہ کپڑا لینا ہو یا صابن، برا دیکھ کر لینا چاہیے اور ساس پسند کی ہیں انجڑ، چال گنوار۔ کس قدر بدتمیز اور بد لحاظ عورت تھی وہ۔ کیے امتحانہ سوال پوچھ رہی تھی بار بار۔ ہیں ماسٹر جی ہائیں ماسٹر جی! یہ آپ کا بیٹا ہے؟ اتنی ہنسی یونیورسٹی میں پڑھا کیسے لیا آپ نے اپنے بیٹے کو۔ بینک سے قرض تو نہیں لیا تھا؟ اور یہ غریب سی گاڑی فسطوں لے کر دی ہوگی آپ نے بیٹے کو؟

ہاں بھائی غریب ہیں تو کیا ہوا دل تو چاہتا ہے کہ اکلونی اولاد کے چوتلے پورے کیے جائیں لیکن اپنے بڑھاپے کے لیے بھی کچھ بچایا ہے یاساری پوچھ بیٹے کو سنا ہے سنوار نے میں ہی ضابطہ کر دی؟ آئیے

امتحانہ سوال بار بار پوچھ کر ثابت کیا کرنا چاہ رہی تھیں کہ ہم کوئی بھوکے ننگے، بنانا نام نسب کے لوگ ہیں جو اساتذہ سے اتار لیے گئے تھے یا کھوکھو کر درکار آلو کی طرح زمین سے برآمد کیے گئے تھے۔ اگر اتنا ہی اہم ہے انہیں اپنی امارت کا تو ہمیں بلوایا ہی کیوں تھا آپ کی تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اس کے سامنے۔ کیسے میڈم جی، میڈم جی کرنے لگے ہوئے تھے آپ۔" انہوں نے لگے ہاتھوں ماسٹر جی کو بھی لہذا۔

"مجھ سے خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے بی بی! میں پہلے ہی بہت الجھا ہوا بیٹھا ہوں۔ جو کچھ بھی آج ہوا۔ وہ میری توقع کے بالکل برعکس ہے۔ میری تو پوچھ میں ہی نہیں آ رہا لیکن جو بھی ہوا، برا ہوا۔ وہ بدلہ لاتی پر آتے آتی تھیں تو آپ کے بیٹے نے بھی پوچھا نہیں کیا۔" کسے عورتوں کی طرح ان کی ہر بات کے جواب میں بھگو بھگو کر لگا رہا تھا۔ رشتے کا لانا کیا نا ان کی عمر کا۔ ایسے بات کی جانی ہے بڑوں سے۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ۔ اچھی تربیت کی ہے ماسٹر جی نے بیٹے کی۔" ماسٹر جی کھیانے سے ہو کر اٹھ گئے۔

میڈم تہینہ کے روئے نے انہیں بہت تکلیف پہنچائی تھی حالانکہ وہ رات کے کھانے پر مدعو کیے گئے تھے لیکن صورت حال اتنی بگڑ گئی تھی کہ وہ لوگ کھانا کھائے بنا ہی واپس آ گئے تھے اور انہیں کسی نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ماسٹر جی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ساری زندگی جو کام سر اٹھا کر کیا تھا وہ آج ان کے لیے سر جھکانے کی وجہ بن جائے گا۔ وہ ایک الگ ہی تکلیف سے گزر رہے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ میڈم تہینہ کا رویہ بہت تنک آمیز تھا لیکن انتش نے بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی تھی۔ ابتدا میں تو وہ خاموش ہی رہا لیکن پھر اس کے صبر کا پیمانہ کم ہو گیا تھا اور اس نے ان کے ہر سوال کا دو بدد جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ ماسٹر جی کو یہ بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی لیکن فی الوقت وہ اپنی اہلیہ کے سامنے

اس بات کو زیادہ دہرا کر ان کے غصے کو ہوا نہیں دینا چاہتے تھے اسی لیے ان کا لہجہ کمزور سا تھا۔ مہناز بیگم ان کی بات سن کر بھڑک ہی اٹھیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ یعنی آپ ابھی بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ آپ کے متعلق کچھ سوچتی ہوں گی۔ دو ٹوکے کی سلامی ہے آپ کی اس سوچ کو ماسٹر جی۔" وہ غرا کر بولیں پھر انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

"آپ ابھی بھی شاید اس رشتہ داری کے خواب دکھ رہے ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تو کبھی منور کر بھی نا دیکھے گی آپ کی طرف۔ آپ نے دیکھا نہیں اس کا رویہ۔ لیکن پھر بھی آپ نہ جانے کون سی امید کے اندے ٹوکری میں ڈال کر بیٹھے بیٹھے رہے ہیں کہ نا آپ تھک رہے ہیں، نا اندے ترخ رہے ہیں اور انتش کو کوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس عورت نے بڑے پن کا ثبوت تو خود نہیں دیا تو وہ تو پھر کل کا بچہ ہے نہ حترمہ کے آگے۔ اس کے صبر کا پیمانہ تو دیے بھی لبریز ہونے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا تھا وہ بات کیسے کر رہی تھی جیسے ہم اس کے ملازم ہوں۔ انتش نے بالکل ٹھیک کیا۔ کہیں تو فائدہ ہو اچھے اس کی منہ پھٹ طبیعت کا۔

بھلا بتاؤ۔ ہونے والی ساس پہلی ہی ملاقات میں سوال کیسے کر رہی تھیں۔ میری بیٹی کو رکھو گے کہاں۔ کتنے کمروں کا گھر ہے تمہارا۔ جیب خرچ کتنا دو گے۔ ہنسی مون پر کہاں لے جاؤ گے۔ اتنی ہی خاندانی بنتی ہیں تو یہی لحاظ کر لیتیں کہ ایسی باتیں پہلی ملاقات میں ہی طے نہیں کر لی جائیں۔ پہلی ملاقات میں ہی اصلیت دکھادی اس عورت نے تو۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا بھی ہے۔ انتش کو ایسی ہی بگڑی کا ناچ نچانے والی ساس ملنی چاہیے۔ اس لڑکے نے بھی کون سا اچھا کیا ہے ہمارے ساتھ۔ ڈیل کر دو اگر رکھ دیا ہے۔ خود ہی جھگٹے ایسی کڑوی ساس کو۔" وہ نا جانے سنجیدہ تھی یا طنزیہ انداز میں کہہ رہی تھیں لیکن چائے بنانی سونیا کے لبوں پر مسکراہٹ چھپنے لگی تھی۔

"اتش غلام حسین۔ ماسٹر جی آپ کا بیٹا ہے؟" زرمین کی ماما کے تحقیر آمیز تاثرات اس کے ذہن میں جیسے چمکر رہے تھے۔ سونیا ان ہی کے متعلق سوچتی چلی جا رہی تھی اور اسے اتش ہی تصور اور نظر آ رہا تھا۔ زرمین کی ماما کا چہرہ ماسٹر جی کو دیکھتے ہی کیسے بدل سا گیا تھا۔ وہ اس انکشاف پر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ اتش نے اپنی قبلی کے بارے میں جانے کون کون سے چھوٹ بول رکھے تھے زرمین سے کہ وہ بھی حیران نظر آتی تھی۔

"افسوس..... صد افسوس۔ یہ کیا ہو گیا اتش!" سونیا نے سوچا تھا پھر اس نے اگلے ہونے پانی میں چھپ کر چائے کی پتی ڈال دی۔ ایک سیکنڈ میں ہی پانی کا بے رنگ چہرہ مجبورے رنگ میں ڈھل گیا تھا۔ دن کا آجالیہ جیسے یک دم بنا دو پہر اور شام میں ڈھلے رات بن گیا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ چائے کا پانی نہیں ہے بلکہ اس گھر میں وقوع پذیر ہونے والی صورت حال ہے۔ ایک ہفتے سے جو بد مسرت ماحول بنا ہوا تھا اسے کسی کی نظر ہی لگ گئی تھی۔

اتش کو جس روز اس نے بتایا تھا کہ ممانی زرمین کے گھر جانے کے لیے رضامند ہو گئی ہیں اس روز سے وہ بے پناہ خوش تھا۔ ماموں ممانی نے بھی جیسے بیٹے کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ان سب کا ہی خیال تھا کہ بس ممانی جان کی رضامندی ہی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ان کے گمان میں ہی نہیں تھا کہ میڈم تہینہ بھی ایک "رکاوت" ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ تو ان لوگوں کو دیکھتے ہی جیسے جتنے سے اکھڑ گئی تھیں۔ سونیا جہاں تک سمجھ سکی تھی وہ غلطی کا معاملہ لگ رہا تھا۔ زرمین کی والدہ شاید تو قہر نہیں کر رہی تھیں کہ اتش کا تعلق ان کے خاندانی ورز ماسٹر غلام حسین سے ہو سکتا ہے تب ہی وہ صورت حال اور اپنے مزاج پر قابو نہیں رکھ پاتی تھیں۔

"اتش کہتے ہیں مجھے۔ سب جتنا ہے مجھ پر۔" سونیا کی سماعتوں میں جیسے کوئی تاخیر پھری آواز سرسرا رہی ہوئی آئی تھی اور لڑکھڑائی ہوئی گزر گئی تھی۔ ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار

ہوئی۔ اس نے مزید کمر عقب میں دیکھا۔ ممانی جان ماموں آپس میں اگلے ہوئے تھے۔ اس نے دوبارے چائے کے ساس پین کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں کھڑے ہو کر مسکرانے کا مطلب الوقت اپنی شامت کو دعوت دینا تھا۔

ڈیزہ ایک گھنٹہ ہو چلا تھا ان سب کو زرمین کے گھر سے واپس آئے ہوئے۔ اتش ان کو دروازے پر چھوڑ کر ہٹا کچھ کچھ کہیں چلا گیا تھا۔ ماموں کو بات کا بھی ذکر تھا لیکن ممانی جان کی ناراضی کے سے وہ اس متعلق کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

"اتش غلام حسین۔ آج کا دن تو سدا یاد رہے تمہیں۔" وہ پھر مدھم سا مسکرائی تھی۔ اسے جا کیوں گدگدی ہوئے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"ارے بہت کچھ ہو گیا ہے اب تو....." بتاؤں اور کیا بتاؤں۔ اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ جس کو پہلے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ "مہم کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

"لا حول ولا قوت۔" وہ سخت کبیدہ خاطر ہو بڑبڑاتا تھا۔ امی کہیں نظر نہیں آئیں وہ یقیناً فون پائیں کرنے میں مصروف تھیں۔ اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن سونیا بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھانے کے لیے اپنے کمرے سے نیچے آیا تھا۔ دن گزر گئے تھے زرمین کی والدہ سے ملاقات کو ان دو دنوں میں اس نے اپنے آپ پر اتنا جبر کیا جتنا کبھی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک بار زرمین کو کال کی تھی ماسٹر جی کے تھے اور تڑپ یہ بھی کہ اس نے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

"بہت دعوے کرتی تھی میڈم! تمہارے نہیں رہ سکتی۔ سر جاؤں گی۔ ادنبہ، جھوٹی! وہ ہر بلا وہ موبائل اٹھا کر دیکھنے لگتا تھا کہ شاید اس جانب سے کوئی میسج ہی آیا ہو پھر بڑبڑاتے ہوئے دیتا تھا۔ یہ کیفیت تو دل میں چل رہی تھی لیکن بظاہر لا رہا تھا پھر تا تھا اگرچہ اپنے کمرے تک محدود ہو

تھا۔ سب سے بات چیت مختصر ترین کر دی تھی۔ آفس سے بہت تاخیر سے واپس آ رہا تھا لیکن یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ جیسے اس کو یہ درگت بہت محسوس ہوئی ہے حالانکہ اس دن جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اس کی توقعات ہی نہیں برداشت سے بھی بڑھ کر تھا۔

آج تک کبھی کسی نے ایسے تھیک نہیں کی تھی اس کی۔ ایسا ہنگ آمیز سلوک کبھی سہا ہی نہیں تھا اس نے۔ اس کے والدین کے سامنے اس کی پُر اعتماد مفرد شخصیت پر زور دار چھڑ پڑا تھا اور وہ یہ سب اتنی جلدی بھولنے والوں میں سے نہیں تھا۔ لیکن وہ منہ لٹکا کر بیٹھنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس کی انا کا مسئلہ تھا۔ اسے اس کی غربت کا طعنہ ہی نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے والد کا مذاق بھی اڑایا گیا تھا۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا یہ سب۔ لیکن اس کی دلی تمنا تھی کہ باقی گھر والے سب کچھ بھول جائیں اسی لیے جب وہ نیچے آیا تو امی کی آواز سن کر اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"ہوتا ہو۔ میرے متعلق بات کر رہی ہیں کسی سے۔" اس نے جمل کر سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا امی کی ایک ہی سہیلی ہیں جن سے وہ ایسی باتیں کرتی تھیں اور وہ اس کی پھوپھی ہی تھیں۔

"مجھے اس پر غصہ تو آتا ہے لیکن ترس بھی آتا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس نے یہ سب نہیں سوچا تھا لیکن ذہن بہت ہے عطیہ۔ پروں پر پالی نہیں پڑنے دیتا۔ ایسی کھری کھری کی ہے نا اس نے اس ملک کے ساتھ کہ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔" وہ مسلسل بول رہی تھیں اور ان کی آوازیں سارے گھر میں گونج رہی تھیں۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ ذہن تو میں ہوں لیکن اس بات کا ڈھنڈورا پیسنے کی کیا ضرورت ہے۔ امی کے پیٹ میں بھی کوئی بات نہیں بگیتی۔" اس نے اٹنگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے چوکر خود سے کہا تھا اور سامنے پڑا جا رہے قریب کیا تھا۔ میز پر ایک بڑے جار کے اندر خشک میوہ جات اور پائیس ہمیشہ ہی پڑی رہتی تھیں۔ یہ اس کا شوق تھا

اور وہی یہ سب چیزیں لا کر رکھا کرتا تھا۔ جار میں سے ایک چاکلیٹ نکالتے ہوئے اس نے پھرائی کی آواز کی جانب توجہ کی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو عطیہ! مغرور تو ہے لیکن اس کی پروا کرتا ہے۔ دم بہت بھرتا ہے اس کا۔ محبت کرتا ہے اس سے۔ اپنے منہ سے کئی بار تو کہہ چکا ہے۔ وہ بھی سب سمجھتی ہے اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ ماں کی وجہ سے مجبور ہے۔"

ان کی آواز میں بے زاری اور شکوہ ایک ساتھ محسوس ہوا تھا اتش کو۔

"سب کچھ آج ہی بتا دیں پھوپھو کو۔ وہ بھی فون پر۔ کل تو جیسے پانچ سال بعد آئی ہے۔" اس نے جھنجھلاتے ہوئے چاکلیٹ کے دو بڑے بڑے بائٹ ایک ساتھ لیے تھے۔

"لڑکی بہت لاڈلی ہے بھائی اس کی۔ اس کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ جان دیتا ہے اس پر۔ اسی کی خاطر کر رہا ہے سب۔ لیکن تم دیکھ لینا عطیہ یہ لڑکی ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔ یہ قدرت کے اصول ہیں۔ یہ لڑکی اس کا سارا طغیہ خاک میں ملا ڈالے گی۔"

"یا اللہ۔ کیا ہو گیا ہے امی آپ کو۔ کوئی پردہ بھی رکھیں گی اگلیوں اولاد کا یا نہیں۔" اس بار وہ ذرا بلند آواز میں بڑبڑاتا تھا۔ جواب نہایت قریب سے آیا۔ "وہ تمہاری بات نہیں کر رہیں۔ امی کو میرے سلطان کی نئی قسط کا خلاصہ سنارہی ہیں اور امی کے متعلق بحث کر رہی ہیں۔" سونیا کی آواز میں مسخر تو نہیں تھا لیکن کہیں دنی ہوئی ہنسی ضرور ٹھک رہی تھی۔ اتش نے ایک دم مزہ کر دیکھا۔ وہ فریج کی سائنڈ پر لگے سوچ بورڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔ گلوکن ہاتھ میں پکڑے گود میں چھتی دکتی چیزیں پھیلائے جانے کیا کرنے میں مگن تھی کہ اس کو نظر ہی نا آئی۔ اسے اپنے غلط انداز پر پر شرمندگی تو ہوئی مگر اعتراف کرنے میں تو کسی بھی سوا سی انداز میں چوکر بولا۔ "پچھل جبری۔ تم کہاں سے آ گئی ایک دم؟"

ہمیں بھی مرنی ہی کھائی اور جب جب ہم نے دال کھائی۔ آپ نے بھی ہمارے ساتھ وہی کھائی۔ انسان دولت جانیدار ہے۔ روپے پیسے۔ رنگ روپ۔ کام کاج، اونچ نیچ۔ حسب نسب سے نہیں بننے ماسٹر جی! اگر بننے ہوتے تو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری خطبہ ایسا بنا دیا ہوتا کہ برتری صرف تقویٰ کو حاصل ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا ماسٹر جی کہ انسان تو دل سے بنتے ہیں۔ جس کا دل اللہ والا ہے نا۔ پرہیزگار، محبت کرنے والا۔ اخلاص برتنے والا۔ بس وہی انسان ہے اور آپ سے بڑھ کر میں نے کوئی معتبر انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ تو میرا خیر ہیں ماسٹر جی۔ "وہ ان کے شانے دباتے دباتے جانے کیا کیا کہتا چلا جا رہا تھا۔ اسے پتا بھی نا چلا تھا کہ ماسٹر جی کی آنکھیں بالکل بھگ گئی تھیں۔

"چپ کر جا رہا تو ازیا۔ میں بھی بڑا معتبر بنا پھرتا تھا۔ لیکن میں نے اپنی اولاد کو ذلیل کر دیا۔ بڑی بے عزتی ہو گئی میری وجہ سے اس کی۔" ان کی آواز گھونک رہی۔ رب نواز کے تیزی سے چلتے ہاتھ کچھ مدھم ہوئے۔ اس نے کن آنکھوں سے ان کے چہرے کو دیکھنا چاہا جو کہ پشت سے ممکن نا تھا لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے ورنہ اتنا سنجیدہ و رنجیدہ اس نے انہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔

"میرا درزی ہونا میرے بیٹے کے لیے گالی بن کر رہ گیا ہے رب نواز۔ جو میں نے زندگی بھر نہیں سوچا تھا۔ وہ ہو گیا میرے ساتھ۔ میرا بچہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں۔ اکوں اک میرا شہزادہ پتر ایسی ایسی باتیں سن کر آیا ہے کہ دل میں ضرور ہی سوچتا ہوگا کہ اس درزی باپ سے تو اچھا تھا یتیم ہو جاتا۔" ان کا لہجہ اتنا بھگ ہوا تھا کہ رب نواز کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ تڑپ کر ان کے سامنے آ گیا اور ان کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا۔

"مجھے نہیں پتا ماسٹر جی! آپ کے دل میں کیا کیفیت چل رہی ہے۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں یا کیا سوچتے ہیں۔ لیکن میں اس کام سے بے حد خوش

ہوں۔ مجھے اس کام سے زیادہ آج تک کوئی کام اچھا نہیں لگا۔ اس میں بے ایمانی کرو تو فوراً پتا چل جاتا ہے۔ ایک انچ کی غلطی بھی پہلی نگاہ میں سامنے آ جاتی ہے اور پھر ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو لوگ جواب ملتی کرنے آ جاتے ہیں۔ آپ کو ذرا ہی لگا رہتا کہ کہیں کوئی خامی نا رہ جائے۔ یعنی بہت محتاط رہنا پڑتا ہے کیونکہ ایک ایک بخیہ کے لیے آپ گاہک کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ آپ خود سوچیں ماسٹر جی جس کام میں غلطی کی گنجائش ہی نا ملتی ہو۔ اسے تو بہت دھیان سے کرتا ہے نا انسان۔ بہت نیت لگا کر۔ پورے اخلاص کے ساتھ۔ تو پھر ایسے کام میں چار و ناچار حرام کمائی کے مواقع بے حد کم ہو جاتے ہیں۔ یقین کریں ماسٹر جی اس سے زیادہ اعلا کام کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس میں حرام کمائی کے مواقع کم سے کم ہوں۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت آہستہ آہستہ اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

"رہن دے رب نواز یا! وہ زمانہ گیا۔ اب تو درزی ہونا گالی ہی لگنے لگا ہے۔ بھلا بتا دیا کتر پیٹنے والا انسان رشتہ بھی نہیں مانگ سکتا اپنی اولاد کا۔ اتنا گیا گزرا ہوتا ہے درزی۔" وہ لا چاری بھرے لہجے میں بولے تھے۔ اس نے ان کی بات کی تردید کرنے کے لیے سختی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں ماسٹر جی! آپ کتر نہیں ہیں اور کوئی کام بھی کتر یا نہ نہیں ہوتا۔ میں جب مدرسے جاتا تھا تو ہمارے قاری صاحب کہا کرتے تھے کہ جس پیٹے سے بھی انسان کو حلال کمائی ملتی ہوتا۔ وہ چھوٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کمائی کا حلال ہونا شرط ہے۔ پھر چاہے آپ جہاز چلائیں یا سلائی مشین۔ آپ ایک برابر ہیں۔ آپ کی ایک جتنی عزت ہے۔ طیب سوئی سے زخم پوشی کرتا ہے اور دوس سے بارہ دن میں زخم بھرتے ہیں۔ درد جاتا ہے اور درزی سوئی سے ستر پوشی کرتے ہیں اور چند لمحوں میں پردہ ہو جاتا ہے۔ کسی کا پردہ رکھنا تو بڑا ایسی والا کام ہے ماسٹر جی۔ آپ خود بتائیں ستر پوشی کرنا کیا کوئی

ادنیٰ کام ہو سکتا ہے۔ مان لیجیے ماسٹر جی! یہ پیشہ ادنیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہ پردہ داری والا کام ہے۔ آپ لوگوں کی بے لباہی کو لباس فراہم کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ آپ کیوں خود کو کتر سمجھتے ہیں۔ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جو تھے بھی گاتھے، پوند بھی روکیے۔ اینٹیں بھی ڈھوسیں اور بکریاں بھی چرا میں۔ مچھلیاں بھی پکڑیں اور بھیڑیں بھی پالیں۔ انہوں نے تو سارے کام سر اٹھا کر کیے، فخر سے کیے کہ خدا نے کسی کام سے نہیں روکا تھا بلکہ حرام سے روکا تھا۔"

اس نے زک کران کا چہرہ دیکھا پھر زری سے بولا۔ "کوئی بھی کام برا نہیں ہوتا۔ حرام برا ہوتا ہے اس لیے کام کو برا نہیں سمجھتے ماسٹر جی۔ حرام کو برا سمجھتے ہیں۔ حلال کمائی والے سب ہی پیٹے اچھے ہوتے ہیں۔ معتبر ہوتے ہیں۔ سب ہی پیشہ ور لوگ چاہے وہ موچی ہوں یا دھونی۔ مزدور ہوں یا کھار۔ سب ہی محنت کر کے اپنا رزق کشید کرتے ہیں۔ خون پسینہ بہا کر اپنی آل کے لیے کماتے ہیں۔ اس لیے میرے لیے آپ اور میرا پیشہ دونوں بہت معتبر ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں میری بات؟" وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔ ماسٹر جی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے "انٹ" نے ان کے حوصلے کو کافی بلند کر دیا تھا۔ چند دن سے جو بے زاری ان پر سوار تھی چھٹنے لگی تھی۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔ رب نواز ان کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہا تھا

"اتنے دن ہوئے میں نے کوئی میٹھی چیز نہیں کھائی۔ دماغ بند ہو گیا ہے پیرا۔ مجھے کہاں سمجھ میں آئیں گی تیری باتیں۔ پہلے چلی لے کر آ۔ پھر پوچھنا ایسے سوال۔" وہ بولے تھے۔ رب نواز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ابھی لے کر آتا ہوں۔" وہ فوراً ہار ہو کر لپکا تھا۔ "کوئی کام برا نہیں ہوتا۔ حرام برا ہوتا ہے۔" رب نواز کے الفاظ جیسے ان کے گرد پھیلے رہ گئے تھے۔ انہیں یک دم ہر طرف روشنی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

"تمہیں کچھ کہنا ہے؟" انتش نے زمین کے چہرے کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے لٹھ مار انداز میں کہا تھا۔ اپنے لٹھ کی کیچی اور ترشی کو چھپانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ زمین کا حلیہ بتانے کو کافی تھا کہ وہ کس قدر بے چین ہے۔ اس کے چہرے پر آرائش کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ بالوں کو بھی اجڑے مجڑے جوڑنے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ دودھیا رنگ کی سنہری سنہری بنٹوں والی شکنوں بھری شرٹ کے ساتھ میرون ٹراؤزر پہنے وہ بالکل نڈھال سی لگ رہی تھی۔

انتش کے دل کو اسے اس حال میں دیکھ کر بے پناہ سکون ملا تھا لیکن میڈم تہینہ کے ہاتھوں جو بے عزتی اس نے سہی تھی وہ ابھی بھولی نہیں تھی اسے اور کبھی بھولنے والی بھی نہیں تھی۔ وہ جان بوجھ کر مقرر کردہ وقت سے کچھ تاخیر سے اس کافی شاپ میں پہنچا تھا جہاں زمین نے اسے آنے کے لیے کہا تھا اور آتے ساتھ ہی اس نے جیسے پلکار کرنے والے انداز میں گفتگو شروع کر دی تھی جو کہ زمین کی توقع کے برخلاف تھا۔

"میں کہوں؟" اس کے چہرے پر طنز کی پرچھائیاں چمکی تھیں پھر بات کو مزید بڑھاتے ہوئے استہنامیہ انداز میں کہنے لگی۔

"کیا مجھے کچھ کہنا چاہیے؟" اس نے انتہائی نڈا مان کر "کچھ" پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ چونکہ اس نے خود رابطہ کر کے صلح کی پہل معذرت کر لے گا اور جیسے چیزیں ایک خراب دن نے بگاڑ ڈالی تھیں ویسے ہی ایک اچھا دن سب معاملات کو سدھار دے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

انتش چند ثانیے تو مسترخانہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر کرسی پر پیچھے ہو کر بیٹھے ہوئے بولا "ارے نہیں۔ تم کیوں کچھ کہو گی بھلا اور باقی بیجا ہی کیا ہے کہنے کے لیے۔ سب کچھ کہہ تو دیا تھا

تمہاری والدہ محترمہ نے۔ "زمین نے اس کے بلند لہجے پر خائف ہو کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ لہجے کا وقت تھا اس لیے نوڈ کورٹ میں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بڑھنے لگا تھا۔

"ماما نے ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا کہ تم آؤٹ آف کنٹرول ہی ہو گئے اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ کتنی انسٹل ہوئی ہے تمہاری وجہ سے میری۔ تمہاری وجہ سے کتنی باتیں سنی پڑی ہیں مجھے "زمین ضبط سے کام لیتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی کہ انتہا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہاری انسٹل۔" وہ ایک بار پھر غرا کر بولا۔ "زمین بی بی انسٹل میری ہوئی ہے۔ میرے پیرنٹس کی ہوئی ہے۔ تم کھانے کی بات کر رہی ہو۔ ہم سے تو وہ چائے ختم نہیں ہو رہی تھی جو تمہاری والدہ محترمہ نے احسان جتاتے ہوئے سامنے رکھ دی تھی۔ ان کا انداز دیکھا تھا تم نے اور پھر بھی تم مجھ سے شکوہ کر رہی ہو۔ ایک نظر ان کے رویے پر بھی غور کر لینا تھا ذرا۔" وہ سخت ناراض لہجے میں کہتے کہتے ایک لمحہ کے لیے زکا پھر بولا۔

"معاف کرنا زمین لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی....." وہ جان بوجھ کر لفظ "ال میزڈ" کہتے کہتے زک گیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات نے زمین کو بخوبی یاد کروادیا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ اسے بے حد برا لگا لیکن انتہا مزید کہہ رہا تھا "تم ان کی غلطیاں نکالنے کے بجائے ذرا اپنے رویے کی بھی وضاحت کر دو۔ تم نے کتنی بدتمیزی کی تھی ان کے ساتھ۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ سی ہوئی۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی بلکہ انہوں نے کی۔ تم خود سوچو کہ وہ کس قدر تشکیک کے ساتھ میرے پیرنٹس سے پیش آ رہی تھیں۔ ہم خود نہیں آئے تھے۔ بلوائے گئے تھے اور وہ ہم سے لپٹا سلوک کر رہی تھیں جیسے ہم زبردستی ان کے گل میں گھس آئے ہوں۔ چار بار انہوں نے مجھ اوپر سے نیچے دیکھ کر

پوچھا ہوگا کہ ماسٹر جی یہ واقعی آپ کا بیٹا ہے اور پھر یہ سوال کرتے ہوئے وہ مسخرانہ انداز میں چہمیں دیکھ دیکھ کر ہنسی کیوں تھیں۔ مجھے کیا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جتنا چاہ رہی تھیں۔ تین بار انہوں نے انتہائی طنزیہ انداز میں مجھے "پیارے افضل" کہا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں کیا مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کب تک برداشت کرتا میں۔ ہاں بھی مان لیا بہت امیر ہیں وہ۔ بہت پیسہ ہے ان کے پاس۔ لیکن یاد رہے میں بھی پھونک مار کر اڑایا جانے والا جہاز نہیں ہوں۔" وہ انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرنے والے انداز میں کہتا ہوا ایک بار پھر زکا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ ایسی تحقیق تو اس نے کبھی ناسی تھی۔

"کتنی چمک محسوس ہو رہی تھی مجھے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ اپنی امی اور ماسٹر جی کے سامنے۔ یہ کوئی بات بھی کرنے والی کہ مجھے انسانوں کی بالکل صحیح پرکھ ہے۔ میں تو انسان کا چہرہ دیکھ کر ہی بتا دیتی ہوں کہ وہ منسلکی ہے یا چوڑا۔"

انتہا کوئے سرے سے جیسے سارے حساب کتاب یاد آ گئے تھے۔ زمین نے گہری سانس بھر کر توانائی جمع کی۔ وہ تو اس کے سامنے جیسے پختاوت لگا کر بیٹھ گیا تھا اور جب جرح شروع ہوئی گئی تھی تو بہتر تھا کہ ساری جمع تفریق ابھی ہی کر لی جاتی۔

"تم نے بھی کوئی کر نہیں چھوڑی تھی انتہا! کتنا روڈ لی جواب دیا تھا تم نے انہیں کہہ رہے بھی دیں مسز تہینہ آپ ذات برادری کی بات کرتی ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو در پڑھے دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتے کہ آلودہ کون سا ہے اور مولی والا کون سا۔ آپ پہچانیں گی لوگوں کو۔" اس نے جتا کر کہا تھا۔ انتہا کے چہرے پر ہلکا آمیز سکراہٹ مزید بڑھ گئی تھی۔

"یہی برقیٹ جواب تھا۔ ان کو بھی پتا چلنا چاہیے تھا کہ ایل وی سیٹھانی نہیں ہیں شہر کی۔ ہم جچی گئے جاتے ہیں معززین میں۔ اگر آدھا شہر ان کی

تعظیم میں جھکتا ہے تو باقی آدھا ہمیں بھی سلام کیے بغیر آگے نہیں جاتا اور وہ ہمیں کس طرح ٹریٹ کر رہی تھیں جیسے سارے تھانوں میں ہماری ہی تصویریں تو لگی رہتی ہیں۔" وہ ہر جملہ ایسے ادا کرتا تھا کہ زمین کوئے سرے سے بات کرنی مشکل ہو جاتی تھی۔ "تم کسی باتیں کر رہے ہو انتہا! تمہیں تو ذرا بھی افسوس نہیں ہے اپنے رویے پر۔" وہ زچ سی ہوئی۔ اس کا خیال تو تھا کہ انتہا شرمندہ ہوگا مگر یہاں صورت حال ہی مختلف تھی۔

"افسوس کس بات کا۔ میں نے خود سے کسی چیز کا آغاز نہیں کیا۔ اتحاد تمیز نہیں ہوں میں۔ طبل جنگ انہوں نے بجایا تھا اور پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں میں۔ اب معرکہ ہوگا اور بھر پور ہوگا۔ میں نے جو بھی کہا وہی کہنا چاہیے تھا مجھے اور تم مجھے لڑنے کے بجائے ان کی ٹریننگ پر زور دو۔ انہیں سکھاؤ کہ تمیز سے بات کیسے کی جاتی ہے۔ گھر آئے ہوئے مہمانوں کو کیسے ٹریٹ کیا جاتا ہے اور شادی جیسے سینیٹیو ایٹو (حساس مسئلہ) ریسکنڈ یارٹی سے گفتگو کرنے کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ کیوں سیکھیں گی۔" وہ تو میڈیم تہینہ ہیں۔ دامیڈم تہینہ! اس نے انتہائی بدتمیزی سے کہا تھا۔ زمین کو بہت برا لگا۔ ایسی بدتمیزی اس نے انتہا کو پہلے کرتے نہیں دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔

"تم تو تم بھی نہیں ہو انتہا! اور سیکھنا تو تمہیں بھی بہت کچھ چاہیے۔ سب سے پہلے تم یہ سیکھو کہ اس طرح کے معاملات میں جھوٹ نہیں بولا کرتے۔" انتہا نے غر کر اس کی بات کاٹی۔

"جھوٹ؟ میں جھوٹ نہیں بولتا زمین صاحب!" "تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تمہارے قادر پھر نہیں بلکہ....." وہ جان بوجھ کر چپ ہوئی جیسے منہ سے مزید کوئی لفظ نکلا تو زبان داغ دار ہو جائے گی۔ "انتہا کے چہرے کے تیور مزید جارحانہ ہو گئے۔

"بلکہ..... کیا بلکہ؟ بات پوری کرو نا۔" اس

نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"میں ابھی تک شاک میں ہوں انتہا! میں تو تمہارے قادر کو بہت عالم فاضل سمجھتی تھی اور وہ تو درزی ہیں۔" اس نے انتہائی تحقیر آمیز انداز میں اگل ڈالا تھا۔ یہی بات تو اس کی سب سے بڑی پریشانی بنی ہوئی تھی۔ "تم سوچو تو سہی کہ میری اپنی پوزیشن کتنی آکورد ہوئی ہے ماما کے سامنے۔ میں تو ماما کے سامنے شرمندگی سے سر نہیں اٹھا پارہی۔ تمہیں پتا ہے وہ ہمارے خاندانی درزی ہیں۔ سب جانتے ہیں انہیں۔ ہمارا سارا خاندان ان کے ہاتھ کے سٹے کپڑے پہنتا ہے۔ شادی بیاہ پر چھ مہینے پہلے سے ہم اپنے کپڑے ان کی شاپ پر دے جاتے ہیں۔ میری پچھوکی شادی کا، میری خالہ کی شادی کا۔ چچی کی شادی کا اور جتنی بھی میری کزنز ہیں نا۔ ان کی شادی کے لپٹے ماسٹر جی کی شاپ پر سلائی ہوئے ہیں۔ سارا خاندان ماسٹر غلام حسین سے واقف ہے۔ سب کو پتا ہے کہ وہ درزی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی تھی

"اور..... بات مکمل کرو زمین۔ کیا اور....." انتہا نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیز دھار آئے جیسی کاٹ تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں کہ زمین کو اس سے خوف آیا۔

"اور تم ایک درزی کے بیٹے ہو انتہا! یہ بہت شاکنگ ہے میرے لیے۔ ماما تو ایک اسکول بچہ کے بیٹے کے لیے راضی نہیں تھی اور یہاں تو معاملہ ہی شادی۔ ہمارے خاندان میں بھی نا بھولنے والا واقعہ بن جائے گی۔ تمہیں یہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی۔" وہ روٹا ہوا ہو کر بولی تھی۔ انتہا کو جیسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ ماسٹر جی کا غریب ہونا نہیں بلکہ اصل میں "ماسٹر جی" ہونا سارے فساد کی جڑ تھی۔

"ایک سکول زنی! درزی ہونا کوئی گالی نہیں ہے اور میں نے کبھی چھپایا بھی نہیں تھا۔ انتہا کہتے ہیں مجھے۔ دو غلام بن جتا نہیں مجھ پر۔ ہمیشہ بتانا تمہیں کہ میرے

والد کو زمانہ ماسٹر جی کہتا ہے بلکہ میں تو خود انہیں ماسٹر جی ہی کہہ کر پکارتا آیا ہوں۔ "وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

"یہی تو غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں سمجھ کیوں نہیں پائی کہ تم اپنے فادر کو ماسٹر جی اُس وجہ سے نہیں بلکہ اُس وجہ سے کہتے ہو۔" وہ خود ہی اپنا موقف ٹھیک سے بیان نہیں کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود انٹش اس کی بات بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"تم اُس کہو یا اس کہو۔ وہ میرے باپ ہی رہیں گے اور مجھے ان پر فخر ہے۔ بخدا زمین مجھے پتا نہیں تھا کہ تمہارے لیے مجھ سے زیادہ میرے باپ کا پریشانی میٹر کرتا ہے۔ مجھ سے زیادہ تمہارے لیے اس بات کی اہمیت ہے کہ میرے باپ کیا کرتا ہے ورنہ میں تمہیں ہر روز تاکید سے بتایا کرتا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اتنی سی بات سے تمہارا سارا عشق اڑ چھو ہو گیا یعنی درزی کے بیٹے سے محبت کرنا بھی گناہ ہو گیا لوگوں کے لیے۔ واہ۔" اس کا لہجہ آج دینے لگا تھا۔ اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو چکی تھیں۔ زمین کو اسے دیکھ کر بھی ڈکھ ہوا تھا۔

عشق اڑ چھو نہیں ہوا انٹش! یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم..... "وہ رو ہی پڑی تھی۔ انٹش نے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ سجا کر ہنکارا بھرا۔

"اونہ..... نی لی آپ وہی ہیں نا۔ جو محبت کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتی تھیں۔ میرے ساتھ گولا گنڈا کی ریز بھی لگانے کو بھی تیار تھیں اور اب اس بات سے خائف ہیں کہ میرا باپ ایک درزی ہے اور باپ دا وے اگر کسی کا باپ درزی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی کی ماں کو بے عزتی کرنے کا لائسنس مل جائے۔ درزی ایک پیشہ ہے۔ گالی نہیں ہے۔"

"اس انداز میں بات نہیں کرو انٹش۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے میرے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل ہو گیا ہو۔ محبت کرتی ہوں میں تم سے۔ بے پناہ محبت لیکن تم میرا پوائنٹ آف ویو بھی تو سمجھو۔ میرا سارا خاندان میرا مذاق اڑائے گا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر

بولی اور پھر ضبط کے سارے بندھن جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی تھی۔ انٹش کے دل کو کچھ ہوا۔ اتنے دن سے وہ بھی تو کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ کوئی سراہی ہاتھ نا آتا تھا کہ ہوا کیا۔ وہ مالی حیثیت میں ان سے کم تھے لیکن پھر بھی اس سلوک کے مستحق نا تھے۔ آج اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ اصل بات تو یہ "تھی۔ اس نے زمین کے ہچکیاں لیتے وجود کی جانب دیکھا۔ وہ اس سے دامن نہیں چھڑوا سکتا تھا۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی دوبارہ بھی شکل نا دیکھنے کے، اس سے بات نا کرنے کے سارے دعوے دھڑلے کے دھڑلے رہ گئے تھے۔

"اب رونا تو بند کرو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔ پلیز زمین۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ انٹش کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے روتی رہو۔ میری ذات کے وہ پرچے جو تمہاری اماں نے بچا دیے تھے، وہ تم اڑا ڈالو۔"

اس کے رونے سے اتنا اطمینان تو ضرور ہوا تھا کہ دل میں اس کی محبت کا یقین مزید پختہ ہو گیا تھا۔ یہ احساس ہو گیا تھا کہ نقصان دونوں کا ہی ہوا تھا۔ دونوں ہی عشق کی آتشزدگی کے متاثرین میں سے تھے۔

☆☆☆

"ممائی جان! میرا دل چاہ رہا ہے پکڑوے بنانے کو۔ بتالو؟" اس نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ ٹی وی پر کوئی سیریل لگائے نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سوال پر انہوں نے اس کی جانب دیکھے بناتی میں سر ہلا دیا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔ دس دن ہو گئے تھے زمین والے واقعہ کو لیکن ان کے گھر کی صورت حال ابھی تک نارمل نا ہو سکی تھی۔ ماسٹر جی تو بالکل ہی — گم صم ہو گئے تھے۔ انٹش کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ آفس کے لیے بھی جلدی نکل جاتا تھا اور واپسی پر بھی تاخیر

سے آنے لگا تھا۔ سونیا خود بھی اپنے کمرے میں محدود رہنے لگی تھی کہ کہیں ممائی جان اسے بھی کھری کھری نا سنا دیں لیکن وہ اس صورت حال سے اکتا رہی تھی۔ سب ہی نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ہو نہیں رہے تھے۔ اسے اس تناؤ والی کیفیت سے الجھن ہونے لگی تھی تب ہی اس نے ممائی جان سے کچھ بنانے کی فرمائش کر ڈالی تھی تاکہ ذرا ہلکا کیا جاسکے لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح بیٹھی رہی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اسے گھور رہی تھیں۔

"اگر پکڑوے بھی اجازت لے کر ہی بنانے ہیں تو بہتر ہے بناؤ۔" وہ طنز نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں سونیا کا اتنا تکلف اچھا نہیں لگا تھا جبکہ سونیا ان کے لہجے سے پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟" اس نے پوچھ لی لیا، انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"تم سے کیوں ناراض ہونے لگی بھلا۔ تم سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں میں بلکہ تمہاری جانب سے تو دل کو مزید سکون ہو گیا ہے کہ جو لڑکی میرے بیٹے کی مدد کے خیال سے جھوٹ بول سکتی ہے۔ وہ جب بیٹے کی مدد کرنے کو جھج بولا کرے گی تو اس گھر میں کتنی برکت ہو جائے گی۔ میں تو شکر ادا کر رہی ہوں کہ ابھی عطیہ کو اس پر دیگر ام کی خبر نہیں دی تھی ورنہ بات بنانی کتنی مشکل ہو جاتی۔"

ان کے لہجے میں اس قدر یقین اور بھرپور تھا کہ لہجہ کو سونیا کچھ بول نا سکی پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا کچھ کہنا بہت ضروری ہے تو سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں ممائی جان۔ بات یہ نہیں۔" انہوں نے اس کی بات کاٹنے میں لہجہ بھی نہیں لگایا تھا پھر اس کی بات کو قطعی رد کرتے ہوئے بولیں۔

"میں جانتی ہوں بات یہ نہیں تھی۔ بات وہی تھی جو میں کہہ رہی ہوں کہ تم تو صرف انٹش کی مدد کرنا چاہ رہی تھی اور کچھ کہوں تو ناراض میں انٹش سے بھی نہیں ہوں ہماری تو ہیں تو جو ہوئی سو ہوئی لیکن اس

نے اپنی متوقع ساس کے ساتھ اس روز جو کیا ہے نا، اس نے میرے دل کو عجیب سا سکون بخش دیا ہے ورنہ اس کے ہر طعنے کے جواب میں ماسٹر جی کی خاموشی مجھے غصہ دلارہی تھی۔ ماسٹر جی کے دل میں بڑی عزت تھی میڈم صاحبہ کی لیکن وہ اب نہیں پوچھنے والی ان کو۔ تم دیکھنا مہنازا کا کہا کبھی غلط نہیں ہوتا۔ جی دینا تو دور کی بات۔ وہ اب انہیں سلائی کے لیے ساڑھیاں ہلاؤ نہ تک نہیں دینے والی۔ خیر چھوڑو سب کو۔ تم بتاؤ جھوٹ بولا تھا تا تم نے مجھ سے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" انہوں نے اس قدر یقین لہجے میں کہا کہ سونیا گڑ بڑا ہی گئی۔

گزشتہ بار بھی ان دونوں کے درمیان یہ موضوع اوجھڑا رہا تھا۔ سونیا اس متعلق زیادہ تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس نے یہ ساری بات ابھی تک اپنی اسی کو نہیں بتائی تھی بلکہ اس نے مہنازا بیگم کو بھی یہی کہا تھا کہ وہ اس متعلق ابھی اس کی امی سے بات نا کریں۔ اگر اس کی امی کو ذرا سی بھی بھینک پڑ جاتی تو ان کا خفا ہو جانا بھی لازمی امر تھا۔ وہ واقعی کسی کو پسند کرتی ہوئی تو شاید بولا کہہ بھی دیتی لیکن اس موضوع پر مسلسل جھوٹ بولنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اس بات کو طول دینا اس لیے بھی برا لگتا تھا کہ اس سے اس کی ماں کی تربیت پر حرف آتا تھا۔ اس کا اس بات پر عمل ایمان تھا کہ کسی کو پسند کرنے میں کوئی برائی نہیں ہوتی لیکن اس معاملے میں جھوٹ بولنا یا والدین کو اندھیرے میں رکھنا غلط تھا سو ایک ماموں کے بیٹے کی خاطر وہ اپنی ماں کو ان کی بچپن کی سہیلی کے سامنے شرمندہ نہیں کروا سکتی تھی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ممائی پرانے خواب دیکھنے میں کسی جھلٹ کا شکار ہوں سو اس نے بات بنائی چاہی۔

"آپ ابھی بھی غلط سمجھ رہی ہیں ممائی جان۔ میں واقعی....." اس نے جھلٹ کہنا چاہا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ممائی جان دوبارہ سے اس کی اور انٹش کی شادی کے خواب دیکھنے لگیں اسی لیے وہ ایک من گھڑت نام لینے کو تیار ہی بیٹھی تھی کہ انہوں نے اس

کی بات کاٹ دی۔

"یعنی ابھی بھی اعتراف نہیں کرو گی کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ لیکن خیر جاؤ بٹالو پکڑو۔۔۔۔۔ پکڑو بٹالو مجھے احمق بنانے سے تو زیادہ ہی اچھا کام ہے۔" وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ مہناز بیگم دوبارہ سے لی دی کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

"اور ہاں وہ میرے برخوردار بھی موجود ہیں آج۔ ان سے بھی پوچھ لو کہ تم بھانکنے سے فرصت مل گئی ہو تو کچھ کھا پی لیں۔" اسے باہر لکھا دکھ کر انہوں نے کہا تھا۔ سونیا خاموشی سے بچن کی جانب آگئی تھی۔

☆☆☆

"کہاں ہے آری ہے تشریف؟" زرین کی ماما نے اسے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر دور سے ہی کہا تھا۔ وہ پارلر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ گہرے گریبان کے سادہ سے شلوار میں کپڑے کاؤچ پر بیٹھی موبائل سے کھیلتی ہوئی وہ جانے کس کا انتظار کر رہی تھیں۔ زرین نے کوشش کی کہ چپ چاپ لاؤنج کی سیڑھیاں چل کر اسے کمرے تک چلی جائے لیکن انہیں دیکھتے ہی سوال پادیا تھا۔

"نمیرہ کی طرف گئی تھی۔" اس نے سادہ سے انداز میں جواب دیا۔ اس کا دل آتش سے ملاقات کے بعد کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سارے مسئلے کا کوئی حل جلد ہی نکال لے گا۔ مسئلہ حل تو نہیں ہوا تھا لیکن دل ضرور مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ کافی دن بے چین رہنے کے بعد آج ہی ذرا پرسکون ہوئی تھی اور اس کا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ میڈم تہینہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ باہر جانے سے پہلے مجھے بتا کر جانا۔ ایک بار کی بات تمہیں بھی سمجھ نہیں آتی؟" وہ ناراضی بھرے لہجے میں گلہ کر رہی تھیں۔

"میں نے آپ کو تلاش کیا تھا لیکن آپ شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔" اس نے ابھی بھی محل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی اس میں اسے سب سے زیادہ انہی کی ضرورت تھی اور وہ

اس کا خیال رکھ بھی رہی تھیں لیکن وہ اس کی جانب سے مشکوک بھی رہتی تھیں۔ "میں کہاں گئی ہوئی تھی۔ میں تو کہیں جاتی ہی نہیں ہوں۔ تمہاری وجہ سے سارا دن گھر میں رہتی ہوں کہ میری بیٹی کو آج کل میری سب سے زیادہ ضرورت ہے جبکہ تم۔۔۔۔۔" انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی پھر آنکھیں پکڑ کر اسے دیکھا۔ "اسی کم بخت سے ملنے لگی تھی نا۔" انہوں نے جتاتے ہوئے اسی انداز میں شکوہ کیا تھا۔

زرین نے ان کا چہرہ دیکھا۔ اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا تھا اور اس کی مٹی کو اس کے چہرے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کچھ رہی ہیں وہی حقیقت ہے۔ ان کے چہرے پر پھیلے تاؤ میں مزید اضافہ ہوا۔ "واقعی؟ ہیں زرین؟ اسی کہنے سے مل کر آئی ہو؟" وہ حیران و پریشان اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی بھی خواہش کے باوجود کچھ بول نا مانی تھی۔ ان سے بھی کس بنیاد پر بحث کرنی۔ اگرچہ آتش نے تسلی دی تھی لیکن وہ اپنا تصور سمجھنے اور تسلیم کرنے کو تیار نا تھا نا ہی زرین اسے یہ بات سمجھا پا رہی تھی کہ اس کے والد کا پیش اس کے لیے بے حد تنگ آ رہا تھا۔ وہ ایک درزی گھر انے کی بہو کس طرح جن سکتی تھی۔ وہ تو اپنی اُن کزنز کی تنقید کرنے میں سب سے آگے رہتی تھی جن کی شادیاں الگ گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ اسی لاؤنج میں بیٹھ کر جانے کس کس کا کس کس بات پر مذاق اڑاتی رہی تھیں دونوں ماں بیٹی۔ اپنا جاہ جلال، حسب نسب انگلیوں پر کنا کنا کرتیوں کی منی اسی لاؤنج میں بیٹھ کر پلید کرتی آتی تھیں وہ۔

فلاں قصائی کا بیٹا۔ فلاں دھونی کا۔ فلاں نے جولاہوں میں بیٹی دے دی اور فلاں کہاروں کے یہاں بیٹی بیٹی ہوئی جارہی ہے۔ سر اٹھا کر، گردن تن کر ایسی باتوں پر جانے کتنے لوگوں کی بے عزتی کرتی رہتی تھیں وہ۔ زرین کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میڈم تہینہ نے سر پیٹ لیا تھا "زرین! تجھے کب عقل آئے گی۔ کب تو سمجھ

گی کہ تیری ماں تیری دشمن نہیں ہے۔ چھوڑ دے اس کا پتھا۔ کچھ ہاتھ نہیں آنے والا تیرے۔ کیوں نہیں جھٹکتی تو۔۔۔۔۔ وہ کنگلا ہی نہیں کی (کم ذات) بھی ہے اور اوپر سے شکل بھی اچھی ہے چھوٹنر کی۔ وہ جو چار پیسے کمائے گا نا۔ وہ بھی اپنی کریموں لوشنوں میں ضائع کر دیا کرے گا۔ چلو روپے پیسے کی پھر بھی خیر ہے۔ جو میرا ہے، وہ بھی تیرا ہی ہے۔ پورا کرنی رہوں گی تیرا۔۔۔۔۔ لیکن خاندان والوں کو کیا منہ دکھائے گی۔ کیسے سامنا کرے گی ان کا۔ کیسے برداشت کرے گی ان کے طعنے۔ وہ تو باتیں سنا سنا کر تیرا جینا دو بھر کر دیں گے۔ زرین، تیرے تائے چاہے کی بیٹیوں نے ہی طعنے دے دے مار دینا ہے تجھے اور پھر وہ تیری خال جواتے چاؤ سے اپنے دپور کا رشتہ لاتی تھی۔ اس دنگے کے درزی کی اولاد کو دیکھ کر اس کی تو نظر ہی ہی کچا کھا جائیں گی تجھے۔ کیسے برداشت کرے گی۔" وہ تو دہائیاں دینے لگی تھیں۔

زرین نے ان سب باتوں پر پہلے ہی کافی سوچ بچار کی ہوئی تھی اور سوچ سوچ کر ہی اس کی یہ حالت ہوئی جارہی تھی۔ اس کے آگے کتواں تھا تو کچھ بھی کھا نہیں بھی بلکہ کھائیاں تھیں۔ وہ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ میڈم تہینہ اپنی جگہ چھوڑ کر آگے آ کر اس کے قریب آئیں۔ وہ ناراض تو تھیں اس سے لیکن اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی آہ و زاریاں بھی برداشت نا ہوئی تھیں ان سے۔

"ہا۔ میری بیٹی! روتی کیوں ہو۔ رونے سے کیا ہو جائے گا۔ مت رو میری جان!" وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر اسے پکارتے لگی تھیں۔ زرین اتنی سی تسلی پا کر مزید رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو جھنسنے کا نام ہی نا لیتے تھے۔

"میں ہوں نا میری بیٹی! میں سنبھال لوں گی۔" دفع کر اس کنگلے کو۔ اچھا ہوا جان چھوٹ گئی۔ "انہوں نے اس کی پشت چھتائی تھی۔" "می! میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا ایسا۔ اب کیا کروں گی

میں۔ میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔ مرنے جاؤں گی می! اور یہ بھی کیسے برداشت کروں کہ وہ درزی کا بیٹا ہے۔ دماغ پھٹ جائے گا میرا می۔ پلیز کوئی سلوشن نکالیں می۔" اس نے ہچکچاہٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔ میڈم تہینہ کی پیشانی پر تیوریاں بڑھ گئیں۔ "لفٹے ای منہ اس اندھے عشق کا۔" انہوں نے منہ بگاڑ کر خود سے کہا تھا۔ زرین کی تو ایسی حالت ہی نا تھی کہ اسے مزید کچھ کہا جاتا۔ وہ بس اس کی پشت چھتھاتے ہوئے آتش اور اس کے خاندان کو کونے لگی تھیں۔

☆☆☆

"میں سمجھ رہی تھی کہ تم آج کل بس جگجگت سنگھ کی غزلیں سن سن کر وقت گزارتے ہو گے" سونیا نے پکڑوں اور کچھ اپ والی ٹڑے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس میں دو چائے کے کپ بھی موجود تھے۔ آتش کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل تھے۔ اپنی امی کی توقع کے برعکس وہ غم بھانکتا ہوا تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ دو فلور کشن اپنے نیچے اور دو پشت پر نکائے وہ بی وی پر ٹیم لگائے بیٹھا تھا اور مسلسل اسی میں گن تھا۔ کمرے میں کوئی وحشیانہ قسم کا چگانا بھی نہ رہا تھا جس کی سونیا کو بالکل سمجھ نا آتی تھی۔ اسی لیے اس نے مذاق میں کہہ دیا تھا۔

"جگجگت سنگھ کی غزلیں سنیں میرے دشمن۔" اسے ہاتھ کے اشارے سے دائیں جانب بڑے سنگل کاؤچ پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے وہ سخت سے بولا تھا۔

"تمہارا مطلب زرین کی مدر؟" سونیا نے جڑانے کو کہا تھا اور وہ چوہی گیا۔ چہرے کے تاثرات نا گوار ہو گئے تھے۔

"دیکھو چار فٹ دس انچ۔ میرا موڈ بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر تمہیں گوارا نہیں تو وہ دروازہ ہے۔ سڑی ہوئی باتیں کرنے سے بہتر ہے اس دروازے کو استعمال کر لو۔ باقی تم خود سمجھ دار ہو۔" سونیا کچھ کہنا جا رہی تھی لیکن اسے ہنسی آگئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اب آتش کے

"یہ کیا کیا لڑن؟" وہ سخت تاؤ کھا کر بولا۔
 "بدشیر۔" سونیا نے اطمینان سے چائے کا
 کپ ہونٹوں سے لگا کر کہا تھا۔ اشش نے منہ ہنایا۔
 "ادھرہ تم یہی کر سکتی ہو۔"

کیسی دلچسپ سی ہنسی تھی اس کی۔۔۔ کھن کھن کرتے نرم ہاتھوں میں رُس سیا گھول گئے۔۔۔ آتش نے یہ بات پہلے بھی محسوس کی تھی کہ خدا نے اسے بہت خوب صورت ہنسی سے نوازا تھا۔ ننھے ننھے ترتیب سے قطار میں بچے دانت ڈرا سا مسکرانے پر ہی نمایاں ہونے لگتے تھے اور یہاں وہاں رنگ سے بکھر جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا ننھے ننھے جلیبو، تھلیاں

"تم نے شاید وحیان نہیں دیا کہ وہ لمبا بھی ہے، جمہاری طرح اوز میں کسی لمبے لڑکے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ ساری زندگی چار فٹ دس انچ کی طعنے سننے کو ملتا رہے گا۔" وہ عام سے انداز میں کہتی تھی۔ آتش نے ایک بار پھر بغور اس کا چہرہ دیکھا

”مجھے کسی گھوڑے والے شہزادے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود شہزادی ہوں۔ میں اپنا گھوڑا دوڑانا خود سیکھ لوں گی۔“ وہ پھر غم سے لہجے میں بولی تھی۔ انہیں نے انتہائی دلچسپی سے اس کے چہرے پر پھیلے استحکام کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی کسی چھوٹی سی جلی تھی لیکن

خواب پہاڑوں سے اونچے دیکھتی تھی۔ اس کے دل میں گدگد سی ہوا تو کہا تھا۔

"سیرجی پر چڑھنا بھی سیکھ لینا کیونکہ گھوڑے پر چڑھنے سے پہلے تمہیں سیرجی پر چڑھنا پڑے گا۔" وہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس کے چھوٹے قدر پر چوٹ کی تھی۔ سونیا مسکرائی تک نہیں لیکن چہرے پر پھیلا استحکام مزید وسیع ہو گیا۔

"تم نے بھی اونٹ کی سواری کی ہے؟" وہ اس کے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی پھر مزید بولی۔

"جب اونٹ پر سواری کرنی ہوتی ہے تو سیرجی نہیں لگائی جاتی بلکہ اونٹ کو سببہ حالیا جاتا ہے۔ اونٹ جب دیکھتا ہے کہ کوئی اس پر سوار ہونا چاہتا ہے تو وہ نیچے ٹھک کر یہ موقع فراہم کرتا ہے اور پہلے خود زمین پر بیٹھ جاتا ہے تاکہ سوار ہونے کا خواہش مند آسانی سے سوار ہو سکے۔ سمجھ رہے ہو میری بات۔" وہ اس سے ایک اور سوال کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ سونیا کی آنکھوں میں عزم مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اتنا گہرا کہ آتش کو اپنے چہرے پر اس کی پیش محسوس ہوئی۔

"تم میری فکر مت کرو آتش! مجھے گھوڑے کو اونٹ اور اونٹ کو گھوڑا بنانا آتا ہے۔ وقت آنے دو میں اپنے گھوڑے کو اونٹ بنا لوں گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ آتش اس عزم کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک چیز تھی جس میں وہ بہر حال وہ سونیا سے بہتر تھا، باتیں بنانا اسے خوب آتی تھیں۔

"او نہہرا! وہ دن ڈبا۔ جدوں گھوڑی چڑھیا گہا۔ (وہ دن بھی نہیں آئے گا جب یہ خواب پورے ہوں گے)" اس نے آخری پکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

"ماما تم سے ملنا چاہتی ہیں آتش!" زمین نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے جھجک کر کہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ فوراً انکار کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

"زہے نصیب! بتاؤ کب ملنا چاہتی ہیں، ویسے بھی کافی دن ہو گئے کوئی مزاحیہ سو دی نہیں دیکھی۔ مزا آئے گا۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے اطمینان سے بولا تھا۔

انہوں نے باری کیو کا آرڈر دے رکھا تھا اور گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کر رہے تھے۔ زمین کے کال کر کے ڈرائیو سٹارٹ کرنے کی پیش کش سے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہوگی۔ اسے یہ بھی لگتا تھا کہ وہ اسے دوبارہ سے اپنی کمی سے ملنے کے لیے مجبور کرے گی، اس لیے وہ مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب کی بار وہ اس کی کمی سے ملنے وقت خود کو پرسکون رکھے گا اور ان سے بد نظیری نہیں کرے گا۔ اسے اس بات کا بہت حوصلہ اور اطمینان تھا کہ زمین کا دوت اس کی طرف تھا۔ وہ کچھ بھی کہہ نہیں زمین اس کا ساتھ دینے والی تھی اور اس امر نے اس کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

"تم ایسے کیوں ہو آتش؟" وہ اس کے انداز پر الجھ کر بولی تھی۔ آتش نے کندھے اچکائے۔

"یہ بات تو مجھے بھی حیران کرتی ہے لیکن بچپن سے ہی ایسا ہوں۔ ہینڈسم اسارٹ، دل موہ لینے والا، نیندیں خرا لینے والا۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولا تھا۔ زمین کو اس کا انداز بالکل اچھا لگا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ صورت حال اتنی پیچیدہ ہے۔ اس کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی جبکہ وہ ہنستا کھلکھلا تا روتا زہ اس کے سامنے بیٹھا ٹھنڈے لگا رہا تھا۔

"آتش خدا را سیریس ہو جاؤ۔ صورت حال کو سمجھو۔ ہر معاملے میں نان سیریس نیس (غیر سنجیدگی) اچھی نہیں ہوتی۔" وہ ناراض سے لہجے میں بولی تھی۔

"اچھا جی۔ فرمائیے کیا کروں۔ دوپٹا لے کر مصلے پر بیٹھ جاؤں؟" وہ جھمی اسی انداز میں بولا تھا۔ اس کا مقصد صرف زمین کو چوانا تھا تاکہ وہ ہنس دے اور اس کے اعصاب کچھ دیر کو پرسکون ہو جائیں۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ آج بھی سادہ تھا حالانکہ یونیورسٹی میں وہ بھی بنا

میک اپ کے نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے چلتے نمایاں تھے اور ایک عجیب سی ویرانی اس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ زمین نے چند ساتیں اس کا چہرہ دیکھا پھر اس کے گال پر دو آنسو لڑھکے تھے۔ آتش نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مائی گاڈ۔ رونے لگی ہو؟" وہ اب اس کی جانب مڑ چکا تھا۔ زمین کے گالوں پر مزید کئی آنسو لڑھک کر اس کی گود میں پڑے ہاتھوں پر گرے تھے۔ آتش کی آنکھوں نے اس کی آنکھوں سے گالوں اور پھر ہاتھوں تک کا سفر کیا تھا۔

"اچھا آئی ایم سوری۔ چپ ہو جانا ہوں میں۔ میرے چپ ہونے سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے تو چپ ہو جانا ہوں میں۔" وہ نرم سے لہجے میں بولا تھا۔ آنکھوں میں تاسف چمکنے لگا تھا۔ زمین اس کی وجہ سے کبھی روئے گی، یہ تو سوچا بھی تھا۔ کبھی اس نے۔ زمین چپ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ آتش نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"اس دن تمہاری کمی کے الفاظ نے دل چیر کر رکھ دیا تھا میرا۔ آج تمہارے آنسو بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ چیر پھاڑ کا اتنا شوق ہے تم لوگوں کو۔ مجھے تو یقین ہو چلا ہے کہ تم لوگ بھی قصائی ہو۔ لیکن مجھے پھر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ میرا تعلق ایک باشعور گھرانے سے ہے۔ ہم کسی کو خود سے کمتر نہیں سمجھتے۔ تاہی ہمارے یہاں اس قسم کی فضول سوچ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس لیے میں دل و جان سے تمہارے ساتھ ساری زندگی ہنسی خوشی گزارنے کو تیار ہوں۔" اس کا تسلی دینے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔

زمین کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے تھے۔

"کہہ تو رہا ہوں سوری۔ کیوں کر رہی ہو ایسا۔" وہ بالا آخر زچ سا ہو کر بولا تھا۔ دل ہی دل میں اسوں بھی ہو رہا تھا۔ زمین نے تھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کیں اور اس کی جانب دیکھا۔ سیاہ شلوار فیس بنے وہ بے حد فریش لگ رہا تھا جبکہ اس کی اپنی حالت بالکل

خراب ہو چکی تھی۔ اسے اپنا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ اس بار وہ اپنی مٹی سے مکمل مشورہ کر کے اس سے مل رہی تھی اور توقع کر رہی تھی کہ آتش اس کی باتوں کو غور اہم سمجھتے ہوئے لا پرواہی تاہرے۔ وہ اس سارے مسئلے کا ایک درمیانی حل ڈھونڈ کر لائی تھی اور چاہتی تھی کہ آتش اس حل کو قبول کرتے ہوئے اس کی کمی سے مل لے۔

"آتش! میں واقعی تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تمہیں پانچ سو گئی، یہ سوچ کر ہی میری جان ٹٹکنے لگی ہے، سانس رکھنے لگتی ہے۔ میں تمہارے علاوہ کسی کو قبول نہیں کر سکتی۔" وہ ایک بار پھر گلو گھر لہجے میں بولی تھی۔ اس بار آتش کو مزید شرمندگی ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو ناٹل ظاہر کرنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا لیکن اس کی تدبیر اپنی ہو گئی تھی۔ زمین کے اس درجہ خدشات نے اس کے دل کو بھی بے چین کر ڈالا تھا۔ وہ اس قدر پریشان تھی اور وہ سلی دینے کے بجائے غیر سنجیدہ گفتگو میں وقت ضائع کر رہا تھا۔

"ارے یار! ایسا کیوں سوچتی ہو۔ کیوں نہیں پاسکو گی تم مجھے بلکہ تم مجھے پاچکی ہو۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ تم میری فکر مت کرو اور تم اتنا پریشان مت ہو۔ ہمارے پیرنس بے وقوف نہیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، غلط فہمیاں تو سب خاندانوں میں ہوتی رہتی ہیں پھر وہ دور ہو جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہارے پیرنس مان جائیں گے نا؟" آتش نے کچھ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ زمین کے ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھے۔

"میرے پیرنس مانے ہوئے ہی ہیں۔ اسی لیے تو تمہارے گھر آئے تھے۔ کھراک تو تمہاری کمی نے ڈالا ہے۔ تم بتاؤ وہ مان جائیں گی۔" زمین نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑ دیا تھا۔

"آتش! کمی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ بات کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے کچھ خدشات ہیں۔ وہ تم سے اس متعلق بات کرنا چاہتی ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اتش نے کندھے اچکائے
 "ہاں تو ٹھیک ہے۔ کہہ تو رہا ہوں کہ مل لوں
 گا۔ ایک بار پھر مل لوں گا۔ اگر تمہیں بار بار ان کے
 ہاتھوں میرا ذلیل ہونا اچھا لگتا ہے تو یہ بھی کرلوں گا
 کیونکہ تمہاری خاطر تو کچھ بھی کر سکتا ہوں میں۔
 کالے پانی میں اتر سکتا ہوں، کرلیے جھنڈی تک کھا
 سکتا ہوں، اپنے ایکس باکس کو توڑ سکتا ہوں۔ لی او نے
 اور ایڈیل کے گانے سننا چھوڑ سکتا ہوں اور بتاؤ، حکم
 کرو۔ بندہ حاضر ہے۔" اس نے سڑک چھاپ
 عاشقوں کی طرح بات مکمل کی تھی۔ زمین اس کا چہرہ
 دیکھ رہی تھی اور مسکرائی تک نا تھی۔ اس نے دھیرے
 سے اپنا ہاتھ چھڑوایا تھا۔ اتش کی نگاہوں میں استغما میہ
 تاثر بڑھ رہا تھا۔ وہ مزید اس کی جانب مڑی اور بولی۔
 "اپنے پیرئس کو چھوڑ سکتے ہو؟" اتش ساکت
 رہ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنا کام مکمل کر کے گلو والے ہاتھ دھونے
 کے لیے کمرے سے نکلی تھی جب بلاوجہ ہی نگاہ اتش
 کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ آنگن میں سناٹا تھا،
 ممانی جان اور ماسٹر جی سونے کے لیے لیٹ چکے
 تھے۔ اتش کے کمرے میں تاریکی اور سناٹے کا راج
 تھا جو کہ غیر معمولی سی بات تھی۔ ٹیرس کے بالکل
 سامنے سڑھیاں چڑھتے ہی اس کا کمرہ تھا۔ وہاں
 بالکل تاریکی تھی۔ عموماً ایسا ہوتا نہیں تھا۔ وہ بہت تاخیر
 سے سونے کا عادی تھا۔ اس کے کمرے سے میوزک
 کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی تھی اور کھڑکی کے
 شیشوں میں سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ دی وی آن ہے۔
 وہ بہت دیر تک ویڈیو گیمز کھیلنے کا بھی عادی تھا۔ سونیا
 اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے یا اندر جاتے ہوئے یہ
 بات نوٹ کرتی رہتی تھی لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ
 وہاں بالکل سناٹا چھایا ہو۔ اس کو جس محسوس ہوا۔ وہ
 جب گھر سے اچھی طرح تیار ہو کر خاموشی سے نکل رہا
 تھا تو سونیا نے اسے چڑانا چاہا تھا۔ سیاہ شلوار قمیض
 کے ساتھ شادری چپل پہنے، اچھے سے برقیوم کا

اسپرے کے وہ بہت فریش سالگ تھا اسے۔ وہ صرف
 مذاق کرنے کو بولی تھی۔
 "میں بتاتی ہوں ممانی جان کو کہ تم پارٹی میک
 اپ کر کے پھر زمین سے ملنے جا رہے ہو۔" اس
 نے آنگن میں لگے واش بیسن کے اوپر آویزاں آئینے
 میں اپنے بالوں کو دیکھنے کے بعد مڑ کر اسے دیکھا پھر
 منہ چوڑا کر بولا۔
 "تم واقعی پچھل پیری ہو۔ کہیں سے بھی نکل کر
 سامنے آ جاتی ہو۔" وہ نکل کر رہی اور اس سے پہلے کہ وہ
 کچھ بولی اتش نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے
 خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ ممانی جان چپن میں تھیں
 اس وقت رات کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔
 "زمین کے ساتھ ڈنر کا پلان ہے۔" اتش
 نے بہت دھیمی سی آواز میں اسے بتایا تھا۔ سونیا نے
 ہونٹوں کو کیکڑ کر سیٹی بجانے والے انداز میں اسے
 دیکھا۔ اس نے پھر ہونٹوں پر انگلی رکھی تھی۔
 "شش....." سونیا اس کے قریب ہوئی تھی
 اور پھر اسی کے انداز میں آواز کو دھیمہ کر کے بولی۔
 "ممانی جان کو نہیں بتانا کیا۔ ان سے چھپ کر
 جاؤ گے؟"
 "چھپ کر نہیں جا سکتا ان سے کہیں بھی۔ وہ
 مہارانی جودھابائی ہیں۔ ان سے چھپ کر کچھ نہیں کر سکتا
 میں۔ جب جب ان سے چھپ کر بچھ گیا۔ منہ کی کھائی
 ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے اعتراف کیا تھا۔
 "اتنا ڈرتے ہو ان سے؟" آواز ابھی مدھم تھی
 لیکن آنکھوں میں شرارت کی گونج بہت بلند تھی۔
 "نہیں۔" اتش نے کہنے کے ساتھ سر بھی ہلایا
 میں ہلایا تھا پھر اس کے سر پر چپٹ لگا کر بولا۔
 "ڈرتا نہیں ہوں۔ محبت کرتا ہوں ان سے۔ اگر
 بتا کر گیا کہ ان کی ہونے والی بہو کے ساتھ ڈنر کرنے جا
 رہا ہوں تو ناراض ہو جائیں گی۔ جو مجھے منظور نہیں۔" وہ
 اسی طرح مدھم انداز میں بولا تھا۔ سونیا متاثر نہ ہوئی تھی۔
 "مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ میں ان کو شکایت بھی
 لگا سکتی ہوں۔" وہ اسے چڑا رہی تھی۔

"چل اے۔ پچھل پیری۔ اب تم سے ڈروں گا
 شش۔" اتش نے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے ایک
 بار پھر اسے منہ چوڑا کر پھر با آواز بلند بولا۔
 "امی! میں باہر جا رہا ہا۔ احتشام کے ساتھ ڈنر کر
 کے آؤں گا۔ اس پچھل پیری کو ساتھ لے جاؤں؟"
 یہاں تک کہہ کر اس نے آواز کو دوبارہ دھیمہ کیا تھا اور
 اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
 "احتشام خوش ہو جائے گا۔" اس کی چپک دار
 آنکھوں میں شرارت جیسے ناچ رہی تھی۔ سونیا کو
 ناچا جتے ہوئے بھی اس کے انداز پر ہنسی آگئی تھی۔
 اس سے کوئی بات نا بن کی تو وہ ناک چڑھا کر چپن کی
 جانب چل دی تھی۔ اس کے بعد وہ کب گیا اور کب
 واپس آیا۔ اسے پتا نہ چلا تھا لیکن رات کے ڈیڑھ بج
 ہے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اب تک واپس نا آیا
 "اتنا۔ وہ زمین سے ملنے گیا تھا اور ان کے درمیان
 سورت حال تو پہلے ہی کشیدہ تھی۔ اسے کھد بند کی لگ
 گئی تھی کہ اب کیا معاملہ ہوا ہوگا۔ اس نے ماسٹر جی
 کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ یقیناً سوچکے ہوں
 گے۔ اس نے چند لمحے وہیں کھڑے ہو کر سوچا کہ
 اسے کیا کرنا چاہیے پھر وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ چند
 لمحوں بعد وہ دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتی چند
 سیڑھیاں اوپر تک گئی تھی کہ صرف باہر سے ہی دیکھ
 سکے۔ آواز وہ کمرے میں موجود ہے یا نہیں۔ وہاں چند
 لمحوں کھڑے رہنے کے بعد بھی اسے اندازہ نا ہو سکا
 تھا۔ وہ واپس ہو کر نیچے اترنے لگی تھی جب نگاہ ٹیرس
 تک چلی گئی۔ وہاں کافی تاریکی تھی واضح تو کچھ نظر
 نہیں آ رہا تھا لیکن چنگاری سی جلتی محسوس ہوئی جیسے
 بہت ننھا سا دیا روشن ہو۔ اس نے دوبارہ غور سے
 دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ ٹیرس پر بیٹھا تھا۔ سونیا
 پتہ لگے پھر اسی طرح کھڑی رہی۔ وہ فیصلہ نہیں کر
 پا رہی تھی کہ اسے وہاں جانا چاہیے یا نہیں پھر جیسے بنا
 ہے مجھے وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کے قریب
 پہنچی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اسے دیکھ کر چوچک
 جائے گا اور پھر اسے پچھل پیری کا خطاب دے گا

لیکن سونیا کو حیرت ہوئی۔ وہ بالکل بھی ناچوڑکا تھا۔
 سونیا اس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ وہ ٹیرس کی گرل
 کے قریب کھڑا سگریٹ جلانے لگا تھا۔
 "رات کے اس پہ یہاں کھڑے ہو کر غم غلط
 کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟" وہ بہت خوش گوار
 انداز میں بولی تھی۔ اتش نے گردن موڑ کر اس کی
 جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سیاٹ تھا۔ سونیا کو اس
 کے انداز میں کچھ غیر معمولی سے اثرات محسوس ہوئے
 جنہیں وہ کوئی نام نا دے سکی تھی۔ وہ کوئی جواب دیے
 بنا دوبارہ سگریٹ کا کش لگانے لگا تھا۔
 "ممانی جان کو پتا ہے کہ تم یہ شوق بھی رکھتے
 ہو؟" اس نے دوبارہ اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اب بھی
 کچھ نہیں بولا تھا، سونیا نے ایک بار پھر اس کے چہرے
 کو دیکھا۔ اب کی بار اسے خوف آیا۔ رات کے اس
 پہ ایسے منہ اٹھا کر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔
 "اتش! سب ٹھیک ہے نا؟" اس نے اب کی بار
 ذرا سا پریشان ہو کر سوال کیا تھا۔ اتش نے گردن موڑ
 کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی
 سفاکیت تھی۔ سونیا ذرا سا جھجک کر پیچھے ہٹی تھی۔
 "ہاں۔ سب ٹھیک ہے۔ کوئی اعتراض؟" وہ
 دوبارہ سے کش لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سونیا نے
 سوچا ایسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ دو قدم
 پیچھے ہٹی تھی۔
 "زمین ٹھیک تھی؟" اس نے جاتے جاتے بھی
 ایک اور سوال کر لیا تھا۔ اتش نے اب کی بار پھر مڑ کر
 اسے دیکھا پھر انگلیوں میں دبا سگریٹ کا ادھ بچھا ہوا ٹکڑا
 زمین پر گر کر اپنے جوتے سے مسل ڈالا تھا۔
 "کون زمین؟ میں کسی زمین کو نہیں جانتا؟"
 اس کے لہجے میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی اتنی سرد
 مہری تھی کہ سونیا اس کا چہرہ دیکھتے ہی رہ گئی تھی۔
 ☆☆☆
 "زمین آگئی؟" میڈم تمہین نے گھر میں داخل
 ہوتے ہی بیٹی کے متعلق پوچھا تھا۔ پٹھان چوکیدار نے
 سر ہلایا۔ انہیں اطمینان نہ ہوا تھا۔ لاؤنج میں آکر انہوں

نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک ڈر میں مدعو تھے اور کافی تاخیر سے واپس آئے تھے۔

"آپ چلیں۔ میں ذرا زمین کو دیکھ کر آتی ہوں۔" انہوں نے کہا تھا پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھائی وہ زمین کے کمرے کی جانب چل دی تھیں۔ انہیں بہت بے چینی لاحق تھی۔ انہوں نے ڈر کے دوران بھی اسے کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کال یک نہیں کی تھی۔ وہ اس کے لیے پریشان تھیں۔ یہ لڑکی ان کی توقع سے زیادہ ضدی ثابت ہو رہی تھی۔ اسی کی خاطر انہوں نے ایک درمیانی راستہ نکالا تھا ورنہ وہ لڑکا تو انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ زمین اس سے ملنے والی تھی یہ تو پتا تھا انہیں لیکن اس ملاقات کا نتیجہ کیا نکلا تھا اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتیں وہ بیٹی کے کمرے تک پہنچی تھیں۔ اس کا کمرہ لاکھ تھا۔ انہوں نے دستک دی تھی لیکن اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ان کا دل لرزنے لگا تھا۔ زمین اس لڑکے کی محبت میں جتنی باگل نظر آ رہی تھی اس سے بعید تھا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ کر رہی بیٹھی۔ وہ مزید پریشان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے دروازہ دھڑ دھڑاٹا تھا مگر پھر بھی کوئی جنبش سنائی نہ گئی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟" سونیا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پریشان کن لہجے میں کہا تھا۔ وہ کم صدم سا تھا۔ اس نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا لیکن سونیا کو اس کے چہرے کے تاثرات گزرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"کیا لوگ یہاں سے جانے کے؟ کہہ تو رہا ہوں سب ٹھیک ہے۔" وہ ناک پر چڑھا کر بولا تھا۔ سونیا چند لمحے پھر اسی کی جانب دیکھتی رہی۔ اس کے اپنے دل میں عجیب کشش چل رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ کچھ دیر یہاں بیٹھی رہے اور اپنے اس بد دماغ کزن کو نسلی دے لے جبکہ دماغ کہہ رہا تھا کہ پرانے پھدے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت کیا ہے۔

"جانی کیوں نہیں ہو۔ جاؤ۔۔۔ کیا مصیبت

ہے انسان اپنے ہی گھر میں دو گھڑی سکون سے اکیلا نہیں بیٹھ سکتا۔" وہ پہلے سے زیادہ بدتمیزی سے بولا تھا۔ سونیا جھکے سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"تمہارے ساتھ جو بھی ہوا، اب مجھے اس پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ تم اسی کے مستحق ہو۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی پھر دھپ دھپ کرتی میز جیوں کی جانب بڑھی تھی۔

"مجھے پتا تھا تم یہی کہو گی کیونکہ تمہاری بد دعاؤں کی وجہ سے ہی ہوا ہے یہ سب۔ اچھا بھلا سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ تمہارے قدم جس دن سے اس گھر میں پڑے ہیں، اسی دن سے کچھ نا کچھ برا ہی ہو رہا ہے۔" وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے چلا کر بولا تھا۔ سونیا سیڑھیاں اترنے ہی والی تھی، اس طعنے کو سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ وہ مڑ کر آئی تھی۔

"بد دعاؤں کے بیچے! میری وجہ سے سب ٹھیک ہونے والا تھا۔ میں نے تمہاری امی کو راضی کیا۔ سارا الزام اپنے سر لیا، جھوٹ بولا کہ میں کسی کو پسند کرتی ہوں اور تم کہتے ہو کہ میری بد دعاؤں کی وجہ سے ہوا یہ سب۔" وہ غرا کر بولی تھی۔ آتش کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

"جھوٹ سچ تو تم نے بول رکھے تھے اس زمین سے۔ کیوں ظاہر کر رہا تھا اس کے سامنے تم کسی نواب کی اولاد ہو۔ کیوں نہیں بتایا تھا اس کو کہ تم ایک ٹیلر ماسٹر کے بیٹے ہو۔ کیوں غلط بیانی کی تھی اس سے؟" سونیا اس کو بولنے کا موقع دیے بغیر مزید بولی تھی۔ وہ سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر اس نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ سونیا کا خیال تھا کہ وہ اب کوئی سخت بات تو ضرور کہہ ڈالے گا لیکن وہ دوبارہ سے سامنے دیکھنے لگا تھا۔

"میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ میں نے اس سے فلرٹ نہیں کیا تھا، محبت کی تھی اور محبت میں جھوٹ کی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔" اب کی بار وہ مضحک

لہجے میں بولا تھا۔ اس کا انداز اتنا ٹائٹا ہوا تھا کہ سونیا چند لمحے کچھ بول ہی نہیں سکی پھر جیسے اسے اس شخص پر ترس آیا تھا۔ وہ دوبارہ دو قدم چلی اور پھر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"آتش! چلو جاؤ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ ابھی یہ سب بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح کو اس موضوع پر اطمینان سے بات کریں گے اور کوئی حل نکال لیں گے۔ فی الوقت یہاں کھڑے ہو کر جلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" وہ نسلی دینے والے انداز میں بولی تھی۔ اس کا اشارہ اس کے سر کیٹ پھونکنے کی طرف تھا۔ آتش نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی جیسے۔

"اب کسی بھی چیز کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جل جاؤں یا مر جاؤں۔ سب ایک برابر ہے۔ ختم ہو گیا ہے سب۔" وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھا۔ سونیا رچ ہوئی۔ اسے لوگوں کے ایسے انداز سے ہمیشہ ہی الجھن ہوتی تھی جس میں مایوس ہو کر لوگ مرنے مارنے کی باتیں کرنے لگیں۔

"سب کچھ کبھی ختم نہیں ہوا کرتا۔ کچھ نا کچھ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ قدرت امید جگائے رکھنے کے لیے کچھ نا کچھ ضرور چھوڑ دیتی ہے۔ پھر اسی "کچھ" سے بہار پھوٹ پڑا کرتی ہے۔ کوئی نا کوئی حل نکل آئے گا۔ صبح ہونے دو۔ رات جل کر کر لیں گے کچھ۔" وہ چاہتی تھی کہ وہ ابھی اپنے کمرے میں چلا جائے لیکن وہ اٹھنے کو تیار نہیں تھا۔

"نہیں۔ اب اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ یہ چپڑ کلوزڈ ہو گیا ہے۔ مجھے ابھی یا کل بھی بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ میں اپنے پیئرس کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ سونیا نے اس کے جملے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بات کچھ کچھ تو سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اس کے مزید قریب ہوئی تھی حالانکہ خدشہ تھا کہ اگر گمانی یا ماسٹر جی میں سے کوئی اٹھ گیا اور باتوں کی آوازیں سن کر ادھر آ گیا تو اچھا نہیں ہوگا لیکن پھر بھی وہ رسک لے رہی تھی۔

"زمین نے تم سے کہا یہ۔ وہ چاہتی ہے کہ تم اپنے پیئرس کو چھوڑ دو۔" وہ پوچھ رہی تھی۔ آتش نے اس کی جانب دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔ سونیا نے چو کر اسے دیکھا۔ وہ بات مکمل کرنے میں کس قدر تاخیر سے کام لے رہا تھا۔

"تو پھر۔۔۔۔۔؟"

"وہ اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی ماں یہی چاہتی ہے اور وہ اپنی ماں کی زبان بول رہی تھی۔ ورنہ اتنے آرام سے اتنی بڑی بات بھی نا کہتی۔" وہ ایک بار پھر جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ "آتش! میری بات سنو۔ تم یہاں بیٹھو۔ مجھے بتاؤ تفصیل سے کیا بات ہوئی ہے تمہاری زمین سے۔" وہ اسے ایک جانب بڑی چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ آتش اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ وہ جیسے خود کلامی میں مگن تھا۔

"زمین چاہتی ہے میں اور وہ آسٹریلیا چلے جائیں۔ اس کے پیئرس نہیں اسپانسر کر دیں گے۔ ہم وہاں جائیں اور وہاں جا کر شادی کریں۔ پانچ سات سال وہیں رہے تا کہ اس کے خاندان والوں کو یہ تاثر دیا جاسکے کہ زمین نے وہاں آسٹریلیا میں کسی ایکس وائے زڈلڈ کے سے شادی کر لی ہے۔ یہ سب قبول ہے اسے لیکن وہ یہ نہیں چاہتی کہ میری اور اس کی شادی کے بارے میں ابتدا میں کسی کو پتا چلے۔ اس کے خاندان والے کسی ٹیلر ماسٹر کے بیٹے سے شادی پر اس کا مذاق اڑائیں گے اور وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکے گی۔ چند سال گزر جائیں گے تو بات پرانی ہو جائے گی اور پھر ہم واپس آ جائیں گے۔ وہ کہتی ہے پانچ سات سال تو بس یوں ہی گزر جائیں گے۔ پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟" سونیا نے سوال کیا تھا جیسے اسے ساری بات جاننے کی بے چینی ہو۔ آتش کی گفتگو میں غیر ضروری وقفے اسے چھہ رہے تھے۔ آتش نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"پانچ سات سال ایسے ہی گزر جاتے ہیں

دل خوشی



بات نہیں ہے۔ میں اس کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں جس سے میں بھی سبکدوش نہیں ہونا چاہوں گا۔ میں ساری زندگی اس بات کو تمنہ کی طرح سینے پر سجا کر رکھوں گا کہ میرا باپ ایک درزی ہے۔ میں تو پانچ سات سات اس بات کو نہیں بھلا سکتا اور وہ پانچ سات سال کا کہہ رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے سونیا۔" وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میرے پرنس مجھ جیسے بیٹے کو بھی کتنے فخر سے اون کرتے ہیں۔ جس نے ابھی تک ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اتنے سال ہو گئے صرف ان سے لے ہی رہا ہوں۔ دینے کا تو سوچا بھی نہیں سچی اور اسی بیٹے کی کمائی سے کھایا پیا ہے۔ اوڑھا پہنا ہے۔ تعلیم حاصل کی ہے۔ زندگی کی ہر نعمت کو انجوائے کیا ہے۔ یہ جو سرائی کر غرور سے گردن اڑا کر کہتا ہوں نا۔ آتش ہوں میں۔ سب بتاتا ہے مجھ پر۔ یہ سب اسی لیے بتاتا ہے مجھ پر کہ میرے باپ نے حلال کی کمائی سے جو بھی حاصل کیا۔ مجھ کو بخت بر لگا دیا اور بھی جتا بھی نہیں۔ اسی نوک دیتی ہیں اکثر لیکن ماسٹر جی نے تو بھی کچھ بھی نہیں کہا۔ سچی کوئی شکوہ بھی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ دیا ہی دیا ہے۔ بھی ان کے لیے پانچ روپے کی جلیبی بھی لے آؤں تو اگلے ہی دن پانچ سو روپے دے دیتے ہیں کہ رکھ لے آتش! کام آئیں گے۔ اسی بیٹے نے یہ بہار دکھائی ہے آتش کو اور آتش یہ سب بھول نہیں سکتا سونیا۔ مجھے فخر ہے اسے باپ پر۔ ایک میڈم تہمینہ کی خاطر میں اپنے باپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیوں چھوڑوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ زمین کو چھوڑ دیا جائے۔" وہ کرب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سونیا کے پاس الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ وہ اسے تسلی کیا دیتی۔

☆☆☆

دوستو! اب اس مقام پر انسان اپنی اولاد کو تسلی دے یا قصے سناتا پھرے اور آپ چاہتے ہیں کہ فائٹ سب آپ کے گوش گزار کر دوں۔ نا بھئی۔ اس ماسٹر سے نہیں ہوگا یہ سب، کرلو جو کرتا ہے۔

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

کیا؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ سونیا کو دھکا سا لگا۔ اس اونچے لیے لڑکے کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ جب دل ٹوٹا ہے تو کرچیاں آنکھوں سے باہر نکلا کرتی ہیں۔ وہ رو نہیں رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمکتی سی تاریکی میں بھی نظر آرہی تھی اور باور کروارہی تھی کہ دل پر پڑنے والی ضرب بے حد کاری تھی۔

وہ خود کو کسی شہزادے سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنی ذات پر کیسا غرور رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کی نفی برداشت نہیں کرتا تھا آج اسے مجھ میں آئی تھی کہ دکھ کا ذائقہ ہر ایک کے لیے ایک جیسا ہوتا ہے۔ رخ اور چہتا ہوا۔ سونیا سے اگلا سوال نہیں کیا گیا تھا۔

"نہیں گزن! اتنی آسانی سے نہیں گزرتے پانچ سات سال۔ میں پانچ بجے واپس کا کہہ کر جاؤں اور پانچ بج کر سات منٹ پر واپس آؤں تو میری ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتی ہیں۔ اتنی سی دیر میں سات چکر گیت کے لگا آتی ہیں کہ اٹھوتا بیٹا جانے کہاں رہ گیا ہے اور ماسٹر جی! وہ تو گھر آ جانے کے بعد پانچ گھنٹے میں دس بار میرے کمرے میں جھانک کر جاتے ہیں کہ آتش کیا کر رہا ہے۔ اپنے ان ماں باپ کو چھوڑ کر میں زمین کے ساتھ چلا جاؤں جنہوں نے میرے علاوہ کسی کا خواب بھی نہیں دیکھا۔ جن کا جاگنا سوتا میں، جن کا اوڑھنا بچھونا میں، جن کا ہونا اور نا ہونا میں۔ میرے علاوہ تو کسی کے متعلق سوچتے بھی نہیں ہیں وہ۔ میرے علاوہ ان کا ہے کون؟ ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اتنا کمینہ نہیں ہوں میں۔ اولاد ہوں، منڈ پر پر بیٹھا کو نہیں ہوں، کھایا پیا اور اڑ گیا۔" وہ نہایت برا مان کر بولا تھا۔ سونیا کو اس کا انداز برا نہیں لگا تھا۔ آتش کے لہجے کی ناگواری اس کے لیے نہیں تھی۔ زمین کے لیے تھی۔ وہ تسلی کے لیے الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ بولا۔

"اسے اعتراض نہ ہے کہ میرا باپ ایک درزی ہے۔ یہ اعتراض تو زندگی بھر ختم نہیں ہوگا کیونکہ میرے لیے میرے باپ کا درزی ہونا کوئی شرم کی

اسد کچن میں ہانڈی جھونٹے ہوئے مصروف انداز میں گنگنا رہا تھا
”تو لیا دے مینوں گولڈن جھکے میں کنناں وچ پاواں چم کے“

ساتھ ساتھ لہک بھی رہا تھا۔ جبکہ مناجو صرف نام کا ہی منا تھا بے زاری سے صبح ناشتے میں بننے والے برتنوں کے ڈھیر سے نبرد آزما تھا جبکہ باہر عادل اپنی بانیگ کو دھوتے ہوئے اسد کے گانے پر باقاعدہ جھوم رہا تھا صرف ایک واحد شیریں تھا جو آرام سے صحن میں آراستہ تخت پوش پر گاؤں تکیے سے ٹیک لگائے میگزین کی ورق گردانی کم اور ناپ کلاس ماڈلز کے ہوشی رہا مناظر میں زیادہ کم تھا۔
”جی دروازے پر زور دار دستک ہوئی تھی۔“

سب بیک وقت چونکے تھے کیونکہ گیتی آرا بیگم ابھی ایک گھنٹہ پہلے تو باہر گئی تھیں اور وہ جب بھی محلے کے دورے پر نکلتی تھیں تو پھر ہر گھر کی مکمل رپورٹ کے ساتھ ہی نازل ہوتی تھیں یوں بھی دستک کا انداز نا آشنا تھا۔

”جا عادل! دیکھ تو کون ہے؟“ شیریں سب سے بڑا تھا اس لیے اس کا انداز بھی اکثر حکمیہ اور دو ٹوک ہوا کرتا تھا۔

”میں نہیں جا رہا ہوں مناس مرض کی دوا ہے اس سے کہو۔“ عادل نے برا سامنہ بنا کر کہا تھا۔
”ٹھیک ہے پھر تم آکر برتن دھولو۔“ مناکون سا کم تھا حاضر جوانی تو منا پر ہی ختم تھی۔

قبل اس کے کہ مزید بحث طول پکڑتی شیریں نے میگزین ایک جانب باقاعدہ اچھال کر پھینکا تھا اور باؤں میں چپل اڑس کر مین گیٹ تک آیا تھا۔ اس نے ٹھٹ سے دروازہ کھولا تھا۔ اور کھولتے ساتھ ہی منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

سامنے ہی ایک خوب صورت دو شیزہ کھڑی تھی اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے بھی جسے اس نے ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شیریں کی ساری توجہ کھانے کی طرف مبذول ہوتی

کہ وہ کھانے کا رستہ تھا اور مفت کے مال پر ٹوٹا اپنا عین فرض سمجھتا تھا مگر یہاں تو کہانی ہی الٹ تھی ساری توجہ اس حسینہ منہ جبین کی طرف مبذول تھی جو مسکرا کر اس کے دل پر بجلیاں گرا رہی تھی آج سے قبل کسی لڑکی نے اسے یوں مسکرا کر نہیں دیکھا تھا ہمیشہ وہ ہی دیکھا کرتا تھا اپنے دانتوں کی بھرپور نمائش کے ساتھ۔ وہ اس کا یا پلٹ پر تھیر زدہ بھی تھا اور بے پناہ مسرت محسوس کر رہا تھا۔

”یہ میں بریانی لائی ہوں ہم یہاں نئے نئے شفٹ ہوئے ہیں تو اماں کہنے لگی ہم سے تو کسی نے پوچھا نہیں مگر ہمارا تو فرض بنتا ہے محلے داروں کا خیال رکھیں۔ سامنے سے نہیں بھی۔ کیا سیسہ پلائی دیوار بن کرتی گئے ہیں۔“ اس لڑکی کی چرب زبانی دیکھ کر وہ حواس باختہ سا ایک جانب ہو گیا تھا۔

وہ سیدھا اندر گھسی چلی گئی تھی سامنے ہی صحن پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس کے عین سامنے ہی کچن تھا جہاں سے برتنوں کی کھنک دار آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”گھر میں کوئی عورت نہیں ہے کیا؟“ اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھما کر اطراف کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

”جی اماں باہر گئی ہیں۔“ عادل نے جھٹ سے اس لڑکی کو جواب دیتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا اس لڑکی نے بھی اب عادل کی طرف دیکھا تھا۔ شیریں جو اس لڑکی کے ساتھ محبت بھرا ایک طویل سفر سوچ ہی سوچ میں طے کر چکا تھا اس طرح عادل کی دخل اندازی پر سخت بد مزہا ہوا تھا۔

”جی بھریہ آپ ہی لے لیں میں پھر آ جاؤں گی برتن لینے، ویسے یہ سامنے والا گھر ہمارا ہی ہے وہ نیلا رنگ کا گیٹ۔“ وہ ادائے دلبری سے بولتی وہاں سے چل دی تھی اور عادل اور شیریں جیسے سکتے سے باہر نکلے تھے۔ اور شیریں نے عادل سے ٹرے چھین لی تھی باقاعدہ طور پر اور بریانی پر ٹوٹ پڑا تھا۔ بریانی واقعی بے حد لذیذ تھی، وہ بریانی کھاتے ہوئے مسلسل اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”بڑے بے مروت ہو، تھوڑی سی مجھے بھی اے دو۔“ عادل نے لپٹائی نظروں سے کہا تھا تو شیریں نے بڑا سا ڈکار مارتے ہوئے وہ بریانی کی پلیٹ اور ٹرے عادل کی طرف بڑھا دی تھی۔

”کھانے کے بعد یہ دھو دینا اور ہاں آج کچھ اچھا سا پکنا چاہیے پھر میں جا کر کچھ دے کر آؤں گا۔“ شیریں کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ عادل جو نگاہوں ہی نگاہوں میں اس لڑکی کو اپنا بنانے کی تک دود میں بلکان ہو رہا تھا اس کا موڈ ایک دم سے ہی خراب ہو گیا تھا کیونکہ شیریں کے الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس لڑکی کے ساتھ اپنا معاملہ فٹ کرنے کے چکر میں ہے اس لیے عادل کو چپ کا گڑ کھانا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

شیراز احمد، عادل احمد، اسد اور پھر منور احمد یہ چار اولادیں تھیں گیتی آرا بیگم کی۔ ہر مرتبہ بیٹی کی پیدائش کا اربابان دل میں جگائے وہ باقاعدہ بیٹی کی شاپنگ کرتی تھیں مگر ہر مرتبہ ہی صحت مند گول گوتھنا

سایہ ان کو تھما دیا جاتا تھا۔ جب قدرت کی طرف سے انہیں بیٹی ملی تو وہ اپنے دل کے ارمان چھوٹے اسد اور منا کو کچپن میں فراک پہنا کر پورے کیا کرتی تھیں اور منا کے بالوں کی تو باقاعدہ طور پر دو دو پونیاں بنائی جاتی تھیں جب تک وہ اسکول جانے کے قابل نہیں ہو گیا اس کے ساتھ یہ سلسلہ جاری و ساری رہا۔ یہی نہیں سب بھائیوں کو کھانے پکانے میں طاق کر دیا تھا۔ گیتی آرا کو کبھی اب عملاً بیٹی کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی اگر اسد جھاڑو لگا رہا ہے تو عادل کچن میں چائے بنا رہا ہے منا پر اکثر برتن دھونے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ سب سے چھوٹا بھائی تھا اور اماں کا سب سے لاڈلا منا تھا اور خود شیریں کی ماہر شیف کی طرح بہترین کھانے بناتا تھا کبھی حلیم تو کبھی کڑا ہی گوشت کبھی فرانی فز اور کبھی پلاؤ اس کے ہاتھوں میں واقعی لذت تھی۔

گیتی آرا کی ایک نگاہ جنبش سے سب بڑے منٹوں میں گھر کو بچا سنوار دیتے تھے۔ گھر کا کونا کونا چلنے لگتا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

چلمن	دل لیک	دست دوز	بھلائی
نادرہ خاتون	رضیہ جمیل	فوزیہ یاسمین	نہیم سچر گپتی
قیمت - 300 روپے	قیمت - 300 روپے	قیمت - 750 روپے	قیمت - 400 روپے

منابع مکتبہ عمران سٹ
فون نمبر: 32735021

پیارے بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 مارک مفت

قیمت - 300/- روپے
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہء عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”اے لوبہ نہیں کرتی تو اپنی زویا کس مرض کی
واسے کیا یہ کام نہیں کرتی ہے۔“ بیتی آرا کی بات پر
سانے تک مسک سے تیار زویا نے کسماس کے اپنی جگہ
پہلو بدلا تھا اور نصیرہ بیگم تو باقاعدہ شپٹا کر رہ گئی
تھیں۔ کیسے کہتیں کہ بیٹی تو سارا دن رپورنگ میں
ان رہتی ہے جس وقت ساس کی آنکھیں عینک کے
تھک جاتی تھیں بھوکے نقل و حرکت پر نگاہ رکھ کر
اپنی ماں کی گدی سنبھال لیتی تھی۔

”ارے زویا تو منٹوں میں سارے کام نبھالیتی
ہے باؤ زویا جا کر بچن میں ہمارے لیے پکڑے بنا
اور ساتھ چائے کا پانی بھی رکھ دینا چاہیے پر۔“
نصیرہ بیگم کی بات پر زویا نے ایک خشکیں نگاہ ماں پر
الٹی مٹی جیسے ماں نے سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔
مرتی کیا نہ کرتی کہ مصداق وہ بل کھاتی ندی

لیا انداز ٹھکڑی ہوئی تھی۔ امور خانداری سے اس
لی جان جاتی تھی مگر جب سے وہ لوگ آئی تھیں۔
نصیرہ بیگم اس کی اتنی تعریفیں کر چکی تھیں کہ بس اور
بہتر اس کا مظاہرہ دکھانے پر بھی مل گئی تھیں۔
اصل حقیقت حال یہ تھی کہ وہ پچھلے ایک گھنٹہ سے
ماں بیٹی ہوئی تھیں مگر کسی نے بھی مروتا بھی کھانے
کا نہیں پوچھا تھا۔ شیری اور عادل کی ابھی آفس
والیسی ہی نہیں ہوئی تھی اور مٹائش پڑھنے گیا تھا
نصیرہ بیگم کا آج کرکٹ ٹیم کا میچ تھا وہ اپنے دوستوں
کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ ایسے میں بیتی آرا بیگم کیلے تھیں
اسی ہی ان کا خیال تھا کہ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے
والیسی کی ہمسائی کو کیا تو ضلع کرتی پھریں اب۔ مگر
وہ آنے کے بعد والیسی کے لیے جیسے آمادہ ہی نہیں
تھیں۔ اب جبکہ زویا خود ہی بچن کی جانب چل دی
تھی تو بیتی آرا بیگم کو اسے نوکنا اچھا نہیں لگا تھا۔

ادھر بچن میں کھڑی زویا نگاہیں دو جا رہی
تھیں پکڑے کے لیے پیاز اور الوکاٹا شروع کیے
تھیں وہاں سارا بابا ہر کی جانب تھا کیونکہ نصیرہ بیگم کی
والیسی کیسے بھی وقت کو درگزر کرتی تھی۔
تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور شیری نے

کے دودھ کی چوری بھی پکڑ لیتی تھیں۔ گلاس کو سین
آنکھوں کے سامنے لہراتے یہی سوال پوچھنے لگی تھیں۔
”یہ دودھ کس نے پیا ہے اس گلاس میں۔“ بھو
بیگم بھی ماہر تھیں دودھ کی کرگلاس دھو کر اس کے اصل
ٹھکانے پر رکھنے لگی تھی۔ مگر دپٹی میں دودھ کم ہوتا تو
سوال ساس صاحبہ کا جوں کا توں قائم و دائم تھا۔ اس کا
بھی حل مریم نے نکال لیا تھا دودھ میں پانی ڈال کر
چلتی بنتی تھی۔ مگر نصیرہ بیگم نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی
پی رکھا تھا سو دودھ کی دپٹی تخت کے قریب بڑی میز
پر پاس رکھ کر سونے لگی تھیں کہ ملی دودھ میں منہ نہ مار
دے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ بھوکے دل میں
ساس کے لیے نفرت گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ مگر گھر
آباد رکھنے کے لیے دلوں کو دیر ان کرنا پڑتا ہے۔ دل
کی قبر پر ایک شادی شدہ گھر تعمیر ہوتا ہے۔

ان دنوں سب زویا کے رشتے کے لیے بہت
پریشان تھے کیونکہ پورے محلے میں نصیرہ بیگم کی زنانہ
کم مردانہ آواز کی دھوم تھی وہ اپنی پاٹ دار آواز سے
کمر پر ہاتھ رکھے جب طبیعت صاف کرتی تھیں تو
اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے آ جاتے تھے اس قدر
زبان دراز عورت کی بیٹی سے شادی کرنے پر کسی بھی
بیٹے کی ماں آمادہ نہ تھی۔ کسی عقل والے نے محلہ
تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تو فوراً عمل بھی کر ڈالا تھا
یوں نصیرہ بیگم ان کا بیٹا فہد اور بھومیم کے ساتھ بیٹی
زویا بھی ادھر ہی آ گئے تھے۔ جبکہ عابد صاحب کی
بات کی تو گھر میں کوئی وقعت ہی نہ تھی سارے فیصلے
بالائی بالا طے کر لیے جاتے تھے۔ اب سب کے دل
میں جہاں زویا کے رشتے کی آس بندھ گئی تھی وہاں
مریم بھی تیز طرار فتنہ ساز نندہ سے خلاصی کی تمنائی تھی۔

☆☆☆

”بہن ماشاء اللہ گھر تو جگمگ کر رہا ہے تمہارا
ایک ہماری بھو ہیں بچان ہے جو بنا کہے کام کر لے ہر
ہر کام کے لیے یکار پڑتی رہے تو کام ہوں گے ورنہ
نہیں۔“ نصیرہ بیگم نے طے دل کے چھپھولے
پھوڑے تھے۔ چہرے کا زادیہ بھی کچھ بگڑ گیا تھا۔

تھا۔ پھر بھی نہ جانے کون سی خلش تھی جو ابھی بھی گیتی آرا
بیگم کے دل میں پھانس بن کر انگ کی تھی۔ ان کا رعب و
دبدبہ تھا۔ سارے بیٹے ان سے ڈرتے تھے چند سال قبل
احمد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد ان بیٹوں نے
ماں کے مطابق زندگی بسر کرنا لازمی قرار کر لیا تھا۔

اس گھر کی شہرت دور دور تک تھی ساری محلے کی
عورتیں تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں کہ بیتی آرا نے
اپنے بیٹوں کی کیا عالیشان تربیت کی ہے مگر ان ہی
خواتین کی بیٹیاں منہ بھر بھر کر ان سب کو دیکھ کر کھی کھی
کرتی تھیں کوئی بھی عملاً اس گھر میں اپنی بیٹی نہ دیتا تھا
جبکہ شیری اور عادل ہی نہیں اسد بھی اب شادی کے
قابل تھا مگر سب جانتے تھے کہ یہ لڑکے گھر گھر ہستی
میں تو طاق تھے مگر اپنی اماں کے سامنے بیگم بلی بن
جاتے تھے اور ماں کے سامنے کسی غلط بات سے بھی
انکار کرنے کی جرات و جسارت نہ کراتے تھے۔ یہی
وجہ ہے کہ سب اپنی بیٹی یہاں دیتے پچھاپھاٹ کا شکار
تھے آنکھوں دیکھی مٹی کون نگہنا پسند کرتا ہے۔
اس لیے وہ سب مصیبت کا شکار تھے اب اس
لڑکی کو دیکھ کر شیری کے دل میں کچھ روپہلی کرنوں
والے خواب تو جاگے تھے مگر ان کو شاید پایہ تکمیل تک
پہنچانے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مر جانا تھا۔

☆☆☆

مریم نے ایک ناگوار سی نگاہ اپنی ساس نصیرہ بیگم
پر ڈالی تھی جو اس عمر میں بھی اپنی ہونٹوں کو لال لب
اسٹک سے رنگے کانوں میں موتیا کے پھول اڑے
آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے ہولے ہولے لگتا بھی
رہی تھیں کچھ مگر مریم نے یہ سننے کی کوشش نہیں کی تھی۔
اسے اور بھی بہت سے کام تھے۔ اوپر تلے کے بیشتر کام
نبھانے کے علاوہ ساس صاحبہ کی جسکے دار زبان کی خاطر
کچھ ان کی من پسند پوش بھی بنانی تھی۔

نصیرہ بیگم کو اس عمر میں بھی اللہ اللہ کرنے کے
بجائے صرف بھو بیگم کی ٹوہ لینے کی بری عادت راسخ تھی
بھو بیگم کی ہی ہے کیا کھار ہی ہے کیا اوڑھ پہن رکھا ہے۔
اس کی ترجیحات کیا ہیں۔ وہ تو چھپ کر پیسے گئے بھو

زوردار سلام جھاڑا تھا اس کا ہاتھ کٹ گیا تھا خون کی دھاری نکلی تھی۔ وہ چیخ مار کر رہ گئی تھی۔
”کیا ہوا زویا!“

ماں کا تودل ہی دہل گیا تھا۔ جبکہ شیریں کی قہقہہ اس کے کہ دو بھاری بھر کم جوتن و توش کی مالک تھیں اپنا وجود سنبھالنے اٹھیں وہ کچن کی جانب جہاں سے زویا کی چیخ سنائی دی تھی لپکا تھا۔
سامنے ہی وہ مہ جہیں دہلیز نین کنوڑے آنسوؤں سے لبالب بھرے شکوہ کنال لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ تو ان لگا ہوں کی لہر میں خود کو ڈوبتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

”میں سب کے لیے پکڑے بنانے آئی تھی اچانک ہی ہاتھ کٹ گیا ہے۔“ وہ منہ دے رہی تھی۔
شیریں نے دیکھا اس کے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کٹ گئی تھی۔ کٹ کچھ گہرا ہی تھا۔ بھی وہ خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی فرسٹ ایڈ کے ساتھ نمودار ہوا تھا غم کپڑے سے خون دبا کر اس نے اسے صاف کیا تھا پھر مرہم لگا کر پٹی کرنے لگا تھا۔
”میرے ہوتے آپ کو کیا ضرورت تھی کچن میں کام کرنے کی۔“ وہ بے ساختہ اٹھتے جذبات کے تحت بولا تھا۔ وہ تھیر زدہ یک ٹک اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ محبت نے بیک وقت دونوں کے دردل پر دستک دی تھی۔ وہ شرم کر رہا تھا گئی تھی۔

پٹی باندھے وہ باہر نکلی تو دونوں خواتین کی جان میں جان آئی تھی۔ اس کے ادھر سے کام کو پھر شیریں نے کسی ماہر کھڑ خاتون کی طرح پورے کیے تھے پکڑے اور مین کا حلوہ ساتھ میں گرم بھاپ اڑاتے جائے کے کپ۔ وہ جھکن سے چور گھر لوٹا تھا دل میں مقسم ارادہ باندھے کہ سارے کام وہ چھوٹوں سے کروائے گا مگر یہاں آکر اس کی جھکن جیسے اڑن چھو ہو گئی تھی۔ جھٹ پٹ سارے کام کرتا چلا گیا تھا۔ گنتی آرا گھاگ تھیں بیٹے کے بات بے بات کھلتے لب انہیں اس وقت سخت اشتعال دل رہے تھے۔ اس وقت تو گنتی آرا کا غصہ سوانیزے پر پہنچ گیا تھا جب

شیریں نے ان کے کھانے کھانے میں ہی اندر پلاؤ پر لگا دیا تھا ساتھ فرنگ میں فریز کیے کباب بھی تھیں۔
”آئی میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ کھا کر ہی جائے گا۔“

نظریں ہنوز زویا پر مرکوز تھیں جو اس وقت شیریں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے بے حد لذت پکڑوں سے انصاف کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چائے کی چسکیاں بھی لے رہی تھی۔ لگا ہوں کا تصادم ہوا تو وہ بھر پور جوانی مسکراہٹ لٹائی ہوئی دل سے کتنے پاس پاس لگ رہی تھی۔ پھر وہ رنگین شام نے بیگم اور زویا کے جانے کے بعد واقعی رنگین ہو گئی تھی۔ گنتی آرا اپنی چپل سے شیریں کو پتلی اس کی درگاہ بنائی رہیں اور وہ کسی مجنوں کی مانند عشق میں مارا ہنس کر کھاتا رہا۔ گنتی آرا تو شاید جان سے ہی ڈالیں اگر عادل اور اسد آکر صلی صفا کی نہ کروالیتے۔
”میں کہہ دے رہی ہوں سب کی شادیاں میرے پسند سے ہوں گی اس گھر میں شادی بانی میری منشا نہیں ہے خیر دارا جو کسی اور نے بھی من مانی کرنے کو شش بھی کی تو اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔“ سب شیریں سے دلی بھردی تھی اس کے بعد گھر میں خاموشی چھا گئی تھی۔ شیریں کی نگاہوں سے اس زویا چہرہ جدا نہ ہوتا تھا ایک پل کے لیے بھی۔

☆☆☆

”کیوں ماں سے ضد لگا رکھی ہے۔ رات کھانا نہیں کھا یا صبح ناشتا نہیں کیا اور اب آفس لوٹے ہو تو پھر کھانا نہیں کھا رہے خود کو اس ایک کمرے تک مقید کر لیا ہے ایسا کیا طوفان آگیا۔ ماں کی بات ماننے میں ہی عافیت ہے۔“ عادل نے اسے صحتاً انداز میں سمجھا رہا تھا۔

عقب میں اپنے بیٹے کے دل میں کیا چل رہا جاننے کے لیے گنتی آرا بیگم کان لگائے کھڑی تھیں۔
”عادل میں ماں کے خلاف نہیں جارہا ہوں محبت نے میرے قدموں میں زنجیر باندھ دی ہے۔“

دل پر قابو نہیں ہے اور ماں کب تک ہمیں بیٹیاں رکھے گی۔ کل تم نے سنا تھا کہ بھری تھیں یہ میرا نام لگایں گے۔ ارے ہم لڑکے ہیں یہ ہماری تربیت ہے۔ ماں کے ہاتھوں چپ چاپ مار کھا لیتے ہیں۔
”لو لڑکیوں کو بھوکھان کی مامیں ان کے سامنے ناپ لال لڑکی ہیں کماؤ پوت بیٹے خاندان ہو جائیں۔ ماں ہمیں اپنے اشاروں پر چلانا ہوتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا یوں بھی ماں نے کبھی ہماری شادیاں نہیں کرنی ہیں۔ میں اس ہوشیاری کا ہو گیا ہوں اور تم بھی سوچ لو۔ یہاں جب ماں اپنی رہ جائیں گی تو معلوم ہوگا کہ میرے جیسے بچے کو اور بچے زعم وانا کی جھینٹ۔“

گنتی آرا دیوار کو تھام نہ لیتیں تو چکر کر گر جاتیں۔ ساری رات اس گھر کی چھت تلے سب ہوں نہ نہ پائے تھے سب کے ذہن چل رہے تھے مگر دل جدا تھا فیصلے الگ الگ تھے۔
”صبح بے حد روشن اور اچلی اچلی سی تھی۔ جب گنتی آرا جانے کے لیے تیار کھڑا تھا تو گنتی آرا مال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اس سے گھوٹا شام کو جلدی آجائے میں نے اس کی اور زویا کی شام کو منگنی طے کی ہے۔ صبح میں گئی تھی نصیرا کی طرف، اس کے ساتھ اس کے بعد اگلے ہفتے شادی کے دن بھی رکھ لیں۔ میں آفس سے چھٹی لے لے۔“

گنتی آرا نہ مٹے پن سے بولی تھیں اور وہ نہال ہو گیا تھا۔ ماں کے گلے جاگتا تھا۔ دنیا کی کوئی بھی ماں اگر یہ دیکھے کہ اس کی اولاد کی خوشی ہی اس کی اپنی خوشی ہے تو اس کی دل کے شیرازے نہ ٹھہریں۔ شام بے حد خوب گنتی آرا شیریں اور زویا منگنی کے بعد کن کھیں سے ایک لڑکچہ کرجی ہی جی میں مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

پھر زویا اس کی زندگی میں پہلی بھار کے لیے کی طرح داخل ہو گئی تھی۔ عادل، اسد، مناور گنتی آرا کے آنے کے بعد بہت خوش تھے ان کے

سارے دوستوں کی بھابھیاں ان کے دیواریوں کو من پسند پکوان بنا کر کھلائی تھیں۔ فرمائش کی جاتی تھی اور بھابھی من و عن پورا کر دیتی تھی۔

کچھ دنوں بعد عید بھی سب ہی بہت زیادہ پر جوش تھے اس عید کی صبح ان کے نام کی پکار نہیں پڑی تھی سارے کام بھابھی نے جو بنائے تھے۔ مگر ان کے خواب چکنا چور ہو گئے جب عید کی صبح بھی بھابھی صاحبہ اپنے ہسٹر پر نحو استراحت تھیں۔ گھر اندر جا رہا تھا، رات کو بارش اور آندھی سے گھر کا نقشہ بگڑ گیا تھا۔ کچن میں رات کے گندے برتنوں کا ڈھیر جوں کا توں رکھا تھا جن پر گندنی کھیاں جھنجھناری تھیں۔ بدبو کی ہلک پھلکی ہوئی تھی۔

شیریں چار دفعہ زویا کو جگانے کی سعی کر چکا تھا پانچویں مرتبہ تھک ہار کر ماں کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔
”اماں زویا کو ڈانٹتی کیوں نہیں ہیں۔“ لہجہ بے زار سا تھا۔

”یہ تم میاں بیوی کا ذاتی معاملہ ہے اور جاؤ، شاباش گھر جلدی سے صاف کرو۔“

وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھیں۔ اسد فرش دھو رہا تھا۔ عادل نے گھر سمیٹا تھا، مناور بن دھو رہا تھا جبکہ خود شیریں سب کے لیے خستہ پڑے تیزی سے تیل رہا تھا کہ اب ایک مزید فرد کا اضافہ ہوا تھا اور زویا کھاتی لگی تو بہت تھی۔ جب تک گرم گرم ناشتا میز پر لگا اس وقت تک زویا نہ پانی دھوئی گھری سی باہر نکلی تھی۔
”عید مبارک ہو آئی!“

جبکہ گنتی آرا بھی خوش دلی سے عید مبارک کا جواب دیتے ہوئے یہ سوچ رہی تھیں۔ یہ عبرت ناک مثال باقی بیٹوں کے لیے کافی ہوگی مگر من پسند شادی کے بجائے ماں کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو ترجیح دیں گے۔
”ابھی ایک اور پر اٹھا تو لادیں یہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“ زویا نے زوردار آواز میں کہا تو ایک پل کے لیے شیریں کو لگا وہ کل بھی وہیں کھڑا تھا جہاں آج کھڑا ہوا ہے فرق صرف اتنا تھا کہ گنتی آرا کی جگہ زویا نے سنبھال لی تھی۔

☆☆

یہ تارا اور ایک تھکی کوکے

”نمین تارا“

..... آنکھوں کے پار دھندھی جیسے میں بار بار پلکیں جھپک کر روکنے کی کوششوں میں تھی مگر بے سود۔ خط سانس بھر کر رہ گئی تھی..... میرا رین کوٹ میرے پیروں میں پڑا تھا اور میرا شولڈر بیگ سامنے..... جس میں سکوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔
نیشی تیز قدموں سے مجھے اپنی طرف آ دکھائی دی تھی..... اس نے گولڈن ڈارک میکسی برا لبا سا منظر لے رکھا تھا اور کانوں میں چنبیلی

چھ سال دس مہینے بعد بھی اس آواز نے مجھے پتھر کر دیا تھا یہی تو وہ آواز تھی، لہجہ تھا جو نین تارا کو راہ سے بھٹکا دیتا تھا..... سلور مومن کی سیرھیوں کے آخری اسٹپس پر میں بیٹھی تھی..... رنگ، نور، روشنیاں، تہقہ کچھ بھی تو متاثر کن نہیں تھا واقعی نہیں تھا..... یا پھر میں ہی دل مردہ کے بیٹھی تھی..... جب دل مردہ ہوتے ہیں تو انسان زندہ کیسے رہتے ہیں؟ کتنی عجیب بات تھی کہ میں زندہ تھی



kiBooks.Site

پھولوں کے بڑے بڑے بالے تھے۔ وہ تیس سال کی عمر کی بھی مقابل سے بات کرتے وقت وہ کانوں کے بالوں کو گھمائی رہتی تھی۔ دو طلاقیں اور بے شمار بریک اپس کے بعد وہ آج کل فری تھی۔ وہ آتے ہی چپکڑا مارے میرے قریب بیٹھ گئی تھی۔

”آہ، یہ زندگی..... اور بیٹھوون کی دھنیں۔“ وہ زندگی کو بیٹھوون کی دھن کہتی تھی۔ روحانی اسرار بھری۔ ”تارا..... تم کا بے ادھر بیٹھا ہے؟“ میری زندگی میں آنے والی وہ میری ایسی دوست تھی جو میرے بارے میں اندازے لگانے کی کوششوں میں مصروف رہتی تھی۔ وہ ایک لکھنؤ اور اچھی دوست تھی۔!!!

”ویسے ہی محسن ہو رہی تھی..... دل پریشان ہو رہا تھا۔“ میں ہولے سے مسکرائی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح چڑ گئی تھی۔

”تم سچ کیوں نہیں کہتا تارا..... تمہارا دل اداس ہے۔“ وہ نے کوشا نہ مانگتا ہے۔ رے کے آنسو بہانا چاہتا ہے۔ وہ میرے شخص کے سچ ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟ میرے دل میں چپ کی آوازیں تھیں۔

”نینسی تم بہت نرم کی ماہر ہو یا ٹیلی بیٹھی کا علم جانتی ہو؟“ میں نے کسی میں بات کو اڑانا چاہا تھا۔ ”ہم نہیں جانتا ہے تارا..... اپنا دوست کو..... یہ جادو داد دیتا ہے.....“ وہ قطعیت اور بھرپور انداز میں بات کرتی تھی۔ سو فیصد نہیں تو تیس فیصد ضرور اس کی باتیں سچی ہوتی تھیں۔

”پھر تمہیں کیا پتا چلا.....؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد سلور مومن کی سیڑھیاں چھوڑتی ہم دونوں ایک چرچ کی روش پر ٹہل رہی تھیں۔ دعاؤں کی آوازیں سفید کھڑکیوں سے باہر سنائی دے رہی تھیں۔ مقدس مریم کے چرنوں میں جلتی بجتی موم کی روشنیاں بھی۔

”ہم لڑکی لوگ دو باتوں پر دل اداس کر لیتا ہے اور رونا مانگتا ہے.....“

”کون سی دو چیزیں پر۔“ قادر بشب کینڈل اسینڈ تھا۔ سامنے سے گزرتے ہوئے مسکرائے تھے۔

”پہلی چیز بریک اپ.....“ اور دوسری.....؟“ ”دوسری چیز طلاق۔“ چنبیلی کے بالے ساکت تھے۔ ہم دونوں ٹھہر گئی تھیں۔ دوسرا فیسی لڑکے کینڈیاں بانٹنے پھر رہے تھے۔ ایک لڑکی جس کے بال ہائیز روجن سے رنگے تھے اپنے کتے کو سینے سے لگائے گزرتی تھی۔

”رونے کو، اداس ہونے کو صرف یہی وجوہات نہیں ہوتیں نینسی..... اس بار تم تیس فیصد بھی سچی نہیں ہو..... مجھے زندگی نے ان دو باتوں کے علاوہ بھی بہت دلایا ہے، تکلیف دی ہے۔“

”تم اتنا حساس کیوں ہے؟“ ”چنانچہ..... میں چاہ رہی خود کو بدل نہیں پائی..... آج بھی ویسی کی ویسی ہی ہوں۔“

”تم جھوٹ بولتا ہے۔“ ”اس میں کیا بات جھوٹ ہے؟“ دی ڈانر کے پروڈکشن ہاؤس سے بے ہنگم سروں کی آواز بلند ہوئی تھیں اور چند ہیٹ پہنے مچلے مومن واک کرنے لگے۔ آرتھر اسٹریٹ پر یہ روزانہ ہونے والا سرگرمیاں تھیں۔ کبھی بلاؤ نہیں آیا تھا بس کبھار اتنا ہوتا تھا کہ چہرے بدل جاتے تھے۔ دنیا میں گم ہو جاتے اور کچھ وقت کی دھول میں بالکل میری طرح..... نین تارا سکندر کی طرح.....

”تم بدل گیا ہے۔“ پہلے جیسا بات بات رونے والا ناہیں رہا..... بہت بہادر ہو گیا ہے۔ ہمارا یقین کرو۔“

”ال پر نظر جمائی میں پھر ٹھکی تھی..... میرا وہ ہم میرا کب کا یقین ہو چکا تھا..... وہ آواز، وہ کندھے پر پڑا ہاتھ وہ کس تو میں ہر کے بھی نہیں بھول سکتی تھی..... کبھی بھی نہیں.....!“

”نین تارا.....“ وہ اس شخص کی آواز تھی جس سے میں نے زندگی میں سب سے بڑھ کر محبت کی تھی اور آج بھی وہ اسی مقام پر تھا..... میں رکی تھی وہ سامنے آ گیا تھا وہ شخص جسے دیکھ کر نین تارا کا دل ہلکا ہوتا تھا..... وہ دو قدم کے فاصلے پر تھا..... مسکراتا ہوا ہاتھ باندھے کھڑا..... وہ ذرا بھی تو نہیں ہلا تھا..... وہی کشادہ نیشانی، جیل سے جے ال..... ستواں ناک اور شریہ آنکھیں..... جسم تھوڑا لمبا سا لگ رہا تھا۔

”میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا..... دن رات ایک کر دیا۔ تم نے خود کو کیوں گم کر دیا..... حالانکہ تم اچھی طرح جانتی تھیں کہ میں چیزیں ڈھونڈنے میں اہل کور ہوں۔“ رات کے ایک بجے مجھے بہادری کی صورت پڑی تھی..... اب وہ آیا تھا تو سب سامنے آتا تھا اور اب تو وہ چیزیں ڈھونڈنے میں ماہر ہو چکا تھا تو

ایا وہ کبھی کچھ جان چکا تھا، میرا دل بند ہونے لگا تھا..... ڈواٹ کی خوشبو بند حال کرنے والی تھی۔ ”میں تمہاری چیز نہیں تھی ارسل رحمان“ اور بس اتنی تک تھا۔ اس کی رنگت متغیر ہوئی اور اگلے سے وہ اٹھ سا گیا تھا..... میں اسے وہیں چھوڑتی آگے کی طرف بھاگی تھی..... پھر آنکھوں کے بار دھند تھی۔

”نینسی..... نینسی اور وہ کچھ رہ گئے تھے..... میری زندگی میں آنے والے دو لوگوں میں سے ایک ان میرے سامنے تھا..... جسے میں روتے ہوئے چھوڑ آئی تھی، جس سے میں نے بے تحاشا محبت کی تھی، جس کے لیے جان دی جا سکتی تھی، روایا جاسکتا تھا..... میں محبت کر چکی تھی، روئی تھی، بہت تھی، بس اک ”جان“ باقی تھی..... فقط ارزاں سی جان.....!!! اور دوسری ”وہ“ تھی جس سے میں نے عشق کیا

تھا۔ میری راز دار دوست..... حق ہا میری زندگی۔ “کو کب فیاض.....“

”کو کی ٹی وی پر آ رہی ہے۔“ اس تین کروں اور تنگ سے صحن والے گھر میں ٹیوی کی آواز یقیناً ہر ایک کو ہی سنائی دی تھی..... ٹیوی کو ایسی خبریں بریک کرنے میں بڑا مزا آتا تھا..... اور وہی ہوا تھا جس کی توقع تھی جو جہاں تھا وہیں تھم کر رہ گیا تھا..... بان کے پتے چھانٹتی دادی لکٹی بھول گئی تھیں..... تانی کے اون کے گولے بکھرتے ہوئے سیڑھیاں پار کر گئے..... صفیہ بیگم ہنڈیا کو چھینٹا دینا بھول گئی تھیں، پیاز جلنے کی تاگوار بو اس چھوٹے سے آنگن میں دھیرے سے پھیلی تھی۔ اس ساری صورت حال میں مومی ایک واحد شخصیت تھی جسے اب جا کر کہیں اطمینان حاصل ہوا تھا۔ جس گھر میں صبح و شام ”ڈرون حملے“ معمول میں شامل ہوں وہاں چند لمحے پہلے کی خاموشی چہ معنی دارو..... پریکٹیکل کی تیاری میں مشغول وہ خاصی بے چینی کا شکار تھی۔ اسے تھوڑی دیر پہلے کی چپ ہنسم نہیں ہو رہی تھی..... اور اب ڈرون گر چکا تھا..... آہستہ آہستہ

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور مہول



دستِ مہیا
گہچہ میا

قیمت - 400 روپے

مکتبہ اعلیٰ کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر 32735021

اثرات نمودار ہونے تھے۔ وہ آنگن میں لگے نیم کے بیڑے کے نیچے لگے جھولے پر پاؤں پیارے بیٹھ گئی تھی۔ ہر عمل کے جواب میں ایک رد عمل ضرور سامنے آتا ہے۔

سب سے پہلے داوی کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ ”تانیہ، ٹی وی کھولو۔“

اون کے دھاگوں سے الجھتی، منہ جھلتی تانیہ بمشکل ٹی وی تک رسائی حاصل کر سکی تھی۔ منظر سامنے تھا۔ ڈاکٹر پر اعتماد انداز میں تقریر کرتی بلاشبہ وہ کوکب فیاض ہی تھی۔ سلیپ سے سر پر دوپٹا جمائے، ڈاکٹر والی کھڑی پہنے، اسکول یونیفارم میں لمبوس، وہ ہاتھ لہرا لہرا کر مقابل کے جھکے چہرے ہی تھی۔ اس کی گونج دار آواز کا زیروہم سامعین کو مسحور کر چکا تھا۔

”آپ چاہتے ہیں ایک اور جناح آئے آپ کی سستی، کاٹلی اور سہل پسندی کا حل ڈھونڈے۔“ آپ غلط ہیں۔ جناح نے جو آپ کو دینا تھا وہ دے گئے۔ اپنی شخصی برائیوں کی جنگ آپ کو خود ہی کوڑا بنا ہوگی۔

پاکستان یہ۔ پاکستان وہ۔ یہ کیا ہے؟ ہر الزام پاکستان کے منہ کیوں مار دیا جاتا ہے؟ صاحب صدر! یہ غلط رویہ ہے، اس کی مذمت کی جانی چاہیے۔“ تالیوں کے شور میں کوکب فیاض چند لمحوں کو خاموش ہوئی تھی۔ ٹرائی کیمرے گھومتے سامنے آگئے۔ فلیش لائٹس وہ اسی حکمت اور وقار کے ساتھ کھڑی تھی۔ ٹشو باکس سے اب وہ ٹشو کھینچ کر ماتھے کا پسینہ صاف کر رہی تھی اور گھبراہٹ ہوئی ہرگز بھی نظر نہ آتی تھی۔ اس کا مکا ڈاکٹر کے فارمیکا پر زور سے پڑا تھا۔

”دھرتیاں خون مانگتی ہیں۔ خون سیال سے وجود میں آتی ہیں۔ سرتن سے جدا ہوتے ہیں۔ من ریزہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اوڑھنیاں پھٹ کر تار تار ہوتی ہیں۔“ تب اس کی آواز بھڑائی تھی ”پھر جا کر پاکستان ملا کرتے ہیں۔“ چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر چھوڑ چکی تھی مگر تالیوں کی مسلسل گونج میں ذرا بھر بھی کمی

واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ فاتح تھی۔ جیتنے آتی تھی۔ نڈر بے باک اور اسلاف پسند ہی تو کوکب فیاض تھی۔ اس گھر میں موت کی سی خاموشی تھی ایسا ناٹا جسم کی رگیں ٹوٹی تھیں۔

”صفیہ۔ یہ لڑکی چونڈے میں راگ ڈال رہی ہے۔“ پان کے پتے تخت سے اڑ کر پرے جا پڑے تھے۔ صفیہ خود بھی ہوئی کیفیت میں تھیں۔

”اماں قسم لے لیں مجھے خبر نہیں تھی کہ کوکب کرے گی۔“

”لڑکیوں کی عزت کچے گھر سے ہی ہوتی۔ بار بار پار نہیں لگتی۔“

”اسکول میں تو تقریریں کرتی تھی مگر یہ۔“ سینہ لگ گئی صفیہ۔ میرا فیاض کسی کو دکھانے جو گناہ نہیں رہے گا۔ لوگ کیا کہیں گے فیاض کی لڑکیاں اب ٹی وی پر آئیں گی۔ مردوں سامنے بڑھ بڑھ بولیں گی۔ تعریف وصولی کی ہے ناں کہ ایسے کام کن کے ہوتے ہیں؟“ وہ شعلوں کو ہوا دے گیا تھا۔

تانیہ گم صم سی بیٹھی تھی وہ بڑی خاموش تھی۔ کام کی بات کرنے والی ناپ تول کر بولی ہوئی کا شور تک اسے ڈراتا تھا۔ اور وہ ”وہ“ تھی چپ نہ رہنے والی۔ ہر بات کا ہر دلیل چوٹ لگانے والی۔ مقابل کو لا جواب کر دیتی تھی۔

”اماں۔ ایسے تو مت کہیں وہ پوٹی ہے آ کی۔“

”میں تو تین میں نہ تیرہ میں۔ باتیں تو نہ کرے گا۔ کس کس کا منہ بند کرو گی۔“

ٹی وی پر اشتہار ختم ہوا تھا۔ وہ خرابی تھا۔ اعتماد سی اسٹیج کی سیڑھیاں اتر رہی تھی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ خلیل ختم ہوا تھا اور وہ بازی جیت بھی چکی تھی!

☆☆☆

دیکھ کر۔۔۔۔۔ ہائے میرے بھائی کی عزت رل گئی۔۔۔۔۔ چھٹا تک بھر کی لڑکی زمانہ تھوڑا کرے گا۔۔۔۔۔ ارے صفیہ کیسی ترتیب سے چال چلی ہے، نا مارا نے۔۔۔۔۔ ٹی وی پر تو ادا کارائیں آتی ہیں۔ پچھو پچھو سترہ منٹ سے داویلا چار ہی تھیں۔

تانیہ تو توپوں کو پانی ڈال رہی تھی۔ مومی دوبارہ پناز کاٹ رہی تھی۔ دھوپ نیم کے بیڑے سے چھن چمن کر نیچے اتر رہی تھی۔ صفیہ نے کبھی کی انتہا پر نہیں۔ دماغ کی سٹی گم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ آواز سے میں اضطرابی کیفیت میں مسلسل ایک گھنٹے سے ٹپ رہی تھیں۔

”ہائے کوکی۔۔۔۔۔ تجھے اللہ پوچھے۔ آج تو دل پر گھر واپس نہ آئے۔“

”اماں میرا ظفر تو اتاؤ لا ہو رہا تھا۔ جوان لون ہے گھر کی عزت کو یوں ٹی وی پر دیکھ کر کھول اٹھا۔ بہت سمجھا بھجا کر اسے ٹھنڈا کیا ہے۔“

”آپا۔۔۔۔۔ مجھے تو اس بات کی خبر اب ہوئی پہلے ہا ہوا تو نوبت ہی نہ آئے دیتی۔ میں تو بھی پہلے کی طرح ہی اسکول میں کوئی تقریری مقابلہ ہو گا۔“ داوی نے بات پکڑ لی تھی اور غصے سے خوب آگ بگولا اڑائی تھیں۔

”ساری تمہاری شہ دی ہوئی ہے۔ ایک تو ہمارے بیٹیاں میرے بیٹے کی جان کو آگئیں۔ ایک ہمارائی ہر روز روٹھ کر آ جاتی ہے اور تین یہاں بیٹے پر ٹونگ دل رہی ہیں۔“ تانیہ کا ٹنگین آسودہ بیٹے میں گم ہوا تھا۔ مومی پر یکیشیل کی کاپی تھاے بیٹھی تھی اسے ابھی کچھ ڈائیگرامز اور چارٹ بنانے تھے۔ مگر دماغ اس سارے ہنگامے نے تھکا کر رکھ دیا تھا۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ دھوپ سمٹ کر اواروں پر آ گئی تھی سائے ابھی طویل نہ ہوئے تھے۔ غصے د غصے میں بھرے فیاض احمد دروازے کو ٹھوکر مارتے اندر آئے تھے۔ ان کی طبیعت میں ہمیشہ سے غصہ، طیش اور جلد بازی تھی۔ ہر بات پر فوری طور پر رد عمل کا اظہار کرنے

والے اور کسی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ تانیہ ابھی بھی باجرے کی کھیل تھاے ہوئی تھی جسے اسے کسی نے جادو سے منجید کر دیا تھا۔ پنیلینس تراشی مومی بھی دہل گئی تھی۔ پچھو جا چکی تھیں۔ داوی نے ابھی دوا لی لی تھی۔

”صفیہ، صفیہ باہر آؤ۔“ صفیہ ہانپتی کانپتی ہوئی بیڑھیوں پر آن کھڑی ہوئی تھیں۔

”جی۔“

”یہ میں کیساں کر رہا ہوں۔“

”وہ۔۔۔۔۔ میں۔“ وہ ٹھٹھک کانپ رہی تھیں۔ پاؤں کی ٹھوکر سے گملا ٹوٹ چکا تھا اور مٹی آنگن میں بکھر گئی تھی۔ تانیہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ آج ہی تو اس پر پھول آیا تھا۔ جس کا انتظار وہ پچھلے بیس دنوں سے کر رہی تھی۔ وہ جب چاپ دیکھے گی۔ آنکھوں میں جیسے کوئی کالج ٹوٹا تھا۔ ابا زور زور سے چلا رہے تھے۔

”لعنت ہو فیاض احمد تم پر۔ آج لوگ مجھے مبارک بادیں دے رہے ہیں کہ میری بیٹی ٹی وی پر آ رہی ہے۔ تم نے اور تمہاری بیٹیوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

”میری بیٹیاں۔۔۔۔۔؟“ وہ سسکی تھیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تمہاری بیٹیاں۔۔۔۔۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے ایک وارث تک نہیں دے سکیں۔ کم از کم ان کی تربیت تو اچھے سے کی ہوئی۔“ اماں دو پٹا منہ پر رکھے بیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھیں۔

”وارث پیدا کرنا میرے ہاتھ میں تھا۔؟“ وہ سوال ابا کو چاک کی طرح لگا تھا اور وہ بلبل کر رہ گئے تھے۔

”انہیں پیدا کرنا تو تمہارے ہاتھ میں تھا۔“

”میں نہ کہتی تھی فیاض احمد اس عورت کو اور ان تینوں کو لگام ڈالو۔ کہیں کا نہیں رہنے دیں گی تمہیں۔ مگر جب ماں کی بات نہ سنی۔ اب بھگتو۔“ آگ لگانے کے لیے داوی کو بھی ماموس کی ضرورت نہیں پڑی تھی مگر ابا کو ضرورت پڑ گئی تھی۔

اثرات نمودار ہونے تھے۔ وہ آنگن میں لگے نیم کے بیڑے کے نیچے لگے جھولے پر پاؤں پیارے بیٹھ گئی تھی۔ ہر عمل کے جواب میں ایک رد عمل ضرور سامنے آتا ہے۔

سب سے پہلے داوی کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ ”تانیہ، ٹی وی کھولو۔“

اون کے دھماگوں سے الجھتی، سنبھلتی تانیہ بے شکل ٹی وی تک رسائی حاصل کر سکی تھی۔ منظر سامنے تھا۔ ڈاکٹر پر اعتماد انداز میں تقریر کرتی بلاشبہ وہ کوکب فیاض ہی تھی۔ سلیقے سے سر پر دوپٹا چمکائے، ڈاکٹر والی کھڑی پہنے، اسکول یونیفارم میں ملبوس، وہ ہاتھ ہلکا ہلکا مقابل کے جھکے چمڑا رہی تھی۔ اس کی گونج دار آواز کا زبردست سامعین کو مسحور کر چکا تھا۔

”آپ چاہتے ہیں ایک اور جناح آئے آپ کی سستی، کاٹلی اور ہل پندی کا حل ڈھونڈے۔“ آپ غلط ہیں۔ جناح نے جو آپ کو دینا تھا وہ دے گئے۔ اپنی شخصی برائیوں کی جنگ آپ کو خود ہی کوڑتا ہوگی۔

پاکستان یہ۔ پاکستان وہ۔ یہ کیا ہے؟ ہر الزام پاکستان کے منٹھے کیوں مار دیا جاتا ہے؟ صاحب صدر! یہ غلط رویہ ہے، اس کی مذمت کی جانی چاہیے۔“ تالیوں کے شور میں کوکب فیاض چند لمحوں کو خاموش ہوئی تھی۔ خرابی کیمرے گھومتے سامنے آ گئے۔ فلیش لائٹس وہ اسی حکمت اور وقار کے ساتھ کھڑی تھی۔ نشوونما کیس سے اب وہ نشوونما کر ماتھے کا پسینہ صاف کر رہی تھی اور گھبراہٹ ہوئی ہرگز بھی نظر نہ آتی تھی۔ اس کا مکا ڈاکٹر کے فارمیکا پر زور سے پڑا تھا۔

”دھرتیاں خون مانگتی ہیں۔ خون سیال سے وجود میں آتی ہیں۔ سترن سے جدا ہوتے ہیں۔ من ریزہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اوڑھنیاں بھٹ کر تار تار ہوتی ہیں۔“ تب اس کی آواز بھرا آئی تھی ”پھر جا کر پاکستان ملا کرتے ہیں۔“ چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر چھوڑ چکی تھی مگر تالیوں کی مسلسل گونج میں ذرا بھر بھی کمی

واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ فارغ تھی۔ جیتنے آتی تھی۔ نڈر بے باک اور اسلاف پسند وہی تو کوکب فیاض تھی۔ اس گھر میں موت کی سی خاموشی تھی۔ ایسا سنا جسم کی رگیں ٹوٹی تھیں۔

”صفیہ۔۔۔ یہ لڑکی چونڈے میں راکھ ڈال رہی ہے۔“ پان کے پتے تخت سے اڑ کر پرے جا پڑے تھے۔ صفیہ خود بھی ہوئی کیفیت میں تھیں۔

”اماں قسم لے لیں مجھے خبر نہیں تھی کہ کوکی کرے گی۔“

”لڑکیوں کی عزت کچے گھڑے سی ہوتی۔ بار بار پارتی نہیں گئی۔“

”اسکول میں تو تقریریں کرتی تھی مگر یہ۔“ سیندھ لگ گئی صفیہ۔ میرا فیاض کی کوکب دیکھانے جو گناہیں رہے گا۔ لوگ کیا کہیں گے فیاض کی لڑکیاں اب بیوی پر آئیں گی۔ مردوں سامنے بڑھ بڑھ بولیں گی۔ تعریف وصول کی ہے ناں کہ ایسے کام کن کے ہوتے ہیں؟“ وہ سہ شعلوں کو ہوا دے گیا تھا۔

تانیہ گم صم سی بیٹھی تھی وہ بڑی خاموش تھی۔ کام کی بات کرنے والی ناپ تول کر بولی ہوئی ہو کا شور تک اسے ڈراتا تھا۔ اور دوسرے ”وہ“ تھی چپ نہ رہنے والی۔ ہر بات کا ہر دلیل چوٹ لگانے والی۔ مقابل کو لا جواب کر دیتی تھی۔

”اماں۔۔۔ ایسے تو مت کہیں وہ پونی ہے آ کی۔“

”میں تو تین میں نہ تیرہ میں۔ باتیں تو کر کرے گا۔ کس کس کا منہ بند کر دو گی۔“

ٹی وی پر اشتہار ختم ہوا تھا۔ وہ خرابی تھا۔ اعتمادی اسٹیج کی میز صفاں اتر رہی تھی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کھیل ختم ہوا تھا اور وہ بازی جیت بھی چکی تھی!

☆☆☆

دیکھ کر۔۔۔ ہائے میرے بھائی کی عزت رل گئی۔ چھٹا تک بھڑکی لڑکی زمانہ تھوکتو کرے گا۔ ارے صفیہ کیسی ترتیب سے چال چلی ہے، تانیہ نے دیوی پر تو ڈاکٹر کا راز کھائی ہیں۔“ پچھو پچھو سترہ منٹ سے دوایلا چار رہی تھیں۔

تانیہ تو توں کو پانی ڈال رہی تھی۔ موی دوبارہ باز کاٹ رہی تھی۔ دھوپ نیم کے بیڑے سے چمن پن کر نیچے اتر رہی تھی۔ صفیہ نے مہی کی انتہا پر تھیں۔ دماغ کی سٹی گم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ برآمدے میں اضطرابی کیفیت میں مسلسل ایک گھنٹے سے ٹپ رہی تھیں۔

”ہائے کوکی۔ تجھے اللہ پوچھے۔ آج تو وہاں پر گھر واپس نہ آئے۔“

”اماں میرا ظفر تو اتنا ولا ہو رہا تھا۔ جوان خون ہے گھر کی عزت کو یوں بیوی پر دیکھ کر کھول اٹھا۔ بہت سمجھا بھجا کر اسے ٹھنڈا کیا ہے۔“

”آپا۔۔۔ مجھے تو اس بات کی خبر اب ہوئی پہلے ہوتا تو تو بت ہی نہ آنے دیتی۔ میں تو بھی پہلے کی طرح ہی اسکول میں کوئی تقریری مقابلہ ہو گا۔“

داوی نے بات پکڑ لی تھی اور غصے سے خوب آگ بگولا ہوئی تھیں۔

”ساری تمہاری شہ دی ہوئی ہے۔ ایک تو ہار بیٹیاں میرے بیٹے کی جان کو آئیں۔ ایک مہارانی ہر روز روٹھ کر آ جاتی ہے اور تین یہاں سینے پر ٹوٹ کر رہی ہیں۔“ تانیہ کا ٹینک آنسو دھوئے میں گم ہوا تھا۔ موی پر کینیکل کی کاپی تھا سے بیٹھی تھی اسے ابھی کچھ ڈائیکریٹ اور چارٹ بنانے تھے۔ مگر اماں اس سارے ہنگامے سے تھکا کر رکھ دیا تھا۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ دھوپ سمٹ کر اندر آ رہی تھی سائے ابھی طویل نہ ہوئے تھے۔ غصے و غضب میں بھرے فیاض احمد دروازے کو ٹھوکر مارتے اندر آئے تھے۔ ان کی حرکت میں ہمیشہ سے غصہ، طیش اور جلد بازی تھی۔ ہر بات پر فوری طور پر رد عمل کا اظہار کرنے

والے اور کسی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ تانیہ ابھی بھی باجرے کی کھلی تھا سے ہوئی تھی جسے اسے کسی نے جادو سے منجھ کر دیا تھا۔ پینسلین تراشی موی بھی دہل گئی تھی۔ پچھو جا چکی تھیں۔ دادی نے ابھی دوایلی تھی۔

”صفیہ، صفیہ باہر آؤ۔“ صفیہ ہانپتی کانپتی ہوئی میز صفاں پر آن کھڑی ہوئی تھیں۔

”جی۔۔۔“

”یہ میں کیا سن کر آ رہا ہوں۔“

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ وہ مقررہ کانپ رہی تھیں۔

پاؤں کی ٹھوک سے گلاٹ ٹوٹ چکا تھا اور مٹی آنگن میں پکھڑ گئی تھی۔ تانیہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ آج ہی تو اس پر پھول آیا تھا۔ جس کا انتظار وہ پچھلے بیس دنوں سے کر رہی تھی۔ وہ جب چاب دیکھے گی۔ آنکھوں میں جیسے کوئی کالج ٹوٹا تھا۔ ابا زور زور سے چلا رہے تھے۔

”لعلت ہو فیاض احمد تم پر۔ آج لوگ مجھے مبارک بادیں دے رہے ہیں کہ میری بیٹی بیوی پر آ رہی ہے۔ تم نے اور تمہاری بیٹیوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

”میری بیٹیاں۔۔۔؟“ وہ سسکی تھیں۔

”ہاں۔۔۔ تمہاری بیٹیاں۔۔۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے ایک وارث تک نہیں دے سکیں۔ کم از کم ان کی تربیت تو اچھے سے کی ہوئی۔“

اماں دو پٹامنہ پر رکھے میز صفاں پر بیٹھ گئی تھیں۔

”وارث پیدا کرنا میرے ہاتھ میں تھا۔؟“

وہ سوال ابا کو چاک کی طرح لگا تھا اور وہ بلبلہا کر رہ گئے تھے۔

”انہیں پیدا کرنا تو تمہارے ہاتھ میں تھا۔“

”میں نہ کہتی تھی فیاض احمد اس عورت کو اور ان بیٹیوں کو لگام ڈالو۔ کہیں کا نہیں رہنے دیں گی تمہیں۔ مگر تب ماں کی بات نہ سنی۔ اب بھگتو۔ آگ لگانے کے لیے داوی کو بھی بھی ماچس کی ضرورت نہیں پڑی تھی مگر ابا کو ضرورت پڑ گئی تھی۔

وہ ایک پوش ایریا تھا۔ لائن میں سارے بنگلے تھے اور سب کے سب ایک سنے بڑھ کر ایک تھے۔ سامنے روش کے گرد درختوں کی قطاریں تھیں۔ کچھ بچے پڑے تھے جن پر چند لڑکیاں ناول کے مطالعے میں مشغول تھیں۔ کچھ بوڑھے انکل بوگا میں مصروف تھے اور بچے فٹ بال کھیل رہے تھے پانچ منٹ کی تلاش دوسرا کے بعد وہ اپنے مطلوبہ گھر کے سامنے موجود تھی۔ جدت اور قدامت کا اک حسین امتزاج لیے وہ ایک منفرد سی کوٹھی تھی۔ جس کی دیواریں سویٹ پی اور ایرو کی ریاسے ڈھکی تھیں۔ دو منزلہ کوٹھی کی عمارت کے شیشے ہلکی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نانا کا گھر اتنا خوب صورت ہوگا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ آخر اس نے حواس بحال کرتے ہوئے نیل بجائے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔

☆☆☆

میں نے سراٹھا کر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا تھا اور عقل کو کوسا تھا کہ میں کہیں غلط پتے پر تو نہیں آ گئی تھی۔ میرے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا۔
”اوہ..... مائی گاڈ..... تو آپ میرا پیچھا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی ہیں۔“ میں لڑبڑاتی تھی۔
”جی نہیں اب میں اپنی پاگل بھی نہیں اور نہ ہی میرا دامخ خراب ہوا ہے۔“
”تو کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“ سامنے والے کی آواز دکھ سے پھٹ گئی تھی۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کیا میں اتنا پینڈسم بھی نہیں کہ لڑکیاں میرا پیچھا کریں۔“ بے چارے کو نئے سرے سے قلع ہوا تھا۔

”یہ تو آپ لڑکیوں سے پوچھیں۔“
”تو کیا آپ لڑکی نہیں ہیں؟“ اسل مسکرایا تھا۔ مجھے اس بدتمیز شخص پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔
”جہنم میں جاؤ۔“ میں آگے بڑھی تھی کہ وہ پیچھے سے پکارتا رہا گیا۔

”ارے..... سنیں تو۔“ میں رکنے والی نہیں تھی مگر اسی وقت ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی تھی۔ شیشے نیچے ہوئے تھے اور ایک گرلیں فل سی شخصیت نے باہر بھاگنا تھا۔ ”میں آپ کو کس سے ملنا چاہتی؟“ میں نے پتا نہیں بتایا تھا۔
”یہی گھر ہے آپ اندر آ جائیں۔“
سرخ اینٹوں سے بنے فرش پر ہونے سے پاؤں رکھتی، ہینڈ بیگ مضبوطی سے پکڑے میں آگے بڑھ آئی تھی۔

”جشید انہیں بابا کے پاس لے جاؤ..... وہ لائبریری میں ہوں گے۔“ ان کا ملازم جشید مجھے لائبریری میں لے آیا تھا۔ آہنی قد آدم الماریوں میں درجنوں کتابیں پڑی تھیں۔ فرش عالیچوں سے مزین تھے۔ دیوار گیر جاپانی کھڑی صج کے آٹھ بجا رہی تھی۔ وہ جو بھی تھے ریڈنگ چیز پر آہستہ جھولتے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے کتاب کا سرورق میرے سامنے تھا۔ میں حیران رہ گئی تھی وہ میری بھی فیورٹ کتاب تھی۔ (عشق کے چالیس اصول) (Forty rules of love)

”اسلام علیکم۔“ انہوں نے سراٹھایا مسکرائے۔
”علیکم السلام۔“
”میں، میں نین تارا ہوں۔“ جانے کیوں میرا لہجہ ذرا سا کپکپاتا تھا۔

”یارا نام..... آپ بیٹھیں ناں۔“ کاشن کے سفید سوٹ میں مجھے وہ بہت سادہ اور پروقار انسان لگے تھے۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ کتابیں پڑھتی ہیں؟“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا پہلی ملاقات میں ہی وہ کیسا سوال کر رہے تھے شاید وہ کافی دوستانہ مزاج کے تھے۔

”جی مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“
جواباً میں مسکرا کر کہا تھا۔ وہ ریور اٹھا رہے تھے۔
”جشید دو چائے لاؤ۔“ پھر وہ مکمل طور پر میری طرف متوجہ ہوئے تھے جانے میرے بارے جاننے کے بعد ان کا رویہ کیسا ہوگا۔ میرا دل زور زور سے

دھڑک رہا تھا۔
”میں لیفٹ شفق کے ناول پڑھ رہا ہوں کمال ناول ہے مولانا جلال الدین روٹی اور عکس تیریز کا قصہ ہے۔“

”جی..... میں نے پڑھ رکھا ہے یہ میرے پسندیدہ ناولز میں سے ایک ہے۔“
”واؤ گریٹ..... ورنہ آج کل کے بچے تو کتابوں سے دور بھاگتے ہیں۔“

میری امی کو بہت شوق تھا کتابیں پڑھنے کا انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا۔ ناول کے صفحے موڑ کر انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

”آپ کی امی یقیناً ایک اچھی خاتون ہوں گی۔“
میں بار بار انہیں دیکھنے پر خود کو مجبور پارہی تھی۔ جانے کیسی اپنائیت، شمس اور انسیت مجھے ان کے وجود سے جڑی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید خون یونہی خون کو اپنی طرف کھینچتا ہوگا۔

”اے آئی کم ان.....؟“ اس اجازت مانگ کر آنے والی آواز کو بھلا میں کیسے بھول سکتی تھی۔ وہ رے میں چائے کے تین کپ لے آیا تھا۔
”آج بر خوردار آپ کو اجازت کی ضرورت کیسے پیش آ گئی.....؟“ وہ سامنے سنگل صوفے پر ڈھے سا گیا تھا۔

”کچھ تو ادب و آداب سے میں بھی واقف ہوں۔“

”جی ہم اچھی طرح واقف ہیں۔“ وہ زرب لب مسکرائے تھے۔ میں چائے کی پیالیوں سے اٹھتی بھاپ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اردو اب میں آپ کس سے متاثر ہیں؟“ ان کا رخ میری طرف تھا۔

”میری امی اور مجھے قرۃ العین حیدر شروع سے پسند رہی ہیں۔“ چائے کے سب لیتے وہ خوش گووار حیرت سے دو چار ہوئے تھے۔

”کیسا اتفاق ہے میں خود بھی قرۃ العین سے متاثر ہوں آخر شب کے ہمہ تن میں کئی بار پڑھ چکا

ہوں۔ ہر بار اک نیا مزہ ملتا ہے۔ ادب کی یہی تو بات ہوتی ہے کبھی پراتا نہیں ہوتا۔“ وہ سامنے بیٹھا کبھی اچھٹی سی نظر میری طرف بھی ڈال لیتا تھا۔ ان آنکھوں میں جانے کیوں مجھے ہر بار شرارت ہی نظر آتی تھی۔
”کچھ لوگ بھی کبھی بوڑھے نہیں ہوتے دادو۔“
”کس کے لیے کہہ رہے ہو.....؟“
”آپ کو کیا لگتا ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
”یقیناً میرے لیے۔“ شرارتی آنکھیں قہقہہ لگا گئیں۔

”میں تو بابا کے لیے کہہ رہا تھا۔“ وہ کپ رکھتے زور سے ہنستے تھے۔

”اپنے باب کی طرح ہی چالاک ہو.....“
”لیس آئی ایم۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”اچھا دادو چلتا ہوں کہیں جانے لگا ہوں..... اوکے مس نین تارا۔“ وہ میرا نام کیسے جانتا تھا شاید جب میں اس گاڑی میں بیٹھی شخصیت سے مخاطب تھی تو وہ قریب ہی تھا۔ جاسوس۔

”تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“
فرمان صاحب نے پوچھا تھا۔ میں جوتی میں سر ہلانے والی تھی، وہ جاتے جاتے میرے لیے مصیبت کھڑی کر گیا تھا۔

”جی بہت اچھی طرح سے۔“ کاش میں سامنے پڑا کپ اٹھا کر اس کے منہ پر مار سکتی۔ ”اسیکٹری ٹائٹس“ کی دھن بجا تا وہ باہر نکل گیا تھا۔
”جی تو آپ کس این جی او سے ہیں؟“
”میں این جی او سے نہیں ہوں۔“ میں نے سر اٹھایا تھا۔

”اوہ سوری..... مائی مس ٹیک..... آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ وہ معذرت کے سے انداز میں بولے تھے۔
”جی میں نین تارا ہوں..... نین تارا بنت سکندر حیات۔“ میں جانتی تھی میرا لہجہ کپکارا تھا۔ اسی وقت میں نے فرمان صاحب کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا تھا۔ کہانی تمام ہونے کو تھی۔

140

☆☆☆

صبوحی باجی ملنے آئی ہوئی تھیں اور سسرال کے دکڑے رورہی تھیں۔ وادی کو خوب تاپ چڑھا تھا۔
 ”ارے تیرے ساس جیسی چنڈال عورت نہ کبھی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی ہوگی۔ ایسی ظالم اور ڈھونگی عورت۔“ صبوحی گود کے بیٹے کو لیے بیٹھی تھی باقی دواپنی خالاؤں کے پاس تھے۔ کوکب نے بھیگی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا تھا جو براٹھے کے ساتھ آلیٹ کھاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہے تھے۔

”پتا ہے کوکی خالہ..... ابو بہت گندے ہیں۔“
 ”نہیں سونو..... ابو بھی گندے نہیں ہوتے۔“
 ”دادی تو گندی ہوئی ہیں ناں۔“
 ”نہیں دادی بھی گندی نہیں ہوتیں۔“ برتنوں کا ڈھیر دھوتی تانیہ ان کی باتیں بغور سن رہی تھی۔
 ”ابو امی کو بہت مارتے ہیں۔“ کوکی کے حلق میں کچھ اٹکا تھا۔ گلابی ہاتھ پاؤں اور موٹی آنکھوں والے وہ دو معصوم فرشتے۔
 ”اور دادی بھی بہت گندی گندی گالیاں دیتی ہیں۔“ چھوٹا ناک سکڑتا کہہ رہا تھا ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔

”پتا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا تم لوگ پریشان مت ہوا کرو۔“ وہ کیسی تسلی تھی جو کوکی انہیں دے رہی تھی۔ تانیہ کو تاسف نے گھیرا تھا پلیٹوں کا ہلکا سا شور پیدا ہو رہا تھا۔

”خالہ..... آپ ہر بار یہی کہتی ہیں۔“ کوکب فیاض جان گئی تھی تعلیم یافتہ لوگوں کو تو دلیل چب کرا سکتی تھی مگر ان معصوم بچوں کو کوئی بھی دلیل راضی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بڑے ہو رہے تھے، انہیں آہستہ آہستہ سب سمجھ آ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

”سونو تم لوگ بہت اچھے ہو معصوم اور پیارے تم ان چھوٹی باتوں پر پریشان مت ہوا کرو ورنہ تمہاری امی بھی پریشان ہو جایا کرتی ہیں۔“ انہیں

پڑھتا ہے..... بڑا آدمی بننا ہے۔“ وہ سر ہلاتے غور سے اسے سنتے تھے۔ صبوحی اندر آئی تھی۔
 وہ بیس سال کی ایک لڑکی تھی مگر چالیس سے اوپر کی لگ رہی تھی۔ سب بہنوں میں وہ سب سے خوب صورت اور سمجھ دار تھی مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ زندگی پھر بھی اسی دائرے میں گھومتی رہتی ہے موی پلاسٹک کی بوتلیں کاٹ رہی تھی اسے گلدان بنانے تھے۔

”خالہ گلدان کیسے بنتے ہیں؟“
 ”ارے بہت آسان ہے تم لوگ بھی بنا سکتے ہو۔“
 ”جی آپ ہمیں گلدان بنانا سکھا دیں گی پلیز۔“
 قینچی سے کلیاں کاٹتی وہ مسکرائی تھی۔

”ضرور سکھاؤں گی میری جان..... جیسے جیسے میں کر رہی ہوں مجھے دیکھتے جاؤ۔“ نیم درک شروع ہو چکا تھا صبوحی مطمئن سی کوکب کے پاس آ بیٹھی تھی۔
 ”اور سنائیں آپ..... کیسی گزر رہی ہے؟“

تانیہ نے چور نظروں سے ان کے سوٹ کو دیکھا تھا جو آج وہ کوئی مسلسل چوٹی بار پہن کر آ رہی تھیں۔ ”کیا شادی کے بعد ہر عورت کی زندگی میں بس یہی کچھ رہ جاتا ہے..... خواہشیں، ادھر وہ خواب، حسرتیں۔“ زندگی سب عورتیں ایسے گزار دیتی ہیں؟ اماں، باجی اور.....؟؟
 ”تم ہر بار یہی سوال کرتی ہو کوکی..... اور ہر بار ایک ہی جواب ہوتا ہے میرے پاس۔“ وہ اٹھ کر کچن کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

”نیکا نیکا اکٹھا کر کے، جوڑ کے، فجر شام ایک کر کے چڑیاں گھونسلے بناتی ہیں اور پھر ایک آندھی کی دونوں کی محنت، ریاضت کو پر باد کر دیتی ہے..... آندھاں اچھی چیز نہیں ہوتیں۔“ کتنی شہدائی تھا کہ تھی وہ فلسفے کی..... گہری باتیں ابھی ہی مگر زندگی کے آگے تو مانو ساری کتابوں کے سبق بھول گئے تھے۔ صبوحی فیاض کو بھی زندگی نے جب ڈھنگ سے برتا تھا۔

”پریشان مت ہوا کریں آپ۔“ کوکب کو بس دلیلیں اور سلیاں دینا ہی تو آتا تھا۔
 ”میں انسان ہوں کوکب..... مجھے فرشتہ مت بناؤ

ہم شادی شدہ عورتوں کے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہوتی کہ سب بدل جائے اور ہم کبھی خوش رہنے لگیں۔“ صنفیہ آوازیں دے رہی تھیں کوکب باہر نکل گئی تھی۔ تانیہ نے صبوحی کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

”یہ کوکب کا کیا معاملہ ہے، وادی غصے میں تھیں۔“
 بانس کے جھنڈ پر شہد کی کلیاں منڈلا رہی تھیں۔
 ”کوکب نے ٹی وی کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا تھا۔“ غلم اور ہم نصایب سرگرمیوں کی دلدادہ صبوحی کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

”تو کیا وہ مقابلہ باریکی؟“ تانیہ برتن دھو چکی تھی اور اب ٹوٹی تلے آٹخ بھگور رہی تھی۔ صبوحی کینبٹ کھول کھول کر چپک کر نے لگی تھی۔
 ”نہیں..... جیت گئی۔“

”تو پھر؟“ مقابلہ جیتنے پر اس گھر کے لوگوں کا رویہ کم از کم اس کی سمجھ سے تو باہر تھا۔

”اعتراضی لی وی پر آنے پر ہے مقابلے کی بار بیت پر نہیں۔“
 ”مگر کیوں۔“

”وہی کے سولوگوں نے دیکھا ہوگا..... کیسی کیسی نظریں نہ پڑی ہوں گی..... زمانے کا ڈر۔“ سماج کی باتیں۔“ اور ایسی بات پر صبوحی کی ہنسی چھوٹی تھی وہ ہنسی روک نہیں پاتی تھی۔

”اف..... اف یہ ہم بدل کلاس لوگوں کی سوچ لب بدلے لگی۔“ موی گلدان اٹھائے اندر آئی تھی۔
 ”آپا دیکھیں۔“

”ارے واہ یہ تم نے بنائے ہیں یقین نہیں آتا۔“
 ”دیکھ لیں پھر ہر بار گھر کی مرغی دال برابر تو نہیں ہوتی۔“

تانیہ نے اسے دھوکا جڑا تھا۔ ”تم واقعی مرغی ہو۔“

شام سات بجے وحید بھائی انہیں لینے آ گئے تھے۔ جاتے وقت صبوحی کوکب کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔
 ”دلیل سے، لفظوں سے، عقل سے ہماری جنگیں

جیت لی جاتی ہیں تم کیوں جیتی ہوئی جنگ ہمارے کو تیار بیٹھی ہو۔“ کوکب فیاض..... یہی وقت ہوتا ہے اور چار دیواری جو کچھ کرنے کو اکساتی ہے ورنہ آگے تو بند کھڑکیاں ہی ملتی ہیں۔ جس، دھشت کے سوا کچھ ہاتھ آتا ہی نہیں..... راست طویل کسی مگر منزل آگے ضرور ہے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

☆☆☆

لاہری میں پن ڈراپ سائیکلس تھا۔ ”وہ کیا سمجھتی ہے اپنی اولاد کو آگے کر کے وہ مجھے موم کر لے گی..... ہر گز نہیں ساری زندگی اس نے مجھے بلیک میل کیا ہے ہر خواہش منوائی ہے لاڈلی بیٹی تھی میری، لاڈلے رشتے میں تو جان تک دے دی جاتی ہے۔ ہر چیز میں نے اس کے قدموں میں لا کر رکھ دی.....

بیٹیاں ایسی ہی تو ہوتی ہیں۔ مگر اس نے کیا کیا؟ میری دستار اچھالی۔ ایسے کرتا ہے کوئی اتنی محبت، پیار کا کیسا صلہ تھا..... ماں باپ کی اتنی قدر بھی نہ کی، جنہوں نے پالا پوسا..... پڑھایا لکھایا..... اور ایک انجان شخص کی وجہ سے سب مٹی میں ملا دیا۔“ میری طرف ان کی پشت تھی وہ شیشوں کے پار دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہوا میں مٹی کی مقدار کو بڑھتا ہوا محسوس کیا تھا۔

”چھوٹی سی تھی پاؤں پاؤں چلتی تھی کبھی میں نے گرنے دیا؟ روتی تھی تو میرا کلیجہ پھٹتا تھا، باپ تھا ناں..... خون تھی وہ میرا خون کا درد ہمیشہ خون کو ہی تو آتا ہے مگر فریال کو میرا درد نہیں آیا..... ذرا بھر بھی نہیں آیا نین تارا..... اب اس نے تمہیں وکیل بنا کر بھیجا ہے..... آخروہ سمجھتی کیا ہے مجھے؟ پتاؤ جواب دو۔“ وہ چلاتے ہوئے میری طرف مڑے تھے میز پر پڑے کپ پر کب کی چائے کی تین چکی تھی۔

ایسے سامنے کھڑے شخص کی ہر بات مجھے عجیب لگ رہی تھی۔ وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھے، وہ اپنی بیٹی کی وفات تک سے انجان تھے۔ میں نے جیسے اپنے آپ کو کسی سرنگ میں کھڑے پایا تھا اندھیرا دور دور تک ہینڈ بیک اٹھا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی زندگی نے عجب موڑ پر آ کر جنکشن بدلا تھا..... واپسی کا بھانک

سفر میرا منتظر تھا اور اس کے بعد؟ وہ اکیلا گھر جو میرا نہیں رہا تھا چچا زاد کی ہوس بھری نگاہیں دل چاہا دیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں..... اس کمرے کی ہر ہر شے مجھ پر ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی..... وال کلاک، وینڈ چائیم اور الماریوں میں قرونوں سے بند پڑی کتابیں۔

وہ بغور مجھے دیکھ رہے تھے۔ ”میں امی کی ہر غلطی کی آپ سے معافی چاہتی ہوں۔“

”غلطی نہیں گناہ! ماں باپ کی نافرمانی گناہ ہوتی ہے غلطی نہیں۔“ میں سر ہلاتی مڑی تھی اور پھر پہلی بار فرمان صاحب کی نظر بینڈ بیگ پر پڑی تھی جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر دور پار سے آیا ہو سمندر، دریا اور گھاٹیاں عبور کرتا اور پھر پتا چلتا ہے جہاں منزل ہوا کرتی تھی وہاں اب فقط ریت کے ٹیلے ہیں اونچے اونچے اور آندھیاں چلنے پر مصر..... اس کی آنکھیں، پیشانی بالکل فریال کی طرح تھیں۔ فرمان صاحب کا دل کانپا تھا مگر اتنا کے بت کہاں آسانی سے ٹوٹے ہیں.....؟ کبھی بھی تو نہیں۔ دروازے کے پنڈل پر میرے ہاتھ تھے جب میں نے پیچھے سے ان کی آواز سنی تھی۔

”اسے کہنا اب دستک دینے سے کوئی فائدہ نہیں، کچھ حاصل نہیں ہوگا جہاں اتنا عرصہ گزار لیا وہاں بڑھا بھی گزر جائے گا۔“

”وہ خود یہ دنیا چھوڑ کر جا چکی ہیں۔“

☆☆☆

فریال فرمان کی وکیل، ابھی اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے گئی تھی اور گلاس ٹیبل پر رقتہ چھوڑ کے گئی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے وہ رقتہ اٹھاتے کھڑکی کے سامنے والی کرسی پر آن بیٹھے تھے وہی موتیوں سی چمک دار لکھائی بچتے پانیوں سے لفظ۔

”السلام علیکم ابابا..... کیسے ہیں آپ؟ جانتی ہوں آپ سے سوال کرنے کا ہر حق میں کھو چکی ہوں اور اس میں آپ کی کوئی بھی غلطی نہیں ساری غلطیاں

زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ آپ سچ کہتے تھے کچھ باتیں، پھتیں وقت پر کچھ کیوں نہیں آتیں؟ دل چاند مانگے تو آسمان کی طرف سیڑھی کھڑی نہیں کر لی جاتی..... آج اپنی مرحومہ ماں، آپ کے اور بھائی بارے میں سوچی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے..... کاش اس وقت ایک تھپڑ مار کر کہہ دیتے کہ فریال تمہیں اپنی زندگی کے فیصلے لینے کا حق نہیں..... آپ نے ساری زندگی بس یہی تو نہیں کیا پھولوں کی چھڑی تک سے نہ مارا۔

اور اسی بات نے مجھے دل کی راہ کا راہی بنا دیا..... دل اور پیشانی اگر بغاوت پر اتر آئیں تو انہیں پھنڈر کے زور سے ضرور چپ کر دینا چاہیے..... یہ جو بغاوت ہوتی ہے ناں سراسر نقصان کرتی ہے..... سکندر حیات کی محبت نے مجھے ایسے ہی باغی کر دیا۔ مجھے سب بھول گیا ابابا..... سب کچھ یاد رہا تو فقط دل اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ محبت دنیا تو نہیں مگر دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ضرور ہوتی ہے جو اسے پوری دنیا سمجھتے ہیں غلط کرتے ہیں صرف محبت کے سہارے زندگی کہاں گزرتی ہے دل کی بھوک مٹ جاتی ہے مگر پیٹ کی بھوک؟ آپ کی نافرمانی نے کبھی سکون کا سانس تک نہیں لینے دیا اور یہی میری سزا تھی۔

سکندر کے جانے کے بعد زندگی نے مجھ پر بہت ستم کیے ابابا..... بہت..... آپ کی فریال ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اپنے کھڑے خود چن کر اپنی عمارت خود سے کھڑی کرنا پڑی..... آپ کی نواسی کے لیے اپنی بیٹی کے لیے..... زندگی کی ڈور کٹنے کو ہے ابابا۔ اب میرے پاس وقت بہت کم ہے..... بہت دل چاہتا ہے کسی روز چپکے سے آکر آپ کے سامنے کھڑی ہو جاؤں..... دھککاریں گے۔ ماریں گے مگر کب تک۔ آخر پھر گلے سے لگا ہی لیں گے۔ ساتھ ساتھ ماں باپ کا ظفر تو کائنات سے بھی بڑا ہوتا ہے..... مگر ڈرتی ہوں اور رک جاتی ہوں..... زندگی نے آپ کی فرد کے ساتھ اچھا نہیں کیا..... بہت تھوڑا

وقت ہے میرے پاس ہو سکے تو معاف کر دیجیے گا۔ دنیا کی بھیڑ میں آپ کی نواسی نین تارا بالکل ایسی ہے..... لاوارث..... اگر ہو سکے تو اسے پناہ میں لے لیجے گا۔ نواسی نہ سہی..... انسانیت کی خاطر ہی اسی میری نین تارا بہت معصوم ہے ابابا..... اور دنیا کا شاطر..... امید ہے میری غلطیوں کی سزا نین تارا کو نہیں پہنچتی پڑے گی۔

آپ کی لاڈلی فریال وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے..... آنے والی پھر موم کر چکی تھی اور اب کب کی جا بھی چکی تھی۔ انہیں وہ یاد آتی تھی سادہ لان کے جوڑے میں ملبوس، بار بار دوپٹا ٹھیک کرتی، کانپتے ہاتھوں کی لڑش پر قابو پاتی..... ہائے..... نین تارا سکندر حیات کا چائے کا لپ و لپ کا ویسا پارہ گیا تھا..... کپ پر چائے کی تہ بن چکی تھی وہ اضطرابی کیفیت میں ارسل حماد کا نمبر ڈائل کرنے لگے تھے..... شیشے کی کھڑکیوں سے دھوپ چھن چھن کر اندر گرنے لگی تھی..... وال کلاک..... لیارا بجا رہا تھا۔ وقت جاگ رہا تھا۔

☆☆☆

بڑے شہر کے بڑے لوگوں سے مجھے بے تحاشا خوف آیا تھا..... آسمان ہلکے بادل اوڑھنے کو بے تاب کھڑا تھا..... پھر وہی ریلوے اسٹیشن تھا، بڑے شہر کا بڑا ریلوے اسٹیشن..... دھاتی چست تھی ہوئی تھی..... ریل کی ہڈیاں ہلکی ہوئی تھیں۔

I hear my ink spill
When the spirit called 'I
descended'
The light flickering
My oil 'Lamp dying
While a drumbeat of
emptiness rose
Up the mountain !!!

”چلو..... تمہیں دادا نے واپس بلایا ہے۔“
ارسل حماد پھر سے میرے سامنے تھا، میری آنکھیں بھر

آئی تھیں پچھلے چالیس منٹوں میں، میں طرح طرح کے لوگوں کی نظریں برداشت کر رہی تھی ایک لاوارث لڑکی..... نین تارا سکندر حیات۔

”مجھ کیا رکھا ہے سب نے مجھے..... میں کوئی گڑیا ہوں یا کھلونا..... ٹھوکریں ماری جا رہی ہیں اور میں لڑھکتی پھر رہی ہوں..... دل ہے میرا، انسان ہوں میں، برداشت نہیں میری اتنی جتنا مجھے آزمایا جا رہا ہے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ دروازہ خود بردلا کر میرے پاس بیٹھ گیا تھا..... بارش کی پہلی بوند میرے بالوں میں کم ہوئی تھی۔

”سوری فار واٹ؟ میری زندگی میرا مسئلہ ہے تھک چکی ہوں میں سب سہتے اور کتنی جرات لاؤں خود میں..... کہاں تک برداشت کروں سارے دکھ، درد، تکلیفیں میرے واسطے ہیں۔“

”سب کی زندگی میں دکھ درد، تکلیفیں، آزمائشیں ہوتی ہیں نین تارا.....“ میں ارد گرد زرتے لوگ اسے اشارے کر کے دکھا رہی تھی۔

”انہیں دیکھو..... یہ ہنس رہے ہیں۔ مسکرا رہے ہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”ان کی ہنسی پر مت جاؤ نین تارا!!“ خٹک جتے ہوا کے زور سے اسٹیشن کے فرش پر اڑنے لگے تھے..... وہ میرا بینڈ بیگ تھامے کھڑا تھا..... ناچار مجھے بھی ساتھ اٹھنا پڑا تھا..... میں ہولے ہولے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

”تم فریال پچھو کی بیٹی ہو..... آج تو دادو نے مجھے سر پرانڈ کر دیا..... میری بڑی خواہش تھی کہ میرا کوئی کزن ہو اور وہی میرا بیسٹ فرینڈ بھی ہو۔“ وہ کتنا بولتا تھا..... وہ میری طرف بڑا تھا۔ ”ایک بات پوچھوں؟“

”جی.....؟“

”یہ تمہاری آنکھیں اتنی موٹی موٹی کیوں ہیں؟“ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ پوچھے گا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ میرے غصے

ادرس

ہوئی ہنسی تھی۔

”ارے..... مجھے کچھ نہیں ہوتا..... بہت سخت جان ہوں میں..... اپنے تقریری کیریئر میں دس ڈاکس تو بچکی ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ غزالی آنکھوں میں حیرت بھر گئی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”یہ میرے لیے معمول کی بات ہے۔“ وہ اترتی تھی۔

”آپ بہت اچھا بولتی ہیں..... لفظ، انداز، سب امیزنگ۔“

”اوہ ریکی..... سونائکس آف یو۔“ راہداری کے پلوں سے ٹکراتی دھوپ ان کے قدموں میں گر رہی تھی..... وہ دونوں جرنلزم ڈپارٹمنٹ کی طویل روش پر چہل قدمی کرتی رہی تھیں۔ وہ نین تارا سکندر کے لیے یادگار دنوں میں سے ایک یادگار دن تھا۔ وہ چالیس منٹ بہت قیمتی تھے جن میں انہوں نے دنیا جہان کے تمام موضوعات پر گفتگو کر لی تھی..... کوکب ایک زندہ دل اور پر اعتماد لڑکی تھی اس سارے عرصے میں جیتی گئی ثرائی ایک اعزاز کی طرح نین تارا پکڑے رہی تھی..... وہ بار بار متاثر ہو کر اسے دیکھتی تھی اسے کوکب فیاض جیسا بننا تھا۔

”جب تک ابا زندہ تھے میں نے پھر کسی مقابلے میں حصہ نہ لیا۔“ میں جانتی تھی اگر ایسا کرنی تو تعلیم کے دروازے ہم پر بند ہو جاتے..... ہم ٹڈل کلاس لوگوں کے پاس ایک تعلیم ہی تو ہوتی ہے جو کسی نئی زندگی میں روزن کا کام دیتی ہے ورنہ ہم جیسوں کے لیے زندگی بہت سی آزمائشیں تیار رکھتی ہے..... زندگی سے جنگ آسان نہیں ہوتی نینو۔“

وہ گہری باتیں کرتی تھی پیاز کی پرت جیسی..... ورق در ورق۔

”دادی کو ساری زندگی ابا کے ہاں وارث نہ ہونے کا قلق ہی رہا۔ کیا وارث کا ہونا نہ ہونا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے..... خدائی کاموں میں ہمارا کیا دخل۔“

ایک ملاقات میں ہی وہ گوڑی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ وہ دونوں اس کے بعد ساتھ ساتھ دکھائی دینے لگی تھیں..... کینٹین میں، لائبریری میں، ایڈمن بلاک میں، وہ ایک جان دو قالب تھیں..... ہر فری پیریڈ میں وہ یونیورسٹی کی نہر میں پاؤں ڈالے بیٹھی ہوتی تھیں..... دونوں سائنڈوں کے درختوں کی ٹہنیاں اور پھول نہر میں گرتے تھے..... برندوں کی آوازیں تھیں..... وہاں خاموشی اور بلا کا سکون ہوتا تھا۔

”میں خوش ہوں..... نانا اور ماموں بہت اچھے ہیں..... ارسل بھی بہت اچھا ہے بس کبھی کبھی مامی کی باتیں دل دکھاتی ہیں تو امی بہت یاد آتی ہیں کوکی..... اپنے گھر اور گھر والوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔“

”اتنی قوی مت ہوا کرو نینو، برا اثر پڑتا ہے وہ تمہارے نانا کا گھر ہے تمہاری امی کا حصہ ہے اس گھر میں اسے پرایا مت سمجھو..... زندگی ہر حال میں جینا سیکھو..... ماضی میں رہتے والے کبھی پرسکون نہیں رہتے۔“ وہ پاس پڑا پھول اٹھا کر کوکب کے کان میں اڑنے لگی تھی۔

”کوکو..... تم اتنی اچھی اچھی باتیں کیسے سوچ لیتی ہو۔“

”کوشش کرتی رہتی ہوں خوش رہنے کی، مثبت سوچنے کی..... ورنہ رونے دھونے کو تو بہت کچھ مل جاتا ہے۔“ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے وہ غار ہوتی کوکب کو دیکھنے لگی۔

”کبھی کبھی لگتا ہے تمہاری زندگی میں کوئی پریشانی نہیں..... تم بہت پرسکون دکھتی ہو۔“

”تمہارا پتا ہے کیا مسئلہ ہے نینو..... تم مسکراہٹ اور سکون کے پیچھے اٹھتے طوفانوں کو نہیں دیکھ پاتی ہو..... ایسے لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔“ نہر کے پانی میں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑتے رہے دائرے بنتے بگڑتے رہے اور پھول گرتے رہے..... کوکب فیاض وہیں بیٹھے بیٹھے جیسے گھر پہنچ گئی

تھی۔

پچھونے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”جی کہوں تو صنفیہ میری مرضی کوکب کے لیے ہی تھی مگر ظفر کا دل نہیں مانتا..... اب زندگی ہم نے تو گزارنی نہیں ہے..... بچوں نے آگے زندگی گزارنی ہے ہم بوڑھے اپنی زندگی تو گزار چکے..... زبردستی تو ہم اپنا فیصلہ مسلط نہیں کر سکتے۔“

صنفیہ بیگم نے اضطراب سے پوچھا تھا۔ ”ظفر کا دل کیوں نہیں مانتا؟“

”کہتا ہے اسے کوکب نہیں پسند کھلے مزاج کی اور زبان دراز ہے ہاں اگر تم تانیہ مجھے ظفر کے لیے دے دو تو۔“

”تانیہ..... مگر میں کیسے؟“ دادی نے پاندان اٹھایا تھا۔

”ارے کاہے فکر کرتی ہو..... تینوں تمہاری ہیں جس پر ہاتھ رکھ دو۔“ جگ سے گلاس میں شربت انڈیائی صنفیہ ٹپ اٹھی تھیں۔

”اماں..... وہ کوئی بھیڑ بکریاں نہیں ہیں جیتی جاتی لڑکیاں ہیں۔“ دیوار سے لگی کوکب پتھر ہو چکی تھی..... کھلا مزاج اور زبان درازی؟ لفظ، لفظوں سے بدل جاتے ہیں پر اعتمادی اور صاف گوئی کس ترازو میں تولی گئی تھیں۔ رات کو مومی کوکب فیاض کی وکیل ننی دادی کی عدالت میں حاضر تھی۔

”کوکب نہیں تو تانیہ بھی نہیں..... یہ کہاں کا انصاف ہے۔“

”شہزادے نہیں اتریں گے تمہارے لیے..... گز بھر کی تو زبان ہے تمہاری۔“

”دادی..... آپ نا انصافی سے کام لے رہی ہیں۔“ مومنہ فیاض کی دہائی کو صنفیہ بیگم نے بریک لگا دیا تھا۔

”مومی..... بڑوں کی باتوں میں تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ جارحانہ پڑھنے لگی تھی۔ مومنہ کی باتیں دادی کو ناگوار گزری تھیں۔ تانیہ کچن کی کھڑکی میں کھڑی تھیلیوں کو گھور رہی تھی..... زندگی

کے رنگوں میں یہ کون سا رنگ آن شامل ہوا تھا۔ پچھلے سترہ منٹ دس سیکنڈ سے عدالتی کاروائی چپ چاپ سنی کوکب فیاض میز جیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”امی آپ پچھو کو تانیہ کے لیے ہاں کر دیں۔“ ڈرون گر چکا تھا..... مومی کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا بائس کے بودوں پر بلی دیوار سے کودی تھی..... تانیہ نے آنسوؤں کو بہنے دیا اور دیوار سے ٹیک لگالی تھی۔ زندگی کی گاڑی ایک اور جنٹلشن بدل چکی تھی زندگی اور انسان ساتھ ساتھ ہی تو بدلتے ہیں نین تارا سکندر کیسے کوکب فیاض کی ہنسی کے پیچھے جیسے طوفانوں کو بھانپ سکتی تھی مسکراہٹ ایک پردے کا عکس ہوئی ہے۔ بار بار اٹھنے والی..... آہ.....!!!

☆☆☆

”کبھی کبھی ہوتا ہے نہ ایسا کہ ہمیں زندگی سے، اپنے ماحول سے، ارد گرد کے لوگوں سے بے تحاشا شکایتیں ہوتی ہیں مگر پھر اچانک ہماری زندگی میں کوئی ایسا آتا ہے کہ پھر آہستہ آہستہ ہماری سب شکایتیں دم توڑ جاتی ہیں اور ہم سروائیو کر لیتے ہیں..... جینا شروع کر دیتے ہیں۔“ میری زندگی میں آنے والے اس ”کوکی“ کا نام ارسل رحمان تھا..... لوگوں کے لیے وہ ایک شخص تھا مگر میرے لیے پوری حیات ہو گیا تھا، بغیر کسی جھوٹی یا بڑی وجہ کے..... یہاں آنے سے پہلے میری زندگی کئی دوسروں، پریشانیوں کا شکار تھی، مگر اس نے میرے دل سے سارے خوف نکال دیے تھے..... ہر شام گھر کے سامنے والی روش پر ٹپکتے ہوئے وہ دروازہ خود اور نٹ کھٹ سا انسان زندگی جینے کے گریتا کرتا تھا۔

”لوگوں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ آپ کی زندگی میں دخل اندازی کریں۔ آپ کے فیصلوں پر اعتراض اٹھا میں..... آپ کی زندگی ہے، جیسے چاہیں جنیں..... ہم کسی کے لیے بھی اپنی ہنسی کی قربانی کیوں دیں تارا۔“

”مگر رہنا تو ہمیں اسی دنیا میں ہے ناں؟“

یہی کون چمکل رہی ہوئی تھی۔

”دنیا تم سے ہے تم دنیا سے نہیں ہو۔ اپنی انا اور خودداری کی بہت حفاظت کرنا پڑتی ہے۔“ ٹھوکر سے پتھر اڑاتا مجھے وہ دنیا کا بے نیاز ترین انسان لگا کرتا تھا۔

”تمہیں صرف اور صرف نصیحتیں کرنا آتا ہے ارسل رحمان..... ورنہ جتنے مسائل اور پریشانیوں میری زندگی میں ہیں کسی کی زندگی میں بھی نہیں ہوں گی۔“ وہ چلتے چلتے وہیں رک گیا تھا اس نے بل گم کا پٹا خانہ کر پھوڑا تھا۔

”ہاؤ سویت..... اپنے آپ کو اتالیٹ ڈاؤن نہیں کیا کرتے تم سے زیادہ اور لوگوں کی زندگی میں مسائل ہیں..... تم چند چھوٹی پریشانیوں کو رو رہی ہو۔“ ”تم ایسے اندازے کیسے لگا سکتے ہو ارسل؟“ میں نے شک کی کیفیت میں اسے دیکھا تھا۔

”اندازے نہیں ہیں حقائق ہیں۔ تم بتاؤ ذرا..... تمہاری زندگی میں ایسے کون سے مسئلے ہیں؟“ میں لکڑی کے بچ پڑھ رہی تھی۔

”میرا گھر نہیں ہے۔ والدین نہیں ہیں میں یتیم لڑکی ہوں۔“ میرے آنسو میرے ہاتھوں کی پشت پر گرنے لگے تھے۔ وہ میرے ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

”کتنی مادہ پسند ہو رہی ہو تیری..... گھر بن جاتے ہیں رشتے آدمی دنیا کے پاس نہیں ہوتے۔“ وہ غصے میں ہمیشہ مجھے تیری کہتا تھا۔

کوئی آپ کی اتنی پروا کرتا ہو آپ کو ہر شام آٹکیم پارلر لے جاتا ہو، ہر نیا لطیفہ سنانے کو بے تاب ہوتا ہو، آپ کو زندگی جینے کے ایک سو ایک طریقے بتاتا ہو، ہر صبح آپ کے لیے خود کا نیا بناتا ہو، گھنٹوں آپ کی گھسی پٹی باتوں کو برداشت کرتا ہو، آپ کو بوریت سے بچانے کے لیے اپنی ون ڈش بارئیز تک مس کر دیتا ہو..... اس سب کا مطلب

”محبت“ کے سوا کچھ ہو سکتا ہے کیا؟ اگر ہو سکتا ہے تو مجھے بتایا جائے تاکہ ارسل رحمان کو لے کر میری ساری غلط فہمیاں ایک ایک کر کے دور ہو جائیں..... ہر بار پتھر کا پتھر اڑاتا کرتے بھی بکھار کا پتھر بھی پتھر جا

گرتے ہیں۔ تب ایسے ریزے نکھرتے ہیں کہ الامان۔

جینکو فیک کے سب لیتی مانی نے مجھے روکا تھا ہر پادان کی نظریں مجھے اک الجھن میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ ”کو مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”جی پوچھیں۔“ تم ارسل کے ساتھ ہوتی ہو یونیورسٹی میں، کہیں وہ کسی لڑکی میں انوالتو نہیں۔“ میں ٹھٹک کر رہ گئی تھی یوں لگا تھا جیسے سارے جسم میں سونیاں ہی رینگ رہی ہوں۔

”نہیں ماما..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ جانے کیوں میری آواز لڑکھرائی تھی۔

”میں تو ارسل کی شادی کسی ہائی کلاس فیملی کی لڑکی سے کروں گی..... آخر وہ ڈیزر رو کرتا ہے۔ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔“ اس شام چھت کی ریٹنگ پکڑے میں آسمان پر ابھرتے تارے دیکھ رہی تھی اور وہ پاس ہی جھولے پر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔

”تم کسی میں انوالتو ہو.....؟“ آدھے گھنٹے سے ارد گرد کے ماحول سے کٹا، وہ میرے سوال پر چونکا تھا۔

”کیا مطلب؟“ ”سوال مشکل تو نہیں..... تم کسی میں انٹرنسٹ ہو؟“ وہ لیپ ٹاپ بند کرتا مکمل میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ میں نے ہاتھ وجود کے گرد باندھ لیے تھے۔

”نہیں۔“ وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا تارے ڈھونڈتا..... وہ ہنستے ہنستے دل کے تار ہلا دیتا تھا..... اب بھی شور مچاتا تھا۔

”تم ہمیشہ غلط اندازے لگاتی ہو نین تارا!“ ”تو اس کا مطلب تم.....؟“

”ہاں نین تارا!“ اور اس تاروں بھری رات میں، میں نے تاروں کو ٹوٹ ٹوٹ گرتے دیکھا تھا۔ اس شخص کے جواب نے تو جیسے نین تارا سکندر کی سائیکل تک روک لی تھیں۔

☆☆☆

ایڈمن بلاک کی راہداری کے پاس وہ اسے روکے کھڑا تھا..... گلابی رنگ میں لمبوس وہ ارسل رحمان کا ہمیشہ کی طرح دل دھڑکا گئی تھی..... نظریں ایسی لپکتی تھیں کہ اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“ کوکب غصے سے جلی بھنی ہوئی تھی۔

”تم ہومیرا مسئلہ.....“ ”میں نے کیا کیا ہے.....؟“ کوکب نے حیرت سے شہادت والی انگلی سینے پر رکھی تھی..... وہ زبردستی ہاتھ تھامتا اسے اسٹڈی لان میں لے آیا تھا..... گھاس کے سبز قطعے پر وہ دونوں بیٹھ گئے تھے۔

”آئی ایم ان لو.....“ کوکب خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

”سچ ارسل تم نے اسے بتایا؟“ اس کے چہرے پر جیسے خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

”نہیں اب بتانے لگا ہوں۔“ ”ہائے اللہ..... وہ سنے گی تو خوشی سے مر جائے گی۔“

”وہ کون.....؟“ ”نین تارا اور کون..... میں تو کئی دنوں سے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت دیکھ رہی تھی۔“

”میں نین تارا سے محبت نہیں کرتا کوکب۔“ اسٹڈی لان کی طرف ان کے قریب آئی نین تارا وہیں ایڈمن بلاک کے سامنے جیسے دفن ہو گئی تھی.....

اس شام وہ ذکر ادھورا چھوڑ گیا تھا پورا ذکر آج پوری جان لے گیا تھا۔ وہ اگلے پاؤں واپس بھاگی تھی کوکب فیاض کو ساری یونیورسٹی جھان لینے کے بعد وہ

البریری میں نظر آئی تھی، کچھ تھا جو محسوس ہوتا تھا..... وہ کرسی کھینچتی پاس بیٹھ گئی تھی۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو میں ساری یونی میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“ ”بھئی بھئی اچھا لگتا ہے ناں کوکب ہر کسی سے، آس پاس سے کٹ کر اکیلے، بیٹھنا..... بھئی تو اپنی

آواز سنائی دیتی ہے۔“ وہ اس دنیا کی نہیں لگ رہی تھی..... تیز ہوا لائبریری کی کھڑکیوں سے ٹکرائی تھی۔

”تم اتنی زور ورج کیوں ہو رہی ہو نین!“ ”امی بہت یاد آ رہی ہیں کوکب..... بہت۔“

نین تارا نے کس غم کو کس غم سے جوڑا تھا..... کوکب نے اسے خود سے لگا لیا تھا..... عجب بات تھی کوکب فیاض، نین تارا کو آج بھی بری نہ لگی تھی..... ورنہ بات چھوٹی تو ہر گز نہیں تھی۔

☆☆☆ کوکب فیاض میرے معاملے میں کیسے اتنی نا سمجھ اور لا پرواہ ہو سکتی تھی..... کیسے؟ وہ تو میری دنیا کی اچھی رازدار دوست تھی اندر تک سب کچھ پڑھ لینے والی..... اس نے کیسے یقین کر لیا تھا کہ میں ارسل رحمان سے محبت نہیں کرتی تھی..... نہر کے پانی پر پھولوں کی پتیوں تیر رہی تھیں۔

”نہیں کوکب..... ہم اچھے دوست ہیں بس۔“ مجھے ارسل رحمان سے کیسے محبت ہو سکتی ہے مجھے تو وہ پہلی نظر میں ہی برا لگا تھا میرا دل اس کا منہ توڑ دینے کو چاہتا تھا..... نین تارا صرف زبردستی ہنس کر دکھائے اور کوکب فیاض یقین کر لے۔ جو بھی نہیں ہوا تھا آج ہو گیا تھا۔

”تم کیوں پوچھ رہی ہو کوکب.....؟“ ہوتا ہے ناں سچے لوگ..... کبھی بکھار کھرتے ہیں پھر وہ ساری زندگی کے لیے سچے نہیں رہتے۔

”وہی ہی تارا کبھی کبھی تمہاری اور ارسل کی اتنی اچھٹ دیکھ کر لگتا ہے۔“ ہر بار نہر میں درخت پھولوں کی پتیوں نہیں گراتے تھے۔ آج درخت خار گر رہے تھے اگر میں وہ خار دیکھ رہی تھی تو کوکب فیاض کو وہ نظر کیوں نہیں آئے تھے۔ اس کی نظر بدل گئی تھی یا پھر وہ خود ہی ساری کی ساری بدل گئی تھی..... زندگی کے جھٹکشن بدلنے کا رونا رونے میں محبت کے جھٹکشن بدلنے کا دکھ بھی برداشت کرنے والی تھی۔

”نہیں کوکب، تمہیں غلط لگا تم ہی تو کہتی ہو ہر ہنسی کے پیچھے اک راز ہوتا ہے اسی طرح ہر تعلق کے

بروے میں بھی راز ہوتا ہے۔ میرے اور اسل کے
معلق میں دوستی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو
نہیں۔ ایک کھنک دار قبضہ درختوں کے جھوم میں نظر
گیا تھا۔

”تم کیسا فلسفہ بول رہی ہو۔ کتنی بڑی تبدیلی
ہے یہ۔“

”ہاں ہر تبدیلی بڑی ہوتی ہے۔“
”آؤ۔۔۔۔۔ ذرا ٹھہرتے ہیں۔۔۔۔۔ بیٹھے بیٹھے حکمن
سی ہو گئی ہے۔“ چڑیوں کے جھنڈ اس نے تالی مار کر
اڑائے تھے وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ آج پہلی بار
مجھے چڑیوں کا دکھ محسوس ہوا تھا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی ایک دکھ،
اور کتنے ہی سانچے دکھ ساتھ لیے چلا آتا ہے۔
نانا نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔
”تمہارے کتنے سمسٹر باقی ہیں۔“

”دو سمسٹر باقی ہیں نانا۔“
”ٹھیک ہے پھر تمہاری اور اسل کی منگنی کی
تقریب رکھ دیں گے۔“ زلزلے یونہی تو آتے
ہیں۔ بغیر کسی چاب کے عمارتیں شور سے گرتی ہیں
میں نے اپنی آواز کو پچھتا ہوا محسوس کیا تھا۔

”نانا۔۔۔۔۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“
”میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا نین تارا!“
”آپ نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔“
”ارسل اچھا لڑکا ہے مینا وہ تمہیں خوش رکھے
گا۔“

”میں اچھی نہیں ہوں نانا۔۔۔۔۔ میں نہیں ہوں۔“
میں باہر آ گئی تھی۔ ارشدہ رحمان سامنے تھیں۔

”میری ایک بات یاد رکھنا نین تارا۔۔۔۔۔ خواب
قد برابر ہی دیکھنے چاہیے۔۔۔۔۔ چھوٹے خواب اور چھوٹا
کر دیتے ہیں اور بڑے خواب کہیں کا نہیں رہنے
دیتے۔“ میں رکی نہیں تھی۔۔۔۔۔ دل تھا کہ بس رکنا تھا
اور جان تھی کہ بس جانے کو تھی۔۔۔۔۔ میں نے دل کے
آگے سود لیں رکھی تھیں۔۔۔۔۔ ہر دلیل رد ہوئی تھی۔
اگر ارسل رحمان کو کوکب فیاض سے محبت تھی تو کیا
اسے بھی؟ اس نے رات کے آخری پہرے اسے کال کی

تھی۔۔۔۔۔ کوکی کی نیند بھری آواز سنائی دی تھی۔
”تارا۔۔۔۔۔ کیا بات ہے اتنی رات کو کال کی۔۔۔۔۔
خیریت؟“

”تم ارسل سے محبت کرتی ہو۔۔۔۔۔؟“
”میں اسے انکار نہیں کر سکتی نین تارا۔“ کوکب
نے میری سانسیں روک لی تھیں۔ ”مگر تم اتنی رات کو
یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”وہ ارسل تمہارا جواب جانا چاہتا تھا۔“ میرا
جھوٹ بہت چھوٹا تھا۔ کوکب کی کوئی غلطی نہیں تھی
وہ کیوں ارسل رحمان کو انکار کرتی۔۔۔۔۔ دراز قد خور و
اور تعلیم یافتہ۔۔۔۔۔ ساری یونیورسٹی کی لڑکیاں مرنی
تھیں۔ کوکب فیاض کی بس ایک غلطی تھی وہ نین تارا
سے محبت کا سوال پوچھنے سے پہلے ہی ارسل کی محبت کا
جواب دے چکی تھی انصاف پسندی کے اصولوں پر
بات کرتی وہ پہلی بار کسی بھول کا شکار ہوئی
تھی۔۔۔۔۔ بھول پہلی ہو، دوسری، تیسری یا آخری مگر وہ
نقصان ہر بار بہت کرتی ہے۔ کوکب فیاض جو میرا
عشق تھی پہلی بار خود غرض ہوئی تھی۔!!!

☆☆☆
”میں تو ساری زندگی ایک چپ کے بدلے
ملنے والے سو سکھ کی ہی منتظر رہی مگر میں غلط
تھی۔ زندگی چپ کا نام نہیں ہے۔ لفظوں کی
جنگ جیت کر ڈاؤن توڑ کر کبھی سکھ نہیں ملنے یا پھر ہم
عورتیں ہی شاید بد قسمت ہوتی ہیں صوبی آپ۔“
قالین پردوزانو ہو کر بیٹھی وہ اتنی اجڑی بچڑی لگ رہی
تھی کہ صوبی کو اپنا دکھ کم ہوتا محسوس ہوا تھا۔ تانیہ
فیاض کا حال قافلے لٹ جانے والوں سے بھی اتر
تھا۔ وہ تو کہیں سے بھی پندرہ دن کی دہن نہیں لگ
رہی تھی اس کے ہونٹوں پر جمارنگ بڑا عجیب تھا
صوبی کو خفقان ہونے لگا تھا۔

”کہتا ہے کہ اس نے مجھ پر ترس کھایا ہے۔۔۔۔۔
رحم آتا ہے اسے مجھ پر۔ وہ تو مرحوم ماموں کی روح
سے کیے گئے وعدے بھار رہا ہے۔ موت کے بعد
مرحوم کی ہر خواہش پوری کرنا ہوتی ہے۔ ہونہ۔۔۔۔۔ کہتا

ہے ماموں کے گھر کی بیویوں پر پتھر نہیں پڑنے والے
تھے۔ ان پندرہ دنوں میں اس نے کوکب کے علاوہ
کوئی بات ہی نہیں کی، کوکب یہ بھی، کوکب وہ تھی، یہ
کیسے جرم ہوتے ہیں جو ہم سے سرزد بھی نہیں ہوتے
اور ان کی سزا ہمیں مل جاتی ہے۔ کبھی بھی پتا ہے آپا
مجھے کیا لگتا ہے۔۔۔۔۔؟ قالین سے اٹھ کر وہ اب
آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے وہ اب بھی کوکب سے محبت کرتا
ہے۔“ دروازے میں کھڑی کوکب کے ہاتھوں میں
پکڑی ٹرے لرز گئی تھی۔ اس نے زندگی کا اک اتنا بڑا
فیصلہ ضد میں آ کر کر لیا ہے۔۔۔۔۔ اور ضد کی بھینٹ
چڑھے فیصلے کہاں خوشی دیتے ہیں۔ اس گھر میں
آنے والی ہر پریشانی کے لیے دروازہ جیسے کوکب
فیاض کھولتی تھی۔۔۔۔۔ مڈل کلاس کے سارے مسئلے اس
گھر میں جنم لے چکے تھے۔ گھر کے سارے افراد
کسی گھر سے سمندر کے سمندر میں پھنس چکے تھے اور کسی
میں سوراخ ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ ہر کسی کو سینکڑوں میں چپ
کرانے والی کوایسی چپ لگی تھی کہ صدیوں نہ ٹوٹنے
والی تھی۔

صغیہ بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ”ہائے میرے
اللہ۔۔۔۔۔ اس گھر میں مجھے کبھی بھی سکھ کا سانس لینا
نصیب نہیں ہوا۔“

موسیٰ نے ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا
شروع کر دیا تھا اسکول کی کاپیاں چیک کرتی جانے وہ
کس موڈ میں تھی بال بین تیزی سے چل رہا تھا صفے
پھٹتے جا رہے تھے مگر اسے ذرا بھر بھی پروا نہیں تھی۔

”سارے مسئلے آپ کے پیدا کردہ ہیں۔“
صغیہ بیگم کو اس سے اس جواب کی ہر گز بھی توقع نہیں
تھی۔

”میرا قصور ہے؟“ وہ رونے کو تھیں۔

”جب سے آنکھ کھولی ہے اس گھر میں صرف
اور صرف پریشانیاں دیکھی ہیں۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی
تو بہار آتی ہی ہے مگر اس گھر نے تو بس خزاؤں کے
مڑے پچھنے ہیں اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ زندگی برباد ہو کر رہ گئی

ہے۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے بندہ ٹرین کے آگے
کوڑ کر جان دے دے۔“ دوپٹے سے ہاتھ پونچھ کر
کوکی اندر آئی تھی۔

”کیا ہوا ہے موسیٰ۔۔۔۔۔ کیوں چلا رہی ہو؟“
”زندگی عذاب ہو گئی ہے ایک بل بھی سکون کا
نہیں میسر۔۔۔۔۔ تم نے، تانیہ اور صوبی آپا نے سکون
برباد کر کے رکھ دیا ہے خدا کے لیے جان چھوڑ دو۔“
ہاتھ جوڑتی وہ کاپیاں اٹھاتی باہر کو نکل گئی تھی۔ کچھ صفے
ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ صغیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو
دی تھیں۔ کوکب فیاض جہاں کی تھاں رہ گئی تھی، اس
نے صوبی آپا کو بچوں کی انگلیاں پکڑتے ہوئے بیرونی
دروازہ بار کرتے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ پرسوں ہی تو وحید بھائی
سے مارٹھا کے نیل و نیل وجود کے ساتھ آئی
تھیں۔ تانیہ ان کی نگہ کر رہی تھی۔

”آبا، خدا کا واسطہ ہے رک جائیں۔“ وہ ننگے
پاؤں ان کے پیچھے بھاگی تھی ”موسیٰ کے منہ میں جو آتا
ہے بول دیتی ہے۔“ وہ ان کا بازو پکڑے روکے
ہوئے تھی۔ وہ نرمی سے ہاتھ چھڑاتی ہوئی مسکراتی
تھیں۔

”وہ سچ کہتی ہے کوکو۔۔۔۔۔ ہمارے گھروں کے
مسکوں کو ہمارے گھروں میں ہی رہنا چاہیے،
ہمارے مسئلے ہیں، برنیاں ہیں، ہم شادہ شدہ بیٹیاں
غلط کرتی ہیں جو پائیل کے گھر کو پہلے جیسا سمجھ کے
دھڑلے سے چھوٹی موٹی تکلف پر روتی جیتی آ جاتی
ہیں۔۔۔۔۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا کوکو۔ یہ ہمارا گھر نہیں
ہے اب اگلا گھر ہی صرف ہمارا گھر ہے۔“ وہ بچوں کو
سنجائی سڑک پار کر رہی تھیں۔ آگ اگلے تاریخی
سورج کی روشنی میں وہ اپنے بچوں کو سنجائی اپنی انا،
خودداری، عزت نفس کی ایک بار پھر قربانی دینے جا
رہی تھیں۔ آہ۔۔۔۔۔ یہ زندگی۔

بالس کے قد دیواروں سے اونچے ہو گئے
آنخوروں کا پانی سوکھ چکا تھا۔ چڑیاں پیاسی واپس
لوٹ رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور اسی رات کی سب کوارسل رحمان
نے اسے کہا تھا ”کوکب۔۔۔۔۔ آئی ریلی لو پو“ کوکب

فیاض کی زندگی کے سارے مسئلے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان سب سے فرار چاہتی تھی۔ صبحی آپا، تانیہ، موسیٰ سب کے چروں کے جوم میں پہلی بار وہ ”نین تارا سکندر حیات“ کو دکھنا بھول گئی تھی۔ ورنہ نین تارا تو اس کے لیے کھلی کتاب تھی۔ زندگی نے ایسا جال بنا تھا کہ وہ پھر پھر اکر رہ گئی تھی۔ وہ ارسل رحمان کو دیکھ کر زبردستی مسکرائی تھی۔

”اپنی فیملی کو ہمارے گھر بھیج دو۔“ وہ فرار چاہتی تھی سکون سے جینا چاہتی تھی ورنہ ارسل رحمان سے اسے ”محبت“ نہیں تھی۔

☆☆☆

زندگی نے ہم دونوں کو جانے کس مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ہم دونوں مسکرانے کی کوششوں میں تھیں۔ میں نے غور سے بار بار کوکب فیاض کا چہرہ دیکھا تھا۔

”تم خوش تو ہونا کوکب؟“ وہ گہری سانس لیتی مسکرائی تھی۔

”میں خوش ہوں نین تارا۔۔۔۔۔ بھلا ارسل رحمان جیسے شخص کی زندگی میں شامل ہو کر میں ناخوش کسے ہو سکتی ہوں۔“ جانے کیوں مجھے اس کا جواب مطمئن نہیں کر سکا تھا۔

”مائی کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔؟“

ناریل کے تپے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

”کبھی کبھی تو لگتا ہے وہ کبھی نہیں بدلیں گی۔۔۔۔۔“

ہوتے ہیں ناں کچھ لوگ جو ایک جگہ جتے رہتے ہیں۔ ان کا رویہ بہت دکھ دیتا ہے تارہ۔ مگر پھر ارسل کا سوچ کر دل کوڈھار مل جاتی ہے۔

”وہ دل کی بری نہیں ہیں کوکی۔“ وہ پھول توڑ رہی تھی۔

”جو دل کے برے نہیں ہوتے ناں انہیں ویسے بھی برا نہیں ہونا چاہیے۔ رویے بڑا دل دکھاتے ہیں۔“ وہ زندگی میں پہلی بار آج مجھے بھری ہوئی لگی تھی۔ سارا گھر گھومتے ہوئے ہم ساتھ

ساتھ رہی تھیں۔ لاہری، لاؤنج، چھت، گارڈن ہر جگہ کچھ دیر رکتی ہوئی، باتیں کرتی ہوئی زندگی ہمیں پیچھے چھوڑ کر خود بہت آگے بڑھ گئی تھی۔

نانا چلے گئے تھے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی تھی عمر جاٹے جاتے وہ مجھے حماد درانی کا ساتھ دے گئے تھے۔ وہ جدید زمانے کا شخص تھا، وقت کو انگلیوں پر گنتا ہوا، اپنی من مانی کرنے والا۔۔۔۔۔ ہر انسان پہلے پہل ملتا ہے تو ادا کار لگتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ اصل نظر آتا شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں ”میں“ بہت زیادہ تھی۔

”تم یقین نہیں کرو گی وہاں لڑکیاں ایک نظر مجھے دیکھنے کے لیے ریپشن پر کھڑی رہتی تھیں۔“

”میں لڑکیوں کے لیے ہمیشہ ہاٹ ٹاپک رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ تم کیسی ڈریٹنگ کرتی رہتی ہو، خود کو بدلو، تبدیلی لاؤ، اب تم حماد درانی کی بیوی ہو۔“

”ارے ابھی بلاؤ ز زیادہ کھلا ہے تو کیا ہے آج کل فیشن میں ان ہے۔ اب تمہاری زندگی بدل چکی ہے اپنی سوچ بدلو۔۔۔۔۔ تم اب مڈل کلاس میں نہیں رہ رہی ہو۔“

”میں یہاں کے ماحول سے اکتا چکا ہوں۔۔۔۔۔ اس ملک میں رکھا کیا ہے۔“ میں نے ملاد کا پتا اٹھاتے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ رسٹ وائج دیکھتا ہوا بولا تھا ”ہم اگلے ہفتے لندن شفٹ ہو رہے ہیں۔“

اس نے میرے قدموں تلے سے زمین نکال لی تھی۔ ”مگر کیوں۔۔۔۔۔؟“

”کیوں کا کیا سوال۔۔۔۔۔ بھائی بھی تو وہیں ہیں۔۔۔۔۔ بزنس بھی وہیں ہے تو وہیں سیٹل ہو جائیں گے۔“

”مگر یہاں گھر ہے ہمارا اور ہماری یادیں ہیں۔“

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔ یادیں، یادیں مائی فٹ۔۔۔۔۔ تم کب پریکٹیکل بنو گی نین تارا!“ ہاں میں کیسے پریکٹیکل ہو سکتی تھی۔ میں تو خوابوں، خیالوں میں رہنے

والی اک مڈل کلاس لڑکی تھی ناں۔

”تم لوگ لندن کیوں شفٹ کر رہے ہو تارا؟“

”پتا نہیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”حماد کا فیصلہ ہے۔“ میں نے اسٹرا سے جوس کا

پل لیا تھا۔ ”مجھے وہ شور مچانا اندر آیا تھا۔ اور میرے دل میں سناٹے چھا گئے تھے۔۔۔۔۔ دور دور تک۔“

”ارے بھئی بڑے لوگ ہیں یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ فریج سے سیب نکال کر وہ بالکل میرے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”میں نے ہولے سے نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ فریش چہرہ، چمکتی آنکھیں اور پیشانی پر بکھرے بال، یکبارگی میرا دل چاہا تھا اس کی پیشانی سے وہ سارے بال ہٹا دوں

محبت کے ساتھ نے اسے کتنا خوب صورت کر دیا تھا۔ کوکب فیاض اب رخ موڑے سیٹی بجاتے ریٹرنگر کی طرف متوجہ تھی۔ آج بھی میرے لیے ان دونوں کی محبت

دل میں تھی۔ آنکھوں میں دھند آئی تھی۔

”تم خوش ہو ناں تارا۔۔۔۔۔ اب تو زندگی سے سارے گلے شکوے دور ہو گئے ہوں گے۔“ وہ مسکرا کر

پوچھ رہا تھا۔

”بہت خوش ہوں ارسل۔۔۔۔۔ بہت۔“ میرے مضبوط لہجے نے کوکب کا ہاتھ کیوں لرزادیا تھا۔ آخر

کیوں۔۔۔۔۔؟ میں آج آخری بار اس گھر میں آئی تھی ان سب سے ملنے۔ پھر میری زندگی اک اور جھٹکشن بدلنے والی تھی۔

مائی نے مجھے کھلے دل سے گلے لگایا تھا اور رودی تھیں۔ ”تارا، تم بہت اچھی شخص مجھے بہت دیر ہو گئی مجھے معاف کر دینا۔“ کیسی معافی اور کیسی دیر۔۔۔۔۔ وہ دونوں

ارائیوے میں کھڑے تھے حماد اور میں ان سے رخصت لے رہے تھے۔

کوکب فیاض نے مجھے گلے لگایا تھا اور پھوٹ

کی جنگ ہار گئی۔ ”وہ سرگوشیاں سارے رستے میرا پیچھا کرتی رہیں۔ میں نے پلٹ کر پیچھے پھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری کوکب فیاض اور ارسل رحمان سے آخری ملاقات تھی۔ میری زندگی میں آنے والے دو اہم لوگ۔۔۔۔۔“

جن سے میں نے بے تحاشا محبت کی۔۔۔۔۔ بس مجھے محبتوں کا اظہار کرنا بھی نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ آج بھی کوکب

فیاض سے تعلق میں اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھی۔

☆☆☆

مشکل رات۔۔۔۔۔ دس بجے

”زندگی نے ہم دونوں کے لیے کچھ اچھا نہیں سوچ رکھا تھا ہم دونوں اپنے اپنے حالات سے لڑ رہی

تھیں اگر دیکھا جاتا تو اسے مجھ سے زیادہ مشکل حالات کا سامنا تھا۔ مگر وہ بہت بہادر تھی میرا آئیڈیل بھی کوکب

فیاض۔ اچھا بولتی تھی اسی بات پر وہ بہت خوش محسوس کرتی تھی ہر مقابلے کی جیت کے بعد ہم دونوں یونیورسٹی کی

چاٹ ٹریٹ کے طور پر ضرور کھاتی تھیں۔ کوکب فیاض اور ارسل رحمان میری زندگی میں آنے والے دو دو لوگ

تھے جن کی میں دل سے مداح تھی۔ جن کے لیے میں واقعی جان دے سکتی تھی۔

گزرتے دنوں میں مجھے ذرا بھی خبر نہ ہوئی کہ میرا دل چال بدل چکا ہے۔ وہ ارسل کے لیے دھڑکتا تھا اور

ارسل کا دل کب مجھ سے کوکی کا ذکر سن کر دھڑکنے لگا۔

مجھے ان دونوں باتوں کا پتا بہت بعد میں چلا۔ کوکب

کبھی بھی وہ میری اک اک رمز سے واقف ہے اور یہی بات واقعی سچ ہے اس میں دورانے نہیں۔ زندگی جب

کتنا بڑا بوجھ لگنے لگتی ہے جب پتا ہو جس سے آپ محبت کرتے ہیں اس کے دل میں تو کوئی اور بسا ہوا ہے۔

ارسل رحمان اور کوکب سے محبت؟ میری آنکھیں سمندر ہو گئی تھیں اور کوکب فیاض کتنی معصوم

تھی۔۔۔۔۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ مجھ سے پوچھتی۔

”تاری تمہیں ارسل سے محبت تو نہیں؟“ اسے تو سب

پتا تھا۔۔۔۔۔ جہاں جواب کا پہلے سے پتا ہو ہاں سوال تو

نہیں کیا کرتے۔ وہ چہرہ نہر کے پانیوں میں کانٹے گرا

رہا تھا۔۔۔۔۔ اس بار اس نے خاموش رہ کر بازی جیت لی

تھی..... اور میرا دل اس سب کے باوجود بھی اسے رقیب ماننے کو تیار نہیں۔

کچھ لوگ چاہے کتنے بھی برے بن جائیں مگر وہ برے نہیں نکلتے..... مجھے ہمیشہ اس سوال نے پریشان رکھا ہے اگر کوکب کو ارسل سے محبت نہیں تھی تو اس نے ارسل کی زندگی میں شامل ہونا کیوں منظور کر لیا تھا؟ یہ سوال ہر بار مجھے تھکا دیتا ہے..... زندگی نے ہم دونوں کے لیے اتنے رنگ بدلے ہیں کہ کوئی جو کر بھی نہیں بدلتا ہوگا..... مجھے کوکب سے کوئی شکایت نہیں۔ ناراضی بھی نہیں مگر دل کے چار خانوں میں سے کسی خانے میں یہ ضرور ہے کہ کاش کبھی اسے احساس ہو جیتوں میں تکنیک کام نہیں آتی۔ فارمولے نہیں ہوتے، سادگی ہوتی ہے، جانے وہ ساری زندگی ارسل کے ساتھ اس گھٹ کے ساتھ کیسے گزارے گی؟ اور جس دن ارسل کو خبر ہوئی کہ کوکب تو اس سے محبت ہی نہیں کرتی؟ وہ تو محبت کو زندگی کے لیے آسجین جتنی اہمیت دیا کرتا تھا..... کاش زندگی ایک اچھی راز دار ثابت ہو، ہم جیتوں کے لیے.....

لابریری کی دراز میں رکھی وہ ڈائری کوکب فیاض کے جسم سے جان نکال کر لے گئی تھی..... ڈائری کے ورق بکھر گئے وہ مڑی پر ڈھے گئی تھی آج خبر ہوئی تھی کہ نین تارا اسکندر نے پلٹ کر پھر خبر کیوں نہ لی تھی..... ثلث کے تینوں کٹوے کہاں آ کر جڑے تھے۔ وہ پہلی بار تھا جب کوکب فیاض دل کے درد کے ہاتھوں بے حال ہوئی تھی..... ہاں اسے سب خبر تھی کوکب فیاض واقف تھی نین تارا اسکندر کے ہر جذبے سے مگر زندگی نے سر سے آسمان سمجھ لیا تھا۔

☆☆☆

وہ پہلا تھپڑ میں بھی نہیں بھول سکتی جو حماد درانی نے میرے منہ پر مارا تھا..... ”وہ دوست تھا میرا اس نے تمہیں ذرا سا سچ کر لیا تو کون سی قیامت آ گئی۔“ وہ مجھ پر چیخ چلا رہا تھا۔

”اس نے صرف سچ نہیں کیا تھا حماد۔“ ”تو کون سی قیامت آ گئی وہ میرا بزنس پارٹنر

ہے۔“ میں تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”مگر میں تمہارا بزنس نہیں ہوں۔“ وہ رات میں نے سلور مین کی سڑکیوں پر گزاری تھی اس وقت میں نہیں جانتی تھی ایسی کئی باتیں میں اور بھی وہاں گزارنے والی تھی..... نیسی سے میری دوستی وہیں ہوئی تھی..... شاید ہم عورتوں کے دکھ کھ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نیسی نے مجھے بہت حوصلہ دیا تھا۔

”دوست یہ سارا مرد ایک جیسا ہے عورت کو ایک کی طرح اپنے کسی بھی دوست کے سامنے پیش کرنے والا۔“ میں اپنے آنسو پونچھ رہی ہوئی تھی۔ ”تم پولیس کو انعام کیوں نہیں کرتا۔“

”تم پاکستان اپنے گھر میں کسی کو انعام کیوں نہیں کرتا۔“ ”میرا کوئی گھر نہیں ہے..... کوئی رشتہ باقی نہیں..... میں لاوارث ہوں۔“

حماد ڈرنک کرتا تھا..... پارٹیز اٹینڈ کرتا تھا اور وہ پارٹیز ہر گز بھی ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ میں وہاں جا سکتی..... ایک بار اسی ایک وجہ سے میں نے انکار کیا تھا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔“ ”کیوں نہیں جاؤ گی؟“ وہ ڈرینک مرر کے سامنے کھڑا پر فحوم اسپرے کر رہا تھا۔

”وہاں سب مرد ہوتے ہیں۔“ ”ایک تو میں تمہاری اس مڈل کلاس ذہنیات سے بہت تنگ ہوں۔“ اس نے پیار سے میرے ہاتھ پکڑے تھے۔ ”کم آن بے بی۔“ میں نے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔

”میں کسی قیمت پر بھی نہیں جاؤں گی۔“ حماد درانی نے ڈرینک ٹیبل کی ہر شے میری طرف اچھالی تھی..... میرے ماتھے سے خون ابل پڑا تھا..... اس کے بعد اس نے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی تھی۔

”میں سب جانتا ہوں، بچہ نہیں ہوں۔ وہ حرازہ ابھی تک تمہارے دل سے نہیں نکلا.....

بہ کردار عورت ایک بار ارسل رحمان میرے سامنے آجائے میں اسے شوٹ کر دوں گا۔“ میرے منہ نے ٹون اٹھنے لگا تھا..... یہ وہ حماد درانی نہیں تھا جو ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ ہمارا دوست تھا وہ تو اتنا دھیمہ بولتا تھا کہ توجہ سے اس کی بات سننا پڑتی تھی..... اور آج جاہلوں کی طرح وہ چیخا چلاتا ہوا مجھے زد و کوب کر رہا تھا..... اس دن مجھے سمجھ آیا تھا کہ زندگی نے ہمارے راز نہیں رکھے تھے۔

☆☆☆

کوکب فیاض کو دل کا دوسرا دورہ تب پڑا تھا جب اسے نین تارا کی ڈائریس کی خبر ملی تھی۔ وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ ارسل کا حال پاگلوں کی طرح ہو چکا تھا وہ اس کی صحت بارے بہت پریشان تھا۔

”مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہیں جو دن بدن تمہیں ختم کر رہی ہے۔“ وہ اسے کیا بتائی؟ اب اور وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ نیلے کور والی ڈائری ارسل کو تھا (روہ چلی گئی تھی)۔

”مجھے بہت ہنسی آ رہی ہے اس بات پر کہ وہ شخص جس سے پہلی ملاقات میں، میں اس کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی پھر بعد میں اسی سے محبت کر بیٹھی تھی..... کتنی حیرانی کی بات تھی ناں۔“ مجھے پہلی بار وہ کب اچھا لگا تھا شاید تب جب وہ میرے پیچھے انٹیشن آیا تھا تب میں نے اس کے پیچھے اس کے پیروں پر پیڑ رکھتے ہوئے کتنا تحفظ محسوس کیا تھا عورت اسی شخص سے محبت کرتی ہے جس سے وہ تحفظ محسوس کرتی ہے جو اسے لگتا ہے دنیا کے سارے غموں کو، بلاؤں سے بچالے گا۔ وہ میرے لیے ایک ایسا ہی شخص ثابت ہوا تھا میرے دل سے سارے ڈر، دوسرے اس نے ختم کر دیئے تھے

ارسل رحمان سے محبت کرنے کے لیے میرے پاس صرف ”ایک“ وجہ نہیں تھی بلکہ بہت سی ان گنت وجوہات تھیں..... میرا دل اس کے لیے دھڑکتا تھا اور اس کا دل؟ کوکب فیاض کے لیے وہ لڑکی جو مجھے ارسل جتنی ہی عزیز ہے شاید اس سے کہیں تھوڑی سی زیادہ زندگی پہلے بہت بری تھی مگر ان دونوں کے میری

زندگی میں آنے کے بعد زندگی پہلے جیسی نہیں رہی بہت بدل گئی، مجھے ہنسا آ گیا۔ زندگی ایسے بھی گزر سکتی ہے۔ مجھے واقعی دنیا کا کچھ اتنا پتا نہیں تھا اسے نین تارا اسکندر یاد آئی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں..... جب وہ کرتی تھی۔

”ارسل اگر تم نہ ہوتے تو جانے میری زندگی کیسی ہوتی؟“ ”کیسی ہوتی بھلا؟“

”بہت عجیب..... بورنگ۔“ ”تم ہر لطف سب سے پہلے مجھے کیوں سناتے چلے آتے ہو؟“ وہ پوچھتی تھی۔ ”کیونکہ مجھے پتا ہوتا ہے تم اس پر ضرور ہنسو گی۔“

”تم اتنا کیسے جانتے ہو مجھے؟“ ”جی ہاں اپنے علاوہ دنیا کے کسی دوسرے شخص کے سوا۔“

”تم فان کلاور بلیک ٹائی زیادہ پہنا کر دو۔“ ”کیوں؟“

”تم پر بہت سوٹ کرتا ہے۔“ ”اوہ رینلی..... کہیں تمہیں مجھ پر کرش تو نہیں؟“

”جی نہیں منہ دھور کھو شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں۔“

”بتانے کی ضرورت نہیں روز دیکھتا ہوں۔“ وہ دونوں لڑتے جھگڑتے اکثر لان میں بھاگ رہے ہوتے تھے بارش میں آکس کریم کون کھانا تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ماموں رحمان چیخنے چلاتے رہ جاتے۔

”اندراؤ تم دونوں..... پیار پڑ جاؤ گے۔“ اور اگلے دن ناشتے کی میز پر وہ چھینک رہے ہوتے تھے..... نشو و نما کا ڈبا آدھا آدھا کر کے یونیورسٹی لے جایا جاتا تھا..... وہ آج اتنے سالوں بعد ارسل رحمان کو شدت سے یاد آئی تھی..... وہ کس نین تارا اسکندر حیات کو جانتا تھا؟ کوکب فیاض نے ارسل رحمان کے

سوال پر اپنا دم گھٹا محسوس کیا تھا۔
”تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی ناں کوکب؟“
ترتر برستی بارش میں شامل اولوں نے کھڑکی کا شیشہ
توڑ دیا تھا۔ شیشے ٹوٹنے کا شور اٹھا تھا مگر ارسل
رحمان کے دل ٹوٹنے کا شور وہیں دفن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کوکب فیاض کو ہونے والے تیسرے اور
آخری دل کے دورہ والے دن اپنے گھر آنا بڑا
تھا۔ وہ ننگے پاؤں ہر کمرے میں گھومتی ہر شے کو ٹکڑے
کر دیکھتی ہوئی آخر برآمدے میں آن کھڑی ہوئی
تھی۔ جانے کیسی تیز ہوا تھی جو بارش ساتھ لائی
تھی۔ غنہ اور بانس کے پودے اسے انجانے خوف
میں مبتلا کر گئے تھے۔ ”ہائے نین تارا“ دل سے اک
کوک برآمد ہوئی تھی گرم آنسو آنکھوں سے پھسلنے
ہوئے پیروں پر گرنے لگے۔

سب کے مسائل ختم ہو گئے۔ شاید سارے
مسئلے اپنے مقرر وقت پر ختم ہو ہی جاتے ہیں۔ تانیہ
نے ظفر کو اولاد کی خوشی دی تھی وہ اب سکون میں تھا
صبوحی آپا کے بچے بڑے ہو گئے تھے اب ان کے بچے
ان کے لیے ڈھال بن گئے تھے موی کا آفس کو لیگ
بے نکاح ہو گیا تھا وہ اب سارا دن بات بے بات
ہنستی تھی تو جن مسئلوں سے میں گھبرائی تھی فرار چاہتی
تھی وہ تو خود بخود حل ہو گئے تھے۔

آہ، میں نے اس ماحول سے فرار کے لیے ہم
تینوں کی زندگیاں عذاب میں ڈالیں اپنی ارسل
رحمان کی اور نین تارا کی مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کسی
کی بھی زندگی برباد کرنے کا مگر میں نے کیا کیا؟
”ٹوٹی چڑیاں بارش کے پانی میں ڈوبنے لگی تھیں
جنہیں وہ ایک ایک کر کے توڑ رہی تھی موی چائے کی
ٹرے لے کر کھڑی تھی۔“

”ارسل بھائی کا فون آیا تھا کہ آپ کو وقت پر
دوائی دے دوں۔“ وہ چائے میز پر رکھی اس کے
باس آگئی تھی جو برآمدے کے پلر سے ٹپک لگائے
کھڑکی تھی۔ وہ کوکب فیاض تو نہیں تھی کوئی اور تھی

..... ملگجے کپڑے، بکھرے بال اور آنکھوں کے گرد
حلقے موی کا دل بھرا آیا تھا۔
”پتا ہے موی میں اس کی آئیڈیل تھی وہ ہر چیز
میں مجھے فالو کرتی تھی۔ میرے پسندیدہ کمراس کے
بھی فیورٹ ہو گئے۔ گاجر کا حلوہ کھانے والی کسٹرو
زیادہ پسند کرنے لگی تھی، کوک چھوڑ کر سیرائٹ بننے لگی
تھی، اکثر تو میری طرح بولنے کی کوششیں بھی کرتی
تھی۔ پیروں میں میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے سختی بھی وہ ایک
اچھی سامع تھی۔ بارشوں میں چھتری لے کر مجھے
اسٹاپ تک چھوڑنے آتی تھی واپسی پر چھتری مجھے
تھماتی وہ بھٹکتی ہوئی جاتی تھی۔ اس کی زندگی میں
چھوٹے چھوٹے مسئلے تھے جو اس کو پہاڑ لگتے تھے،
میرے سمجھانے پر اس کی مسکراہٹ لوٹ آتی تھی۔ ہر
مقابلے میں پہلی تالی وہ بجاتی تھی اور ٹرائی کی حفاظت
اس کا فرض تھا اور فرض میں کہاں کوتاہی کی جاتی ہے
اس کی کبھی ڈائری اگر تمہاری نظر سے گزرے تو تم
دیکھو گی پہلے صفحے پر ہی میرا اور ارسل کا نام لکھا ہوگا۔
اس نے بھی کبھی ڈرامی بات بھی مجھ سے نہیں چھپائی
..... میں راز دار تھی اس کی مگر میں غلط تھی مومت، میں
نے وہ ڈرائی ایگل بڑی ترتیب سی توڑی ہے۔ ہر حصہ
مثالث کا بکھر گیا۔ جو کبھی نہیں جڑے گا کبھی بھی نہیں۔“
مومت فیاض نے اس سے تماشاً بولنے والی،
گفتگو جیت لینے والی، ڈاؤس توڑ کر مقابلے تک اپنی
ذات کے لیے وقف کرنے والی کوکب فیاض کو پھوٹ
پھوٹ روتے دیکھا تھا۔ ارسل سے مجھے محبت نہیں
موی..... میرا دل اس کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکا
..... میں کیا کروں موی؟“ موی نے اسے خود سے
پننا لیا تھا۔

”نین تارا سے معافی مانگ لیں۔“ وہ روتی
ہوئی نفی میں سر ہلار رہی تھی۔
”وہ اپنے آپ کو ہم سب کی زندگیوں سے دور
، بہت دور لے گئی ہے..... وہ اپنی پیٹھ سے ہمارے
لیے مسائل نہیں کھڑے کرنا چاہتی تھی..... رقیبوں
سے نفرت کی جاتی ہے۔ بار بار کوسا جاتا ہے مگر اس

ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ کچھ سال پہلے آخری بار
ہاتھ ہوئے بھی وہ بار بار مجھے اور ارسل کو دیکھتی مسکرا
ہوتی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو جمع کر رہ گئے تھے
..... آنسو اور آخری نظر مجھے آج بھی نہیں بھوٹ۔“
صفیدہ بیگم کے بلانے پر موی اندر چلی گئی تھی۔
ان میں بارش جمع ہوتی جا رہی تھی۔ آندھیوں نے
پہلے بنے چڑیوں کے گھونسلے گرا دیے تھے..... جھکے
ارسل کے پانی میں تیرنے لگے تھے دل میں لپکا لپکا
اور اندھ رہا تھا..... چائے کپ سے اٹھتی بھاپ ختم ہو
گئی تھی ٹیبلٹ اس نے مٹھی میں دبائی ہوئی تھی اسے
ارسل یاد آیا تھا۔

”تمہیں کیا ہو گیا ہے کوکب بیٹھے بیٹھے کہیں کی
لپس پہنچ جاتی ہو کوئی مسئلہ، پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔
میں ہوں ناں۔“
”اپنا خیال رکھا کرو دن بدن کمزور ہوتی جا رہی
ہوں۔“ اور پھر ڈاکٹر صادم نے ارسل کے پیروں تلے
سے زمین چھینی تھی۔
”انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے۔ انہیں کوئی
پریشانی ہے جو مسلسل ان کی ہارٹ بیٹ کو ڈسٹرب کر
رہی ہے آئی وارن یو ہو سکتا خدا نا خواستہ ان کا دل کام
کرنا چھوڑ دے۔“

ارسل رحمان کا دل بند ہونے کو تھا۔ وہ اضطرابی
حالت میں ہاسپٹل میں بھاگ رہا تھا اس نے پہلے
سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا اس
کے کھانے پینے، سونے اور واک تک کا اس نے ٹائم
تاکل خود ترتیب دیا تھا کوکب فیاض کو انہیں موقعوں پر
اپنا تارا یاد آتی تھی۔

”کوکب تم ہی بس اس سے ہر وقت لڑنے
نے پر تیار رہتی ہو، ورنہ وہ ایسا شخص ہے کہ اس سے
بات کی جائے۔“
”تو تم کر لو ناں اس سے محبت آخر آل کزن
کے تہا ہا.....“
اس کے چہرے پر رنگوں کی شفق بکھر جاتی تھی۔
اشارے کو کی کو خوب سمجھ میں آتے تھے۔ یہ ایک ایسا

راز تھا جس سے واقف تو وہ دونوں تھیں مگر انہوں نے
پردہ ڈال رکھا تھا۔ ہوتا ہے ناں کبھی کبھی کچھ چیزیں،
کچھ باتیں پردے میں پڑی رہیں تو زیادہ خوب
صورت لگتی ہیں۔ نہر کے پھولوں نے کوکب کا سوال
سنا تھا۔ ”تمہیں ارسل سے محبت ہے تارہ؟“
بلبلوں کے جھنڈ اس بات پر حیران تھے کہ وہ راز سے
پردہ کیوں اٹھانا چاہتی تھی۔ اس راز کو خوب صورتی کو
کیوں ختم کرنا چاہتی تھی آخر کیوں؟
ہر دلیل، ہر منطق کو اس نے اپنی خود غرضی کی نظر
کر دیا تھا۔ کہا تھا ناں کہ اگر ساری زندگی بھی آپ
کچ بولتے رہیں اور پھر ایک جھوٹ بولیں۔ وہ راتلی
براہر جھوٹ بھی پھر آپ کو سچا نہیں رہنے دیتا..... وہی
جھوٹ کوکب فیاض کے سامنے آ گیا تھا سوال نامہ
ارسل رحمان کے پاس تھا۔

”تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے ناں کوکب؟“
دراز قد خور دھن کی آنکھوں میں نمی تھی..... وہ رو رہا
تھا..... کیا مرنے نہیں روتے؟ کون کہتا ہے؟ محبت کے
لیے ہر کوئی روتا ہے..... وہ بت بن چکی تھی سوال کی
ضرب سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔
”نین تارا تو تم سے محبت ہے۔“
”میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔“

”میں تو خود غرض ہوں اپنا سوچتی ہوں ہمیشہ،
میں کیسے کسی سے محبت کر سکتی ہوں۔ نین تارا کی بات
کر دو محبت تو اس نے کی ہے ناں۔“ پھر وہ نفی میں سر
ہلانے لگی تھی۔
”نہیں..... شاید میں غلط بول گئی۔ اس نے تو
عشق کیا ہے صرف ارسل رحمان سے نہیں۔ کوکب
فیاض سے بھی ہم دونوں سے۔“ بارش کی بو چھانٹنے
اس کے چہرے کو کچھوٹا تھا..... وہ پلر سے لگی بیٹھی تھی
سارے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔ منہ پر بار بار وہ ہاتھ
پھیر رہی تھی..... اندر کہیں..... بہت اندر..... درد
بڑھنے لگا تھا۔
ایک آواز تھی جو بادلوں کی گرج میں پھٹ کر رہ
گئی تھی۔

”دل کے مرض سے نجات مل جاتی ہے کوئی
..... دل کام کرنا چھوڑ جاتا ہے اور پھر سارے درد ختم
ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت کے مرض سے نجات نہیں ملتی
ساری زندگی زخموں سے خون رستا ہے۔“ موی دوڑ کر
باہر آئی تھی..... وہ اب بھی ہلرے ٹیک لگائے بیٹھی
تھی..... دردی گولی مٹی میں بندھی اور گالوں پر آنسو
جم کر رہ گئے تھے اس کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا
ہاں ایک تھی کوکب فیاض.....

☆☆☆

وہ پچھلے تیرہ روز سے میرے پاس آ رہا تھا اور
میں تیرہ روز سے ہی اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ میں
ایک طلاق یافتہ لڑکی تھی اور ان دونوں کی زندگی کے
لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتی تھی..... لندن
کی سڑکیں بارش سے بھیگی ہوئی تھیں..... کرسس کی
وجہ سے دس بڑھ گیا تھا۔ کرسس ٹری کی روشنیاں
آنکھیں چندھیا کر رکھ دینے والی تھیں..... سانٹا کلاز
تحائف بانٹ رہے تھے۔

”کاش کوئی سانٹا کلاز محبت کا ہوتا..... جو صرف
اور صرف محبت کا تحفہ دیتا۔“ کتنی ہنسی کی بات ہے ناں
ویسے؟ نینسی بچن میں ہنسی آدھے گھنٹے سے آلیٹ
اور رشین سلاڈ بنا رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اگلا کرسس سر پہ آ جائے گا تب یہ
تمہارا آلیٹ بنے گا۔“ ایپرن کی ڈوریاں کھنٹی وہ
ہنسی تھی۔

”تارا تم جانتا ہے ناں کہ کوکب کرنا ہم کو
عذاب لگتا ہے۔“

”بہت کلمی ہو تم۔“

”تم نکلا اور پتھر دل ہو۔“

میں رشین سلاڈ ٹنگ رہی تھی۔ ”پتھر دل؟“
”ہاں..... تم اس ایٹائی لڑکا کو اتنے دنوں سے
دروازے سے ٹال دیتا ہے..... یہ اچھا سمجھ نہیں ہیں
تارا۔“

”تم نہیں سمجھو گی نینسی.....“ میں اٹھ کھڑی
ہوئی تھی..... آلیٹ کی پلیٹ میرے ہاتھوں میں

تھی..... تھپی ڈور بیل بجی تھی۔ پلیٹ ٹیبل پر رکھی
دروازے کی طرف آئی تھی۔ فان کلر کی شرٹ
بلیک ٹائی پہنے وہ سامنے تھا۔

”پلیز دروازہ بند مت کرنا تارا۔“ میں دروازہ
بند کرنا بھول گئی تھی۔

مجھے کچھ اجانک یاد آیا تھا۔ ”تم پر فان کلر کی
شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائی بہت سوٹ کرتی ہے۔“
کتنا ہنسنا تھا۔

”لگتا ہے میرا جادو چل گیا ہے..... میں تمہارا
کرش ہوتا جا رہا ہوں۔“ ماضی کا بت حال میں لگا
تھا۔ ”میں پلیز اندر آ جاؤں نین تارا.....؟“

”نہیں.....“ میں نہیں چاہتی تھی وہ دروازہ
ہوتا پھر میری زندگی میں واپس آ جائے..... سارا
بھرم ٹوٹ کر رہ جاتے۔

”پلیز.....“ وہ منت کر رہا تھا۔
”ہرگز نہیں۔“

”باہر بارش شروع ہو گئی ہے اور میرے پاؤں
چھتری بھی نہیں ہے۔“

میں نے نینسی کو آواز لگائی تھی۔ ”چھاتا لے
آؤ۔“ نینسی نے آکر چھاتا اسے پکڑا دیا تھا۔
نے دروازے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”تارا..... وہ کوکب.....“ میں نے اس کے
پر غور نہیں کیا تھا۔ میں نے روتے ہوئے اس
سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”وہ کیا چاہتی ہے ارسل..... اپنی طلاق پا
دوست کو اپنے گھر رکھنا چاہتی ہے۔“

اسے..... میں اپنے وجود کی محنت کا سایہ تم دونوں
زندگی پر پڑتا نہیں دیکھ سکتی..... اسے کہنا نین تارا
خوش ہے آزاد زندگی گزار رہی ہے۔ ایک ہونٹ
جاب کرتی ہے..... آئی ایم رینکلی پٹی..... پلیز لے

(چلے جاؤ)۔ وہ چھاتا تانے سڑک پر چلتا جا رہا تھا
میں کھڑکی کے پاس کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی
تھی..... وہ آج بھی میرے دل کی دھڑکنیں روک
دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

”تم اس سے بہت محبت کرتا ہے ناں تارا؟“
”ہاں قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔“

”ہاں..... نینسی بہت زیادہ۔“ برتی بارش میں
سانٹا کلاز کی پھندنے والی ٹوپیاں لہرا رہی تھیں۔

It's about time
That we kept pace with
the speed of the pulse
Throbbing at our wrists
And when the time
comes
That our grief is hung up
to dry !!!

☆☆☆

”کوکب چلی گئی تارا..... مر گئی۔“ میں سوچ
رہی نہیں سکتی تھی کہ انیسویں دن میں دروازہ کھولوں گی
اور مجھے پہلا جملہ ہی یہی سننے کو ملا تھا ساری بلندنگ
میرے سر پر آن گری تھی اور میرے وجود کے
پے اڑ گئے تھے..... میں نے اپنے آپ کو فرش پر دو
الو ہو کر بیٹھا محسوس کیا تھا..... وہ انیسویں روز اندر آ
گیا تھا..... میرے گرم گرم آنسو میرا اپنا وجود جلانے
لگے تھے۔

”اسے کیا ہوا تھا ارسل۔“ وہ میرے ساتھ بیٹھا تھا۔
”اس کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

اب ہائی پلوں کے پار اب کی بارسا ہی تھی۔
”کہتی تھی کسی کا دل دکھانے کی سزا ایسے ہی ملتی
ہے۔“ میں نے تڑپ کر ارسل کے ہاتھ تھامے تھے۔

”نہیں ارسل نہیں..... قسم لے لو جو میں نے دل
میں اس کے لیے کوئی میل، کوئی کڑواہٹ رکھی ہو۔
میں تو آج بھی کوکب فیاض کی فین ہوں..... میں مر کر
ہی ایسا نہیں کر سکتی تھی..... وہ میرے بارے میں ایسا
دشمن بھی کیسے سکتی تھی۔“

”کہتی تھی رقیب ہو تو بد دعائیں کو سننے دیتا ہے،
نے کی بد دعا دیتا ہے اور دوست ایسا کچھ بھی نہیں
لے لے..... دوست کی تو ”چیپ“ ہی مار جاتی ہے ارسل

رحمان..... نین تار نے کیوں نہ میرا گریبان جھنجھوڑا؟
میرے منہ پر پھینک کیوں نہیں مارے..... وہ تو آخری بار
بھی غبار ہوئی رہی۔“ نینسی فیشن میگ تھا میرے ساکت
بیٹھی تھی..... تو کیا کوکب فیاض نے نین تارا سکندر کی
”چیپ“ کو دل پر لے لیا تھا.....؟

ایسی عمر میں دل کے دورے سے مرنا قیامت
ہوتا ہے جانے کیسے وہ برداشت کرتی ہوگی..... میرا
دل جھنجھٹ لگا تھا۔ نہر کے پانی کو اوک میں بھر کر اچھالتی
وہ مجھے کہتی تھی۔ ”نین تارا..... میری زندگی میں بھی
مسکے ہیں بس میں شیئر کر کے تمہاری اور پریشانیوں
میں اضافہ نہیں کر سکتی..... میری زندگی کے مسئلے
میرے ہیں اور میں انہیں حل کر لوں گی۔ تمہیں
پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ وہ اپنی
پریشانیوں سے مجھے بچا لیتی تھی اور میں۔

”کوکب..... میں بہت پریشان ہوں جانے
آگے میری زندگی میں کیا ہوگا؟“
”پاکل ہو تم مستقبل کی فکر میں حال اداس نہیں
کر لیتے۔“

آج پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے میرا شدت
سے دل چاہ رہا ہے کہ اس کا گریبان جھنجھوڑوں، دوپٹہ
لگاؤں اور پوچھوں۔ ”کوکب فیاض ماضی میں دفن ہو
کر ہمارا مستقبل اداس کیوں کر گئی ہو.....؟“

☆☆☆

”تم نے اک بار تو کہا ہوتا نین تارا کہ تمہیں مجھ
سے محبت تھی.....؟“ آج اتنے سالوں بعد ہم گھر کی
اسی روش پر ٹہل رہے تھے جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔
زندگی کے جھکشن واپسی کی راہ لے رہے تھے۔

”مگر تمہیں مجھ سے نہیں تھی ارسل.....؟“
”تم میری اچھی دوست تھیں تارا..... تم کوکب
کے لیے قربانی دے گئیں تو میں تمہارے لیے نہیں
دے سکتا تھا.....؟“

”عورت اور مرد میں بڑا فرق ہوتا ہے ارسل
رحمان۔“ میں نے فلائی بیش کی تھی۔
”تم دونوں نے مجھے کھلونا سمجھا تھا جو جاہا کیا

رحمان..... نین تار نے کیوں نہ میرا گریبان جھنجھوڑا؟
میرے منہ پر پھینک کیوں نہیں مارے..... وہ تو آخری بار
بھی غبار ہوئی رہی۔“ نینسی فیشن میگ تھا میرے ساکت
بیٹھی تھی..... تو کیا کوکب فیاض نے نین تارا سکندر کی
”چیپ“ کو دل پر لے لیا تھا.....؟

میں کوئی جاحل

نکاحی



برے نہیں لگتے۔ وہ تو بری بھی نہیں تھی میں یونورسٹی
نہر کے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں..... نہر میں
اب خار نہیں گرتے..... درخت نیلے رنگ کے پھول
گراتے ہیں..... آنکھوں میں نمی تو آتی ہے مگر نہں کر
انگلیوں کی پوروں سے پونچھ دیتی ہوں۔

”کوکب فیاض..... تم اب بھی یہیں ہو میرے
آس پاس میرے دل کے بہت قریب۔“

ارسل روز صبح آفس جانے سے پہلے میرے
پاس آ کر پوچھتا ہے۔ ”کیا اب میں تمہارا کرش ہوں
جار ہوں؟“

”زیادہ تو نہیں بس تھوڑا تھوڑا.....“ میں ناشا
لگاتی اسے چڑاتی تھی..... اور وہ بہت جلدی چڑجاتا تھا۔
”تمہارا ٹیسٹ ہی خراب ہے..... ہزاروں

لڑکیاں مر رہی ہیں مجھ پر۔“
”میں تو نہیں مرتی۔“

”تم لڑکی نہیں عورت ہو عورت۔“ میں نکیلے
کر اس کے پیچھے پیچھے ہوتی تھی۔

”میں بیوی ہوں تمہاری۔“
”جی کہتے ہیں دوست زندگی ہوتے ہیں اگر وہ

زندہ ہوں تب بھی اور اگر وہ زندہ نہ ہوں پھر بھی۔
یادوں کی صورت..... میری یادوں میں آج بھی ”وہ“

زندہ ہے..... نہٹ کھٹ، شریہ، مردوں کے معاشرے
میں عورت کے حقوق کی بات کرنے والی..... میرا ہر

مسئلہ اپنا مسئلہ سمجھنے والی.....!
میں آج بھی یہی کہتی ہوں میری زندگی میں

آنے والے لوگوں میں، میں نے دو لوگوں سے.....
تمہارا محبت کی ہے..... ارسل رحمان..... اور کوکب

فیاض.....!!
یہی میری کہانی تھی۔ نین تارا اور ایک تھی کوکب

.....؟ آپ کو کسی کی ضرورت پڑے گا.....؟
ہماری زندگی آدھی کہانی ہوتی ہے..... اور

آدھی حقیقت.....!! یہ بھی ریل گاڑی کی طرح
جکشن بدلتی رہتی ہے۔

..... میں ایک سانس لیتا، چیتا جاگتا انسان تھا ”ماٹھے
پر ٹکئیں ڈالے خفا ہوتا وہ شخص مجھے اتنا پیارا لگا تھا کہ
میرے دل سے خیال گزرا تھا..... کیا زندگی کے کسی
لحظے میں بھی وہ کوکب فیاض کو اچھا نہ لگا ہوگا؟ اس کو

اس سے محبت نہیں ہوئی ہوگی۔
”دل کو یا تو دل کا مرض لگتا ہے یا پھر محبت کا

مرض لگتا ہے۔ میرے حصے میں محبت کا مرض آیا تھا
اور کوکب فیاض کے حصے میں دل کا مرض..... آہ، وہ

ہتیرا و ایئر پورٹ پر میرے پاس بیٹھا مجھے پھر سے
زندگی جینے کے گرجھا رہا تھا۔ ”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا

نین تارا کہ تمہیں اور اپنے آپ کو کس طرح سلی، دلاسا
دوں کہ ہم پھر سے زندگی جینے لگیں..... زندگی نے ہماری

مشائٹ کا ایک کونا توڑ دیا ہے جواب واپس بھی نہیں جڑ
سکتا..... ہم تنہوں کی زندگیوں میں ہی ہم تین ہی تو ہم

اور ضروری تھے..... اور اب بھی رہیں گے..... میں نے
وہ ڈائری پڑھ لی ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے ناں جب کوئی

آپ کی اتنی پروا کرتا ہے۔ آپ سے اتنی محبت کرتا
ہے..... تمہارے لفظ، تمہاری فیملی، پڑھ کر میں خود کو خوش

قسمت تصور کرنے لگا ہوں..... کوکب ہماری یادوں میں
زندہ رہے گی تارا..... مگر ہمیں ایک دوسرے کے لیے

زندہ رہنا ہوگا۔“
میں نے ارسل رحمان کی بات مان لی تھی اور ہم

نے شادی کر لی..... نینسی سے اسکا پ پر بات ہوتی
تھی۔

”تارا..... تم نے اچھا نہیں کیا..... ارسل میرا
کرش تھا۔“ میں خوب ہنسی تھی۔

”ہمارے مذہب میں چار شادیوں کی اجازت
ہے۔“

”مائی اکثر کوئی کا ذکر کرتی تھیں ”تمہاری دوست
ایک اچھی لڑکی تھی۔“

میرے دلوں میں آج بھی اس کے لیے
دعائیں اور پیار ہے۔ وہ کیا تھی میرے دل میں

اس کے لیے میں آسکتا تھا! ہر گز نہیں۔ ہوتے ہیں
ناں کچھ لوگ وہ جتنے بھی برے ہو جائیں تب بھی

منہ بگاڑ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”تو کرائس چاکری اپنی تائی جان کی.....؟“
وہ دبے قدموں سے پھولوں کی باڑھ پھلا گئی۔
کر راہ داری ہے سے گزرنی لاؤنج کے سامنے سے
گزرنا چاہ رہی تھی مگر وہ سونیا ہی کیا جن کی نظروں
سے کچھ پوشیدہ رہ جائے۔ چھپنے کی کوشش ناکام رہی
تھی۔ وہ نظروں میں آچکی تھی۔ ایسی سانس بھر کے وہ
ان کے پاس آگئی۔

”کوئی چاکری نہیں کی میں نے۔ تائی جان کی
طبیعت تھوڑی ٹھیک نہیں تھی تو بس تھوڑا ہاتھ بنا دیا۔“
وہ سکون سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ازلی بیمار ہیں وہ..... بھابھی بیگم کی طبیعت
کبھی ٹھیک بھی رہی ہے۔“ سونیا نے منہ میڑھا کر کے
کہا تو علیہا ہادی کو افسوس ہوا۔

”مما، غیروں کی بھی طبیعت خرابی کا نہیں تو ایسا
نہیں کہنا چاہیے۔ پھر وہ تو تائی جان ہیں برسوں سے
پڑوس میں رہتی ہیں۔ ہمارے گھروں کے بچے تو کوئی
دیوار تک نہیں۔“

اے سونیا کا انداز ناگوار گزرا تو کہہ دیا مگر سونیا
کو اس کی بات نہیں زیادہ بری لگی۔

”گھر کے بچوں بچہ دیوار ہو یا نا ہو، مگر دلوں میں
ہے اور یہی بہت ہے..... زیادہ، میری اماں بننے کی
ضرورت نہیں ہے..... نا ہی مجھے کچھ سمجھانے کی۔“

سونیا حشمیں لگا ہوں سے گھورنے لگیں۔ علیہا
کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گئی کہ مقابل عام ہستی
نہیں، ماں تھی۔

”آخرا ب کو تائی جان سے مسئلہ کیا ہے۔ اتنی تو
اچھی ہیں وہ۔ آپ کی سرد مہری، جلی کٹی کے باعث
بھلے انہوں نے آجاتا نام کرو یا ہو لیکن جب بھی ملتی
ہیں کھلے دل سے ملتی ہیں۔ پھر آپ کو ان کی کون سی
بات بری لگ گئی۔“

علیہا کو آج تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سونیا کو
تائی جان سے آخر مسئلہ کیا ہے۔ کیوں وہ ہر گھڑی ان
کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔

”اگر اتنی ہی اچھی ہیں تائی جان تو وہ ہیں کیوں
نہیں چلی جاتیں اپنا پورا یا بستر لیٹ کے..... ماں
ویسے ہی بہت بری ہے تمہاری نظر میں۔“
ثانیہ کی تعریف سن کر سونیا کو بلا کا غصہ آیا تھا۔
”اف! علیہا بری طرح سر پکڑ کے بیٹھ گئی تھی
ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے ہاتھ کوئی سرا نہیں
تھا۔“

☆☆☆

”یہ پورے مہینے کی آمدنی.....؟“
پانچ پانچ ہزار کے چھ نوٹوں کو جب صاحب
نے ان کی پٹلی پر رکھا تو وہ انھیں نکال کر بھلا
موجود پیسوں کو چٹکیوں سے پکڑ کر لہرا گئیں۔
استہزائیہ اور غصے کا دلچسپ ملاپ اس وقت ان کے
چہرے پر نظر آ رہا تھا۔
”مال ختم ہو گیا تھا۔ بل اور مال کے پیسے نکال
کر ساٹھ ہزار ہی بچے تھے۔“

ہادی صاحب نے ایمان داری سے حساب
مگر سونیا کے ماتھے پر ٹنگنوں کا جال بنا جا رہا تھا۔
”تیس ہزار آپ کے بھائی صاحب لے گئے۔“

اور تیس آپ میرے منہ پر مارنے چلے آئے.....
نا۔“ وہ حشمیں لگا ہوں سے گھور رہی تھیں۔

”نیک بخت کیوں اتنی ناشکری کر رہی ہو،
اپنا ہے..... کھانے والے صرف تین لوگ..... ملا
بل اور راشن کے تمہیں اور کیا پورا کرتا ہے جو تیس ہزار
بھی کم لگ رہے۔“

”میں یہ چاہیے ہوں تو اکاؤنٹ سے نکلوا دوں
پیسوں کی تنگی کب دی ہے تمہیں جو تم مجھے یوں ذرا
کر رہی ہو۔“

ہادی صاحب کم ہی غصہ ہوتے تھے۔ سونیا
انداز اذیت آمیز لگا تو بھلا گئے۔

”میں کوئی ذلیل نہیں کر رہی۔ سمجھالے
کوشش کر رہی ہوں اگر آپ اس بزل کو اس
سنجھال رہے ہوتے تو ابھی میں کی جگہ ساٹھ
میرے ہاتھ میں رکھتے۔“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ بھائی صاحب

ساتھ برسوں کا جما جمایا کاروبار ہے۔“
ہادی صاحب کو سونیا کی دماغی حالت پر شبہ
ہونے لگا۔

”ہاں تو برسوں سے ساتھ کاروبار کر رہے ہیں
تو کیا مرتے دم تک ساتھ ہی کریں گے۔“ سونیا نے
ہنک کے کہا۔ ہادی صاحب بے بسی سے ان کی چلتی
زبان دیکھنے لگے۔ جو ان کے بھائی، بھادوچ کے
مخالف تو شروع سے چل رہی تھی مگر گزشتہ کچھ سالوں
سے ساس اور سر کے گزرنے کے بعد سے اس میں
قدرت اضافہ ہی دیکھنے میں آ رہا تھا۔

”مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا جب دونوں گھروں
میں اک جیسی اکم آتی ہے تو ترقی صرف اس گھر میں
کیوں نظر آتی ہے۔ نت نئے بیڈ شیٹ پر دے،
کر اکر کی..... آئے دن بھابھی بیگم طرح طرح کی
چڑوں سے گھر چمکا رہی ہیں اور ہمارا تو پورا مہینہ
ی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔“

”نیک بخت بھابھی سلیقہ شعار ہیں۔ دس جگہ تو
انہوں نے کتنی ڈالی ہوئی ہے۔ جب کتنی نکلتی ہے تو
گھر کے لیے کچھ تا کچھ لے آتی ہیں۔“

سونیا در پردہ کچھ اور سمجھنا چاہ رہی تھیں۔ نیا
ہتک پڑھانے کے موڈ میں تھیں۔ مگر ہادی صاحب
لے بیان پر غصہ ضبط کرنا محال ہو گیا۔

”نا آپ کا مطلب ہے، میں پھو ہڑ اور بد سلیقہ
اوں۔“ آٹھ گھنٹے ماتھے کو جا لگیں۔

”معاف کر دو۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑنا
اوں۔“ اک نیا محاذ کھلتے دیکھ کر ہادی صاحب
پاؤں پر سے ہاتھ جوڑ گئے تو کئی ٹائیے تک سونیا لب
چلتی رہ گئیں۔

”مائیں یا مائیں! آپ کے بھائی صاحب
ضرور ہاتھ کی صفائی تو ضرور دکھاتے ہوں گے۔ آخر
کو آدھا دن وہ گلے پر بیٹھتے ہیں اور مہینے کا حساب
کتاب بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

بڑے بھائی پر اتنے بڑے الزام پر ہادی صاحب
کامن تو ضرور سرخ ہوا مگر ان میں سونیا کیسی چندال
اورت کے سامنے دم مارنے کی بھی ہمت نا تھی۔

”پچھلے سال فلیٹ خرید کر کرائے پر چڑھا
دیا..... چند ماہ پہلے میاں، بیوی عمرہ کر کے لوٹے ہیں
میں پوچھتی ہوں، کہاں سے آتا ہے اتنا پیسہ ان کے
پاس.....؟“

انہی غصوں خرچی اور زبان کے چٹخاروں کو پس
پشت ڈال کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے
سونیا سارے مہرے چل رہی تھیں۔ اک بل کو ہادی
صاحب بھی ان کے دام میں آکر بھائی، بھادوچ کی
کفایت شعاری اور دین داری کو فراموش کر کے سونیا
کی نئی کہانی کے تانے بانے میں الجھ گئے۔

”کیا معلوم بھائی صاحب واقعی ایسا کرتے
ہوں۔“

”جب دیکھو بھائی صاحب دکان سے چھٹی
کر لیتے ہیں کبھی طبیعت خرابی کا بہانہ، کبھی حج عمرہ،
کے پھیرے..... پیچھے کاروبار کو سنبھالنے کے لیے
آپ رہ جاتے ہیں..... جب ایسا ہی ہے تو آپ
کاروبار میں بٹوارا کیوں نہیں کر لیتے.....؟ پھر پتا
چل جائے گا کون کتنا کہا رہا ہے اور کون چوری کر کے
عیش کر رہا ہے..... آپ میں صلاحیت ہے آپ پورا
کاروبار اکیلے چلا سکتے ہیں تو پھر پارٹنر شپ کی کیا
ضرورت ہے۔ کیا اچھا نہیں کہ پورا منافع لاکر
میرے ہاتھ میں رہیں۔ اور ہم بھی ترقی کریں.....
کب تک یہ بابا کے بننے ہوئے گھر میں رہیں گے۔“

بالا خرابی طویل کہانی کا خلاصہ ہو ہی گیا تھا کہ
سونیا کا کہنا کیا چاہ رہی تھیں۔ ہادی صاحب سوچ
میں پڑ گئے تھے۔
”واقعی! پورا کاروبار تو پوری بچت۔“ لالچ نے
دستک دی تھی۔ انہیں کشش میں مبتلا کر کے سونیا
آرام سے سو گئی تھیں۔

☆☆☆

”گھر آئے مہمان کی کوئی عزت نہیں..... ناٹ
فیئر۔“ سفید شلوار سوٹ اور لال دوپٹے میں وہ لاؤنج
سے بے دھیانی میں گزر رہی تھی جب آٹھویں آواز نے
توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔
”آپ کی تعریف؟“

اجنبی کوریلیکس انداز میں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے زیادہ اسے اس کے انداز مخاطب نے حیران کیا تھا۔ اجنبی اٹھ کر اس تک آیا تھا۔

خاصی خوب صورت ہو گئی ہو۔“
وچپی سے دیکھتے مقابل بے باکی سے تعریف کر گیا تھا وہ جو اسے برداشت کر رہی تھی۔ اس بے باکی پر ہاتھ پر شکلوں کا جال بچھا گئی۔

”اور آپ خاصے چپ معلوم ہوتے ہیں جو یوں کسی کے گھر میں کھڑے ہو کر اس درجہ بد نیزی کا ارتکاب کر گئے۔“ لفظ چپا چپا کر ادا ہوئے تھے۔ مقابل کھینانے کے بجائے مسکرانے لگا تھا۔

”پہنچنا نہیں.....؟“ او ایس ہوں..... تمہاری عارفہ خالہ کا بیٹا۔ کل ہی امریکا سے لوٹا ہوں۔“
مقابل کے تعارف کروانے کا بھی اس پر خاک مطلق اثر نہ ہوا۔ ہاں اسے وہ چھوڑا سا، خفی اپنا کزن ضرور یاد آ گیا تھا جو اس وقت کافی بدل چکا تھا۔

”پہنچاؤں کیسے.....؟“ ماشاء اللہ کافی بدل چکے ہیں۔ لیکن اللہ گواہ ہے۔ چھوڑ پین پر امریکا کا پانی مزید رنگ لے آیا ہے۔“
بغیر لگی لپٹی رکھے اس نے بھگو کے جوتا مارا تو وہ ہنس پڑا۔

”بدلی تو تم بھی نہیں ہو۔ زبان آج بھی دو دھاری تلوار ہے۔“ مقابل بھی ڈھیٹ واثق ہوا تھا۔
بجائے برامانے کے لٹو ہوئے جارہا تھا۔
”نا پسندیدہ لوگوں پر زیادہ زبانی جمع خرچ کرنے کی عادی نہیں..... تشریف رکھیں ماما آتی ہی ہوں گی۔“

وہ جلد سے جلد اس کی نگاہ سے ہٹنا چاہ رہی تھی۔
”علیہا! ملی تم او ایس ہے.....؟“ کتنا بدل گیا ہے نا.....؟ سو نیا غالباً بھانجے کی تواضع کے لیے کچن میں گئی تھیں۔ اسے او ایس کے مقابل دیکھ کر گرم جوشی سے پاس آئیں۔

”بالکل، خاصے بدل گئے ہیں۔ تیز و لحاظ کی کی تو ان میں پہلے ہی پانی جاتی تھی۔ مزید رنگ امریکا کی آزادی نے بھردیے۔“

او ایس کی بے حجاب نگاہوں سے خائف ہو کر وہ ازلی منہ بچھٹ کہنے سے ناچوکی..... مقابل کے ماتھے پر اب کے کچھ بل لانے میں وہ بالآخر کامیاب ہو گئی۔ سو نیا نے نگاہوں میں گھر کا، جنہیں نظر انداز کر کے وہ پھولوں کی باڑھ کے قریب پہنچ گئی۔
”تانی جان کی طبیعت پوچھنے جارہی ہوں۔“
اس سے پہلے کہ سو نیا کچھ کہیں وہ کم ہو چکی تھی۔ سو نیا بلبلانے رہ گئیں۔

☆☆☆

سڑھیوں سے اوپر آ کر سب سے پہلے کچن ہی بڑتا تھا۔ کھڑ پٹری کا آواز آنے لگی تو ثانیہ کا گمان کر کے آگے بڑھنے کے بجائے وہ کچن میں چلی آئی۔

بڑا دلچسپ منظر تھا۔ سیل فون کی بلے لسٹ میں بڑا مدھر گیت بج رہا تھا۔ شیف غازی شیف بنا کھڑا تھا۔ ہاں اسٹک پین میں نا کافی پانی تھا۔

”اتنے بے دن آگئے لوگوں کے کہ شیف بن گئے.....؟“ وہ بے ساختہ چھیڑ گئی۔ شیف نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پاستا میں چھچھلا تارہا۔

”ہاں جی! کیا کریں۔ ہم کون سا کسی کے پیارے ہیں جو کوئی حسینہ، مہ جبینہ ہمیں پکا پکا کر کھلائے گی۔“

اس نے بھی دکھڑا رویا۔ تو وہ ہنس دی۔
”مجھے بلا لیتے۔“ اپنی خدمت پیش کی۔

”کاغذ بنوا کر تم سے دو چار سائن کروالوں پہلے، پھر حق سے رو کے رکھوں گا۔ بلانے کی بھی ٹینشن نہیں ہوگی۔“

علیہا کے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔
”ہٹو! میں بنا دیتی ہوں۔“

”نا..... سب کچھ میں نے کر لیا ہے اب تم انگلی کوٹوا کے شہیدوں میں نام لکھوانے نا کھڑی ہو جاؤ۔“ صاف ہری جھنڈی دکھائی گئی۔

”او کے!“ وہ آرام سے سائڈ ہو کر بے بی کارن کھانے لگی۔
”چو اس بڑی اچھی ہے۔“ اشارہ گانے کی

طرف تھا۔ چھو لیا تو نے لفظ آنکھوں سے۔ “شرارت سے کہا۔

”تو ملے جہاں، میرا جہاں ہے وہاں۔“ اگلا مصرعہ علیہا نے پورا کیا تھا۔

”آگے بھی بول دو، میں واری جاؤں۔“
شرارت سے چھیڑنے لگا۔

”میں کیوں واری جاؤں.....؟“ ناک چڑھائی گئی۔

”او ہوا بیٹی ٹیڈو!“ وہ ہنسا۔

”آہو..... شیف غیل غازی مزے دار سا پاستا بنا کر لے آئیں، میں تب تک تانی جان کی طبیعت پوچھ لوں۔“ وہ جانے کو پتو لے گئی۔

”میری طبیعت بھی پوچھ لیا کرو بھی۔“ روکنے کی ٹی کی۔

”تمہاری طبیعت کو کیا ہوا؟“ تیکھی چوتھوں سے گھورنے لگی۔

”مریض عشق ہوں کر دے دو!“ شوخ سوال آیا۔
”کمی چورنی سے دل پر ہاتھ رکھالو..... دل

سے ساتھ جیب پر بھی ہاتھ رکھ جائے گی۔“ شوخی سے جواب دیتی اندر بڑھ گئی تھی۔
”السلام علیکم!“

اندرا آئی تو ثانیہ نیم دراز کتاب پڑھ رہی تھیں۔
”ارے میری بچی..... آؤ میری جان!“ ثانیہ

ال کی آواز سنتے ہی کتاب رکھ کر چشمہ درست کرتے اس کے لیے باہیں واکر چکی تھیں۔ وہ مسکراتے

ہوئے ان کے بازوؤں میں جاسانی۔ وہ جب بھی ملتی تھیں، اسی گرم جوشی سے ملتی تھیں، انداز میں والہانہ

ہاں، لفظوں میں محبت کی گرمی سے علیہا ہادی ان کی طرف اور چھٹی چلی آتی تھی۔ تب ہی تو اکثر سو نیا کی

کتاب کا نشانہ بن جاتی تھی۔
”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ پیار لے کر

الگ ہوئی وہ تو حالت دریافت کر رہی تھی۔
”بالکل ٹھیک ہوں لیکن یہ شیف ہے کہ بستر سے

اٹنے نہیں دے رہا۔ مجھے یہاں بٹھا کر جانے کچن میں لیا کر بڑ کر رہا ہے..... تم سناؤ گھر میں سب ٹھیک ہیں،

سو نیا اور ہادی۔“ دہائی دیتی ثانیہ احوال پوچھنے لگیں۔
”سب ٹھیک ہیں۔ آپ چکر لگائیں نا ہماری طرف دل بھی بہل جائے گا۔“

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا مگر ثانیہ کے چہرے کا رنگ جتنی تیزی سے بدلا تھا اس پر علیہا ہادی کو اک لمحے کے لیے شرمندگی سی ہوئی۔ اول تو سو نیا ملنا پسند ہی نہیں کرتی تھیں، اگر ثانیہ بھولے بھٹکے آ بھی جاتی

تھیں تو سو نیا خود کو کسی کسی کام میں مصروف ظاہر کر کے ان کے پاس دو گھڑی بیٹھنا بھی گوارا نہیں

کرتی تھیں۔ ہادی صاحب وقت دینے کی کوشش کرتے تو سو نیا کی گھوری پر آگے پیچھے ہو جاتے تھے

اور ایسے ردیے پر ثانیہ بھی جلدی چلی جاتی تھیں۔ ایک تو بن بلانی مہمان، دوسرے اتنا غیر مناسب

انداز..... وہ کب تک یکطرفہ رشتہ نبھا سکتی تھیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں ضرور آؤں گی۔ اپنی بیٹی سے تو ہمیں مل جیتی ہوں نا..... اور بس طبیعت تھوڑی

ست رہنے لگی ہے۔ چکر آ جاتے ہیں تو دل ہی نہیں کرتا، کہیں آنے جانے کو۔“

ثانیہ نے اس کی خفت دور کرنے کی سعی کی تو وہ پھیکے سے مسکرا دی۔

”خیال رکھا کر س اپنا۔ ان شاء اللہ جلد طبیعت میں بہتری آ جائے گی۔ بس آپ بد پرہیزی نا

کریں۔ دو وقت پر لیں گی تو شوگر کنٹرول میں رہے گی۔“ وہ ان کی زور دہنی دور کرنے لگی۔

”یہ لیں لیڈیز! اگر ما گرم پاستا انجوائے کریں جائے کے ساتھ اور مجھے دعا میں دیں۔ اسی گھڑی

شمیل پاستا اور چائے کی ٹرے اٹھائے چلا آیا تھا۔ خود سر و کرتے داد کا خواہاں تھا۔

”تانی جان! یہ چائے کی شکل کچھ کالی لگ رہی ہے نا۔“ خاصی خوش رنگ چائے کو وہ تنقید کا نشانہ

بنائی تو شمیل آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگا۔
”ہاں، لگ تو رہی ہے۔“

ثانیہ نے بھی شمیل کو ستانے میں اس کا بھرپور اچھوڑ دیا۔ وہ بلبلانے لگا۔

”ارخ گواہ ہے، عورتوں نے کبھی مرد کا ساتھ

”دیکھا میں تاکہ بتی تھی۔ پورے مہینے کم رہا، لیکن آج دو ہزار زیادہ ہیں۔ دو ہزار روزانہ کے حساب سے مہینے کا حساب لگا لیں یعنی ساٹھ ہزار۔ ساٹھ ہزار مہینے کے آپ کے بھائی نکال رہے تھے اور ابھی تو دو ہزار ہی ہمارے علم میں ہیں۔ واللہ عالم جا۔ کتنے زیادہ نکالتے ہیں۔ میں تو پہلے کہتی تھی تر ایمان داری سے تھوڑی ہوتی ہے۔“

خاصا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ علیہا نے ان کا پورا سامان دے دیا تھا اور اب بھی وہ جس طرح ثانیہ کے منع کرے۔

انہوں نے کڑبی نگاہ سے دیکھا تھا۔

ہادی صاحب کے رویے میں کھنچاؤ اور اسٹور پر

ان کے طرز عمل کے باوجود غازی صاحب نے اپنا انداز نارمل ہی رکھا ہوا تھا۔ ہاں یہ سارا قصہ انہوں نے دھجی دل سے ثانے سے ضرور شیر کیا تھا۔

”اچھی بات ہے ہادی بھی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔ برسوں سے کاروبار کا حساب کتاب آپ نے دیکھا ہے۔ کرنے دیں اب سے اسے..... شاید اسی بہانے اس کا حساب اچھا ہو جائے..... ہمیشہ کہتا تھا بھابھی بیگم مجھے دو جنج دو سے انجمن ہوتی ہے۔“

بھڑکانے کے بجائے ثانے نے سمجھاتے ہوئے آخر میں ہنستے ہوئے ہادی کے برسوں پرانے جملے دہرا کر ان کی زور دہی دور کرنا چاہی تو غازی صاحب مسکرا بھی نہ سکے۔ ہادی صاحب نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا تھا اس پر اسٹور کے لڑکے بھی نوٹس لے چکے تھے۔ اور سب انہیں جس طرح مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے انہیں شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

”وہ تو اس نے بچپن میں کہی ہوگی۔ اب تو ہادی بہت بڑا ہو گیا ہے۔“ وہ کچھ دکھ، کچھ درد کی کیفیت میں کہہ کر رخ پھیر گئے تھے۔

ثانیہ نے ایک بھائی کے لیے دوسرے بھائی کے کرب کو دیکھا تو اسی ضمن میں یہ دعوت رکھ لی کہ شاید مل بیٹھنے سے دوریوں میں کچھ کی آجائے۔

ہادی اور سونیا آتو گئے تھے لیکن ان دونوں کے انداز کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ سونیا نے سب کے سامنے علیہا تک کو نہیں بخشا تھا۔ تب ہی ثانے اس کی مدد کو آئی تھیں لیکن سونیا کو بے حد ناگوار گزرا۔

”لڑکی ذات ہے بھابھی بیگم..... اپنے گھر میں رہنے کی عادت ڈالے تو ہی اچھا ہے..... بھلے ہمارے گھروں میں دیوار نہیں ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ پھولوں کی باڑھ بھلا لنگ گردن میں دس بار یہاں کے چکر لگانی رہے۔ کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہے ہم نے۔ لڑکے والے دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔ بھلے گئے تانیا کا گھر ہے۔ مگر ماں، باپ کا تو نہیں۔“

سونیا نے جس طرح گھیر کر آگ لگائی تھی اس پر سوائے ہادی صاحب کے سب ہی اپنی اپنی جگہ ٹھنک کر سونیا کو دیکھنے لگے تھے۔ علیہا ہادی کو یہ بے وقت کی راکتی فضول لگی تھی۔ تو غازی اور میل کو ان کا انداز بہت کچھ واضح کر چکا تھا۔

”سسرال.....! سونیا اگر تمہیں یاد ہو تو ہم نے ہمیشہ سے یہ ہی کہا ہے کہ علیہا میرے میل کی ہے کیوں ہادی تم تو گواہ ہو، نا؟“

ثانیہ اچھے سے کا اظہار کر کے ہادی کو مخاطب کر گئیں تو وہ نظریں چرانے لگے۔ میل کا سر بے ساختہ جھک گیا تھا۔ علیہا کو بھی ماں کی بات کچھ پلے نہیں پڑی تھی۔

”بھابھی بیگم! بے شک آپ لوگوں نے کئی بار عندیہ ظاہر کیا لیکن آپ سب گواہ ہیں کہ ہم نے بھی ہادی نہیں بھری، ہمیشہ یہی کہا کہ ابھی مناسب وقت نہیں ہے۔“

سونیا کے اک دم سے بولنے پر میل کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ علیہا بھی آنکھیں پھاڑے سونیا کے انداز ملاحظہ کر رہی تھی۔ غازی صاحب کو جانے کیوں کسی بہت بڑی گربڑ کے آثار نظر آرہے تھے۔

رہ گئے ہادی صاحب تو ناوہ تین میں تاہیرہ میں۔

”ٹھیک ہے اس وقت بچے پڑھ رہے تھے۔ اب تو خیر سے دونوں فارغ ہیں۔ علیہا کے کریجویٹن کا رزلٹ آجائے تو وہ بھلے آگے پڑھتی رہے۔ رشتے شادی کے بعد..... ہمیں کیا اعتراض ہوگا بھلا..... اب تو عمر بھی مناسب ہے دونوں کی۔“

ثانیہ نے بات آگے بڑھائی تو سونیا کا منہ کڑوا ہو گیا۔

”تمام والدین چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی جہاں جائے راج کرے..... خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ علیہا میری اکلوتی اولاد ہے۔ بطور ماں میں نے بھی یہ تلاش جاری رکھی ہوئی تھی۔ اور اب ارادہ علیہا کی شادی اپنے بھانجے اویس سے کرنے کا ہے۔ ماشاء اللہ امریکا سے آیا ہے۔ ڈالریں کھیل رہا ہے۔ جب کہ میل کی تو ابھی کوئی

نوکری بھی نہیں ہے۔“

بڑے آرام سے صورت پھونک کر آخر میں ان کا لہجہ استہزاء سے ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ دنگ رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہادی صاحب بھی۔ انہیں اتنی خبر تو تھی کہ سونیا کا ارادہ میل کو داماد بنانے کا قطعاً نہیں تھا مگر وہ اویس کے لیے سوچ رہی ہیں وہ بھی اس بات سے انجان تھے۔

”میں اویس سے شادی نہیں کروں گی۔“ علیہا ہادی کا فشار خون بلند ہونے لگا۔

”فیصلہ تمہارا نہیں میرا چلے گا۔ اب تم کسی ٹٹ پونچے کو میرے سامنے لا کر آؤ گی تو کیا میں تمہیں گنوں میں چھلانگ لگانے دوں گی۔ یوں دوسرے کے گھر میں بیٹھ کر یہاں کوئی بھی تماشا کرنے کی ضرورت نہیں ہے..... گھر جاؤ میں آکر بات کرنی ہوں، تم سے۔“

سونیا کا بس نہیں چل رہا تھا انکار پر علیہا کو دھتک کے رکھ دیں۔ ان کے ٹکائے طنز کرنے پر ثانے اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھیں۔ وہیں میل کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔ ٹٹ پونچا اسے ہی تو کہا گیا تھا۔

”آپ کیا اگلی صدی میں بات کریں گے..... وہ بات کریں جس کے لیے آئے ہیں۔ یہاں تو سب جانے کون کون سی امید بالے بیٹھے ہیں۔“

حقیقتاً ان کی زبان کے آگے خندق تھی۔ ہادی صاحب کو ڈانٹ پلا کے آخر میں وہ بڑبڑا کر رہ گئیں لیکن آواز اتنی ضرور رکھی کہ مکین بھی سن لیں۔ سب کو ان کے انداز پر افسوس ہو رہا تھا۔

ماں کے رویے سے شرمندہ علیہا، ثانے، شکیل اور غازی صاحب کے چہرے دیکھنے لگی۔ تینوں ہی سمجھ دار اور درگزر کرنے والے تھے ورنہ جس طرح سونیا کرکس کے آئی تھیں ان سب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اک محاذ کھل چکا ہوتا۔ ابھی سب یہ ہی سہہ نہیں پاتے تھے کہ سونیا کی یاد دہانی پر ہادی صاحب کو گلا کھنکار کے بولنے کے لیے برتوتلے دیکھ کر سب عجیب سے احساسات میں گھر گئے کہ کب جانے کون سا اہم اعلان کرنا مقصود تھا۔ علیہا ہادی بھی چونک گئی

تھی۔ سونیا کس بات کی طرف اشارہ کر گئی تھیں.....!!

”بھائی صاحب! مہنگائی دن یہ دن بڑھ رہی ہے۔ کب تک اس چھوٹے سے گھر میں رہیں گے۔ آپ کا تو خیر سے بیٹا ہے لیکن مجھے بیٹی کی شادی کے لیے پیسے بھی جوڑنے ہیں..... اس لیے میری خواہش ہے کہ ہم اس کاروبار کا بھارا کر دیں۔“

بلی تھیلے سے باہر آئی گئی تھی۔ غازی صاحب خاموشی سے بھائی کے رنگ دیکھ رہے تھے۔ آثار تو اک ماہ پہلے ہی رونما ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آج رنگ پکا پڑ گیا تھا۔

علیہا ہادی دکھ و افسوس سے ماں، باپ کے چہرے دیکھ رہی تھی تو دوسری طرف ثانے اور غازی کے چہرے پر درد کی کیفیت دیکھ کر اسے رونا آرہا تھا۔ ہاں میل اب تک خود کو سنبھال چکا تھا۔ سونیا کو پہچان تو وہ بہت پہلے ہی گیا تھا بس کھل کر وہ اب سامنے آئی تھیں۔ ابھی تو دل کی بساط الٹنے کی خبر سن رہی تھی اس پر افسوس بھی نا کر سکا تھا کہ رشتوں کی بنیاد ہلنے لگی تھی۔

”صبح ہی سے اسٹور کو بیچنے کی کرتا ہوں پھر الگ الگ کاروبار.....“ ہادی صاحب آرام سے گویا ہوئے تھے۔ مگر غازی صاحب نے سرعت سے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

”یہ گھر اور کاروبار اب مرحوم نے ہم دونوں بھائیوں کے نام کیا تھا کہ ہم ہمیشہ ساتھ کاروبار کریں اور اک دوسرے کے قریب رہیں لیکن اگر تمہیں یہ گھر چھوٹا لگنے لگا ہے تو بھلے تم تین سو ساٹھ گز کا گھر چھوڑ کر بڑا گھر لے لو۔ میرے پاس خریدنے کی اوقات ہوئی تو تم سے تمہارا گھر خرید لوں گا کہ یہ میرے ابا مرحوم کی نشانی ہے۔ ان کی حق حلال کے چونے اور اینٹوں سے بنا گھر ہے۔ مزدوروں کے ساتھ اپنا پسینہ بھا کر میرے ابا مرحوم نے جس گھر کی بنیاد ڈالی اسے غیروں کے ہاتھ جاتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور رہی کاروبار میں بھوارے کی بات..... میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ کاروبار کا بھارا ہو یا اسٹور کے۔ اس کی

اجازت میں تمہیں کبھی نہیں دوا گا کہ تمہارے ابا کی نشانیوں کو ختم کر دو۔۔۔۔۔ ہاں اس کاروبار کو کھرنے سے بچانے کے لیے دست بردار ضرور ہو سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اب بچے تم بھی نہیں رہے جو ناواقف ہو کہ کاروبار راتوں رات کھڑا نہیں ہوتا۔

ہادی صاحب کی بات کاٹ کر وہ بولنا شروع ہوئے تو کئی جگہ ان کی آواز لڑکھائی۔۔۔۔۔ کئی جگہ رکے۔۔۔۔۔ والد محترم کا تذکرہ جہاں لہجہ گلوگیر کر گیا وہیں چھوٹے بھائی کی تو تاجپوشی پر دل نوحہ کنٹاں تھا۔ مگر انہوں نے بات مکمل کر کے دم لیا۔ ان کی گفتگو کے دوران سونیا کو لگا تھا وہ انکار ہی ہوں گے۔ اڑ جائیں گے مگر آخر میں انہوں نے جس طرح دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ اس پر انہیں گونا گونا خوشی ہوئی پورے کا پورا کاروبار ان کا۔۔۔۔۔ واہ!

”کاروبار سے دست برداری کے بعد پھر آپ کیا کریں گے بھائی صاحب۔۔۔۔۔؟“ ہادی صاحب کی رگوں میں شاید اب بھی خون جوش مار رہا تھا۔ ان کی فکر مندی پر غازی صاحب استہزائیہ انداز میں مسکرائے۔

”کرلوں گا کچھ نا کچھ۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری۔۔۔۔۔“

”نہیں! میں کاروبار میں سے حصہ نکال کر آپ کو دوں گا۔ ہادی صاحب اڑے رہے۔ سونیا نے گھور کے دیکھا۔ مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، چچا جان۔۔۔۔۔ بابا کا بیٹا ابھی زندہ ہے۔۔۔۔۔ نوکری کیا، اب انہیں کاروباری انجنوں میں بھی بڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ گھر میں آرام کریں گے۔۔۔۔۔ گھومیں گے، پھر میں گے۔۔۔۔۔ دوستوں میں جائیں گے۔ دوران تعلیم ہی میں نے پائرنر شپ پر گڈ زکاز بزنس شروع کر دیا ہے۔ آپ کے بھائی کا بیٹا بھلے ابھی ٹیٹ پونجا ہو مگر آنے والے دنوں میں نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ!“

”ٹائیپ اور غازی صاحب کی اعلا تر بیت ہی تھی جو وہ کافی دیر سے چپ کر کے ساری بکواس ملاحظہ کر رہا تھا۔ لیکن جب بولنا شروع ہوا تو حد ادب کو ملحوظ

رکھ کر اس نے شاید کوئی دھماکا کر دیا تھا۔ سونیا نخت سے اسے گھورنے لگی تھیں۔ سمجھ گئی تھیں، در پردہ انہیں جواب دیا ہے۔

”جب معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تو بیٹھنا کس بات کے لیے۔۔۔۔۔ چلیں انھیں۔۔۔۔۔ اللہ حافظ سب کو۔۔۔۔۔ علیا گھر چلو۔۔۔۔۔“

سونیا بڑے خطرناک سے انھی تھیں۔ ہادی صاحب کو اسٹے کا کہہ کر علیا کو بازو سے پکڑ کر آگے کرتی اللہ حافظ کر گئیں تو سب ان کے انداز دیکھتے رہ گئے۔ علیا اس وقت جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن سونیا جس طرح بازو دو بچے اسے چلنے کو کہہ رہی تھیں۔ کچھ بعد تاخا زور آزمائی پر آگ آدھ پھڑ ہی جڑ دیتیں۔ مکمل غازی نے چلے جانے کا اشارہ کیا تو وہ جھڑک کر ہاتھ چھروانی ان سے آگے نکل گئی۔ سونیا نے مرو تا بھی ٹائیپ سے ہاتھ ملانا گوارا نہ کیا تھا۔

☆☆☆ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے تھے۔ وہ سب سونیا کی طرح آگے گزر گئے تھے اور پیچھے دھکی چہرے چھوڑ گئے تھے۔ غازی صاحب اک دم چپ سے ہو گئے تھے۔ مکمل کو بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کسی بھی مل ان کا ضبط جواب دے جائے گا۔ اور وہ رو پڑیں گے۔ گئے بھائی سے ملنے والے جھکے نے انہیں ٹوڑ کے رکھ دیا تھا۔

”بابا آپ پریشان نا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے چند ماہ پہلے ہی بزنس شروع کر دیا تھا عرصہ سے چھوٹی موٹی انویسٹمنٹ کرتا رہتا تھا اور ان ہی کا پرافٹ بزنس میں لگایا۔ اللہ کا شکر ہے اچھا کام چل رہا ہے۔ آپ لوگوں کو اس وقت اطلاع دینے کا ارادہ تھا جب تھوڑا سا بلیش ہو جاتا لیکن ابھی اچانک منہ سے نکل گیا۔۔۔۔۔ سوری بابا میں نے آپ لوگوں سے چھپایا صرف اس ڈر سے تھا کہ بزنس ڈوب گیا تو شرمندگی ہوگی۔“ وہ سچائی سے اعتراف کر گیا تو غازی ہولے سے مسکرائے۔

”اللہ تو بے کل رکھو۔۔۔۔۔ وہ تمہیں کامیاب کرے گا۔“ دعا یہ انداز پر وہ باب سے لگ گیا۔

”بابا! آپ کسی چیز کو دل پہ نالیں۔ بے فکری سے رہیں۔ اب سے کمانے کی ذمہ داری میری۔ ماما آپ بھی پریشان نا ہوں۔“ دونوں کے بچے چہرے اسے دکھ دے رہے تھے۔

”اور علیا۔۔۔۔۔؟“ ٹائیپ کی دھکی آواز بمشکل نکلی تھی۔ اک بل کو مکمل غازی کی دھڑکنیں بھی رک گئی تھیں۔ سونیا کس کروفر سے اوپس سے شادی کی بات کر گئی تھیں۔ بیسیوں کی جنگ تو وہ محنت سے جیت سکتا تھا لیکن محبت۔۔۔۔۔ اس کے سامنے بہت بڑا سوال نشان آ گیا تھا۔

”اگر آپ کے نصیب میں بہو لکھی ہوئی تو وہی بنے گی۔ ورنہ کوئی اور نہیں۔۔۔۔۔“ حتیٰ لہجہ پر ٹائیپ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر سختی در آئی تھی۔

☆☆☆ ٹائیپ سوچ رہی تھیں کہ ایسا کیا ہولے سونیا کے اندر اتنی نفرت جو وہ ہم سب کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔

☆☆☆ دو دہائیں فطری شرم و حیا کے لبادے میں جھپٹی جھپٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر عورتوں، بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ دلہن دیکھنے کے شوق میں جیسے اہل محلہ اٹھ آیا تھا۔ ٹائیپ تو کل بھی یہ وقت بھٹکا چکی تھی اس لیے قدرے مطمئن تھی۔ جب کہ سونیا کی سرال میں پہلی صبح تھی۔ تاج وریٹیم نے اک دن کے فرق سے دو بہوئیں اتاری تھیں۔ اور کل دونوں کی ویسے کی تقریب تھی

”بھئی تاج وریٹیم ہاری بڑی بہو کو دکھ کر گئی تو دل میں چھوٹی بہو کو بھی دیکھنے کی خواہش جاگی اس لیے چلی آئی۔“ دیکھ لو دونوں بہوؤں کو۔“

تاج وریٹیم نے خوش اخلاقی سے محلے والی کو کرسی پیش کی تھی وہ دونوں ہال والے روم میں دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ ناشتے کے فوراً بعد تاج وریٹیم کی ہدایت پر لڑکیوں نے دونوں کو تیار کروا دیا تھا کہ دلہن دیکھنے کو لوگ آنے لگیں گے اور وہی ہوا۔ ابھی دونوں تیار ہو کر

اک مرتبہ پھر عروسی جوڑا پہن کر بیٹھی ہی تھیں کہ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ چونکہ تاج وریٹیم صاحب کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ شہرت اچھی تھی اس لیے لوگوں کو بہوئیں دیکھنے کا شوق بیچ لارہا تھا۔ ”دیکھ رہی ہوں آیا۔۔۔۔۔ بہوئیں تو ماشاء اللہ دونوں ہی بے حد اچھی لائی ہو لیکن بڑی کے چہرے پر نمک ذرا زیادہ ہے۔۔۔۔۔ نقش بھی بہت کھڑے ہیں۔“

محلے والوں نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا اور بلا کی خود پرست سونیا کو، ان کا جملہ کانٹے کی طرح چبھ گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ گردن گھما کر ساتھ بیٹھی ٹائیپ کو دیکھا تھا۔ اپنی تعریف سے قطع نظر وہ سابقہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی فضا کارنگ نہیں تھا۔ خوب صورت تو سونیا بھی تھی مگر ٹائیپ کے آگے مدہم پڑ گئی تھی۔

تاج وریٹیم نے محلے والی کو مناسب جواب دیا تھا کہ اپنی جگہ دونوں پیاری ہیں لیکن سونیا کے دل میں بال آ گیا۔ ہر کسی کی آمد پر سونیا کے کان کھڑے ہونے لگتے۔

ایسی اور اس جیسی کھسر پھر سونیا کے ذہن نے محفوظ کر لیں اور ہر بار اس کا جی چاہتا کہ کہنے والی کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے لیکن دلہنا پے کی لاج رکھنے بیٹھی ضبط کرتی رہی۔ اگلے روز ویسے کی تقریب تھی۔ اس وقت شادی زیادہ پارلر تھے۔ پھر بھی تاج وریٹیم نے دونوں بہوؤں کا میک اپ پارلر والی سے کروایا۔ سونیا جب تک تیار ہوئی رہی اس کی نگاہ ٹائیپ پر جمی رہی اور وہ پارلر والی کے کام میں مین میک اپ لگتی رہی۔

”مجھے وہی لب اسٹک لگایے جو آپ کی بہن، بھابھی بیگم کو لگا رہی ہے۔ بش آن ہلکا ہے بھابھی کی طرح ڈارک کریں۔“

اب کے بیویشن بھی جھنجھلا گئی تھی۔ سونیا کی روک ٹوک اس کے کام میں خلل ڈال رہی تھی اور بجائے اچھا ہونے کے کام برائی ہو رہا تھا۔ ”ایسا کریں آپ اپنی بہن کو میرے پاس بھیج دس اور آٹ جا کر بھابھی بیگم کو تیار کریں۔۔۔۔۔“

چہرے پر جو ماحولیت، مخصوصیت اور بھولا پن ہے وہ

”خوش رہو..... سدا سہا کن رہو، میری بچی۔“
دونوں صدقِ دل سے دعا دے رہے تھے۔ گو کہ
سو نیا کی برائی کوئی نہیں کرتا تھا مگر ساری گفتگو سنی
کا دل جل کے خاک ہو گیا۔ اس نے چپکے سے گھڑی کو
دیکھا جہاں دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

لیے دونوں میں طے پایا کہ گھر کے بیچ پھولوں کی باڑھ کے اس طرف ہادی کو شفٹ کر دیا جائے اور دوسری طرف غازی کو۔ بیٹوں نے سنا تو بہت پریشان ہوئے مگر نذیر اور تاج کی دہائی کام آئی کہ گھر میں فساد برپا ہونے سے پہلے انہوں نے

”بھئی اب ہم دونوں بڑھے ہیں بڑھیا چھین سے
مر سکیں گے اللہ نے ہمیں پوتا، پونی دونوں دکھا دیے۔
نذیر اور تاج و علبلیا کی آمد پر بے حد خوش تھے۔
لیکن سوئیا کو یہاں بھی اپنی ہار تھی لگی تھی۔ اور یہ

مقابلے بازی بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ سونیا کی رکیں تک نیلی ہو گئی تھیں۔

ان کی نفرت سے قطع نظر علیہا ہادی جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی اسے ثانیہ سے زیادہ لگاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر مکمل تھا جو اسے چپکے چپکے دیکھا کرتا تھا۔ اک دن اسے اپنی کسی کزن سے بات کرتے دیکھ کر علیہا نے کالر سے پکڑ کر سامنے کیا۔

”آئندہ ریمیا سے بات مت کرتا۔ مجھے پسند نہیں۔“ دھونس سے کہا گیا تھا۔

”کیوں پسند نہیں؟“ وہ لب دبا کر معصوم بن کر پوچھ رہا تھا۔

”میں نے کہہ دیا نا۔“ حتمی انداز تھا۔

”اک شرط پر مانوں گا۔“ وہ سودے بازی پر اتر آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”پہلے وعدہ کرو، تم بھی کسی لڑکے سے بات نہیں کرو گی، سوائے میرے، کیوں کہ مجھے بھی برداشت نہیں کہ تم کسی اور سے بات کرو، تم صرف میری ہو۔“

یہ اظہار اتنی بے اختیار تھیں کہ وہ انہوں نے ہوا تھا کہ دونوں ہی حیران رہ گئے تھے۔

نذیر اور تاج درہم کو تادیبی سفر کو روانہ ہو گئے تھے لیکن ان دونوں کی بیٹیوں کو تلقین تھی کہ اک دوسرے کا ہاتھ نا چھوڑنا مگر سونیا کی کوششیں بالآخر عرصہ بعد رنگ لے ہی آئی تھیں۔ ساتھ چھوٹے لگا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ ہادی صاحب اسٹور پر جا چکے تھے۔ انہیں اکیلے آتے دیکھ کر ورنہ کزن نے حیرانی کا اظہار کرتے غازی صاحب کی طبیعت کے متعلق تشویش سے پوچھا تھا۔ ساتھ

آنے کی دونوں بھائیوں کی برسوں پرانی عادت تھی۔ پہلے وہ بڑے بھائی کی بائیک کے پیچھے بیٹھ کر اسٹور جاتے تھے تو اب گاڑی میں ان کے ساتھ لیکن آج اکیلے ڈرائیور کے آتے انہیں خود عجیب سا لگا تھا۔

”اب سے بھائی صاحب نہیں آئیں گے۔“ انہوں نے اطلاع دی ان سے محبت کرنے والوں نے استفسار کیا تو ہادی صاحب نے انہیں جھاد کر کام پر توجہ

دینے کا ٹیکہ دینے لگے۔ ملازم لوگ کیا کہتے، کام کرنے لگے۔ لیکن ہادی صاحب کے اندر اک بے چینی در آئی تھی۔ نظر بار بار بھائی صاحب کی خالی جگہ پر جا رہی تھی اور اسٹور پر ان کے ناہونے سے کیا تبدیلی رونما ہوئی یہ بھی ان پر جلد لگنے لگا۔ بظاہر یہ ہی لگتا تھا وہ کیش کاؤنٹر پر بیٹھے ہیں مگر ان کے اخلاق کے باعث ہر ملازم ان کی بات پر سرخم کرتا تھا۔ وہ کبھی جھڑک کے بات نہیں کرتے تھے جب کہ ہادی صاحب جلدی غصے میں آکر ملازم پر برسنے لگے تھے۔ جس سے ملازم کی عزت نفس پر پڑتی چوٹ انہیں بدول کرواتی تھی مگر غازی صاحب کے ہونے کے باعث وہ ملازم کو بھلا کر درگزر کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ انہیں خبر تھی کہ کاروبار سرد گرم سے ہی چلتا ہے۔ اگر دونوں ہی گرم ہو جاتے تو ملازم ناکلتے۔

غازی صاحب اسٹور نہیں جا رہے، اس بات کی سب سے زیادہ خوشی سونیا کو ہو رہی تھی۔ علیہا ہادی کو دی گئی دھمکی پر انہوں نے عمل بھی قدم اٹھایا تھا اور پھولوں کی باڈھ کے پاس پانچ فٹ کی دیوار کھڑی کروادی تھی۔

ہادی صاحب نے بولنا چاہا تو انہیں سخت جملہ سننا پڑا تھا۔ انہوں نے دیوار تو اونچی کر دی تھی مگر شاید بھول گئی تھیں کہ علیہا کے کمرے کی کھڑکی کی ثانیہ کے گھر کے لاؤنج میں کھلتی ہے۔

سونیا مطمئن تھیں کہ علیہا ان سے ناراض ضرور تھی مگر ثانیہ کی طرف جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بس سارا وقت اپنے کمرے میں گزاری تھی۔

☆☆☆

ہم بے بس ہم مجبور پیا
مت ہم سے ہونا دور پیا
ہم کرچی کرچی دل والے
ہم ہو گئے چکنا چور پیا
جب نام تمہارا ان لیویں
ہم ہو جاویں سرور پیا
اک بار ہمیں اپنا کہہ کر
تم کرو نا مغرور پیا

ہمیں ناگ ڈسیں بے چینی کے
تم جب سے ہو مجبور پیا!
ہم آخر تیری چاہت میں
ہو بیٹھے ہیں محسور پیا!
اس دل اندر تصویر تیری
تیرا چاروں جانب نور پیا
اک چپی پریت کے بندھن میں
ہمیں مرقا نا منظور پیا.....!!

ضمیمہ گھر کی تمام لائٹس آف کر کے آخر میں لاؤنج کی لائٹ آف کرنے آیا تھا جب اسے کھڑکی پر آہٹ محسوس ہوئی۔ چونکہ کھڑکی خاصی اونچی تھی اس لیے اسے چھلانگ لگانے میں دقت ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ بے جا رگی سے کھڑکی پر بیٹھی چھلانگ لگانے سے پہلے چپلیں نیچے پھینک رہی تھی تاکہ چھلانگ لگاتے میں آسانی ہو تب اس کی نظر ضمیمہ غازی پر پڑی تھی۔ جو تھیرے انگلیوں پر رکھے اسے کھڑکی سے پیر لٹکائے دیکھ رہا تھا۔

”کھڑے شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ ہاتھ دوتا کہ میں چھلانگ تو لگاؤں۔“

رات کے اندھیرے میں کھڑکی پر بیٹھی وہ باتیں سنارہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خوب چھیڑتا مگر حالات جس بج پر تیزی سے جا رہے تھے۔ اس نے لبوں سے مسکراہٹ بھی چھپنی لگی تھی۔ وہ دن کا کھلا رات کو لوٹا تھا۔ سونیا کے لفظوں نے دن رات محنت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بنا کچھ کہے صوف کھڑکی کے نیچے دھکیل کر اس نے ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا تھا۔

جس کے باعث اس کا ہاتھ تھامے وہ بآسانی پہلے صوف پر اور پھر لاؤنج میں قدم رکھ چکی تھی۔

”تھینک یو۔ اس صوف کو اب ہٹانا مت یہاں سے ورنہ چھلانگ لگا لگا کر میرے پیر میں موج آ جائے گی۔“ پیروں میں چپل ڈالتی وہ ہاتھ پکڑے کھڑکی تھی۔

”اتنی رات گئے اس طرح نا آیا کر دو۔ چچی جان نے دیکھ لیا تو پھر تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ وہ شاید ابھی اس کھڑکی کو فراموش کر گئی ہیں۔ جس دن یاد آیا اسے

بھی چنوا دیں گی۔“ وہ سمجھانے لگا۔

”چنوا کے دیکھیں پھر میں نے بھی اینٹیں ہلا دی ہیں اس گھر کی۔“ وہ جذباتی ہوئی۔

”بری بات.....“ وہ سرزنش کرنے لگا۔

”اور رات کی بھی تم نے خوب کہی۔ دو دن سے دن کو ہی تائی اور تائی جان سے مل کے جا رہی ہوں۔ تم ہوتے نہیں ہو۔ اب تم سے ملنا ہے تو کیا کروں۔

منہ سورا کہی سنجیدہ لگا ہیں اس پر جاکٹی۔ اسکاٹی بلیوکر کے سوٹ میں شون دو پٹالے کھلے بالوں کے ہالے میں وہ خاصی دل فریب لگ رہی تھی۔

”اوہو.....! تو محترمہ بطور خاص چوری چوری مجھ سے ملنے آئی ہیں۔“ اس کی اداسی دور کرنے کو وہ شوشی سے کہہ گیا۔ آنے والا وقت جانے کیا لے کر آتا اس وقت اس پل کو تو خوش گوار بنا سکتے تھے۔

”ہاں تو ہیر، جویٹ، سوئی، ہلی، سے کم مجھے بھی مشکلات نہیں۔ کھڑے پر نا سہی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر ملنے تو آ رہی ہوں نا۔“ وہ اس کے انداز سے رنج کے محظوظ ہوا۔

”پہلے پوچھ تو لو، میں تمہارا رانھا، رو میو، مہو ال یا مجنوں بنے کو تیار ہوں بھی یا نہیں۔“ وہ چھیڑنے لگا۔

”نا کر کے تو دیکھو۔ تم پر جان وار سکتی ہوں تو تمہاری جان لے بھی سکتی ہوں۔“ دھمکانے لگی۔

”اتنی رات کو تم مجھے دھمکانے آئی ہو۔ پھر تو مجھے ڈرنا چاہیے تم جیسی جنونی لڑکی سے۔“ وہ مسکرایا۔

اک مان، اک سکون اندر اتر گیا تھا اس کے انداز پر ورنہ تو اک بے گلی سی چھائی ہوئی تھی۔

”ہاں تو ڈرو۔“ شان بے نیازی سے کندھے اچکا کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیکھے۔

”میں اتر کر زمین پر کھڑی ہوں اب ہاتھ چھوڑنے کا تکلف کر لیں۔“

”چھوڑنے کے لیے تھوڑی تا پکڑا ہے۔“ اسے جتنا تا وہ ہاتھ تھامے سیر جھوں کے اسٹیپ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

”اداس ہو.....؟“ اس کی طرف سے خاموشی رہی تو علیہا کو بے چینی ہونے لگی۔ ضمیمہ غازی کی

نظر بند پھولوں کی باڑھ کے ساتھ اٹھی دیوار پر تھیں۔
”کتنی دوریاں آگئیں۔ کیسے ٹھیک ہوگا سب
کچھ؟“ انداز پر سوچ تھا۔

ہو جائے گا ٹھیک۔ اور نا بھی ہو تو وہ نہیں ہوگا جو
مما چاہتی ہیں۔“ علیہا ہادی کا انداز قطعیت لیے
ہوئے تھا۔

”میں ساری زندگی حالات کے بہتر ہونے کا
انتظار کر سکتا ہوں لیکن تم کمزور پڑ گئیں تو.....“

وہ خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ
سونیا کے سامنے دس بار دست سوال پھیلا سکتا تھا
لیکن وہ علیہا کے ساتھ زبردستی کرتیں تو وہ کچھ نہیں
کر سکتا تھا۔

”تمہیں میری محبت اتنی کمزور لگتی ہے؟“ وہ الٹا
استفسار کرنے لگی۔ وہ بے ساختہ ٹی میس بولا گیا۔

”تو بس جب کر کے اچھی اچھی باتیں کرو.....
دو دن تمہیں دیکھا نہیں، ملی نہیں۔ دل عجیب سا
ہور ہا تھا۔ تب ہی چلی آئی کہ اگر سو بھی رہے ہو گے تو
بھی اٹھا کر باتیں کروں گی۔“

”کرو جی..... کتنی باتیں جمع ہو گئیں ان دونوں
میں؟“

تم ہی تو میرے سب کچھ ہو۔ میرے دوست،
ہم زاد، محبوب اب اور کوئی تو ہے نہیں کہ اس سے
باتیں کروں۔ دہائی دی گئی۔

”کوئی ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ورنہ اپنی بچی کی
جان نکال دوں گا۔ مجھے اپنی بچی کی بے ساختگی ہی
اچھی لگتی ہے۔“

اپنا سر ہولے سے اس کے سر سے ٹکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

”عید الاضحیٰ کا چاند نظر آنے والا ہے اس بار عید
قربان کیسے منائیں گے۔“ ثانیہ بہت آزر وہ لہجے
میں دریافت کر رہی تھیں۔ ہر عید، بقرہ عید پر دونوں
فیملی اکٹھی ہوتی تھیں۔ اک سے زائد قربانی کے
جانور آتے تھے اور مل کر ہی قربانی کا فریضہ انجام
دیا جاتا تھا مگر اس بار صورت حال مختلف تھی تب ہی
ثانیہ نے تشویش سے دریافت کیا۔

☆ ☆ ☆

”قربانی! رب العزت نے ابرہیم علیہ السلام کو
آزمانے کے لیے ان کے بیٹے کی قربانی مانگی تھی۔
اور وہ سرخرو ٹھہرے تھے۔ امت مسلمہ کو اک مثال
دینے کے لیے رب العزت کو باپ بیٹے کا امتحان لینا
مقصود تھا لیکن آج..... ہم انسان کیا کر رہے ہیں؟
ہم اک دوسرے کو آزما ہی تو رہے ہیں۔ محبت کرنے
والے کو پرکھ کے..... چھوڑ کے..... خود سے دور
کر کے..... رشتوں کو آزما کے ان سے من پسند قربانی
ہی تو مانگ رہے ہیں۔ گئے بھائی پر قربان تو میں نے
بھی کر دیا..... اپنی انا..... غیرت..... مان..... میں
اسے اپنا بچہ سمجھتا رہا اور وہ مجھے چور.....“

غازی صاحب کی آواز دکھ سے بھر گئی تھی۔
”میرا تو سارا وجود ہی قربان ہو گیا..... برسوں
کی بنائی عزت، ذلت پر قربان ہو گئی۔“
انہیں گہرا صدمہ لگا تھا۔ ثانیہ کو انہیں سنہلانا
شوار لگنے لگا۔ وہ جذباتوں اور رشتوں کی قربانی پر
آنسوؤں سے رونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”قربانی! رب العزت نے ابرہیم علیہ السلام کو
آزمانے کے لیے ان کے بیٹے کی قربانی مانگی تھی۔
اور وہ سرخرو ٹھہرے تھے۔ امت مسلمہ کو اک مثال
دینے کے لیے رب العزت کو باپ بیٹے کا امتحان لینا
مقصود تھا لیکن آج..... ہم انسان کیا کر رہے ہیں؟
ہم اک دوسرے کو آزما ہی تو رہے ہیں۔ محبت کرنے
والے کو پرکھ کے..... چھوڑ کے..... خود سے دور
کر کے..... رشتوں کو آزما کے ان سے من پسند قربانی
ہی تو مانگ رہے ہیں۔ گئے بھائی پر قربان تو میں نے
بھی کر دیا..... اپنی انا..... غیرت..... مان..... میں
اسے اپنا بچہ سمجھتا رہا اور وہ مجھے چور.....“

غازی صاحب کی آواز دکھ سے بھر گئی تھی۔
”میرا تو سارا وجود ہی قربان ہو گیا..... برسوں
کی بنائی عزت، ذلت پر قربان ہو گئی۔“
انہیں گہرا صدمہ لگا تھا۔ ثانیہ کو انہیں سنہلانا
شوار لگنے لگا۔ وہ جذباتوں اور رشتوں کی قربانی پر
آنسوؤں سے رونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

ورنہ کر دو۔ بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ دونوں
الگ ہو کر خوش نہیں رہ سکیں گے۔“ ثانیہ دہائی دے
رہی تھیں۔ غازی صاحب بھی انہیں منانے کی سعی
کر رہے تھے۔ اک پل کو ہادی صاحب کا دل بھی پیچ
گیا یوں تو وہ بڑے بھائی سے نظر ملانے کے قابل
نہیں رہے تھے مگر بڑے بھائی کچھ بھی جتائے بنا علیہا
اور مکمل کے لیے منار ہے تھے۔

”معاف کریں بھائی بیگم! میں کسی کالے
چور سے علیہا کو بیاہ دوں گی لیکن آپ کے بیٹے سے
نہیں۔ مجھے آپ لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں جوڑنا۔“
گو کہ ان کے گڑ گڑانے سے سونیا کی انا کو بے حد
اقتویت مل رہی تھی مگر وہ کھیلنے والی نہیں تھیں۔

”ہم جو چاہتے تھے، وہ تو مل گیا یعنی کاروبار،
اب کیا مسئلہ ہے..... مان جاؤ علیہا اور مکمل کے
لیے۔“ ہادی صاحب سونیا کو سمجھا رہے تھے۔

”دادوؤں میں آپ کی عقل کو..... انہی مشکلوں سے
ان چونک جیسے لوگوں سے نجات ملی ہے اور بی بی ان
کے کھربیاہ کر میں انہیں پھر سے خون پینے پہ مسلط
کر لوں!“ انداز حد درجہ استہزاء تھا۔

”بی بی دے کر اپنی کمزوری ان کے ہاتھ دے
دوں تاکہ وہ لوگ کل کو پھر سے کاروبار کے لیے ہمیں
بیک میل کریں، ہے نا..... گھاس چرنے لگی ہوئی
ہے میاں جی، آپ کی عقل۔“ سونیا نے غصے سے
دیکھا تو ہادی صاحب مر جھکا کے بیٹھ گئے۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

جہاں ساڑھے تین کا وقت ہو رہا تھا۔
”سوئی نہیں؟“ قریب آ کر استفسار ہوا۔
”تمہارے لیے جاگ رہی تھی۔ اتنی رات تک
ہوتے کہاں ہو.....؟ کوئی بری ایٹمی ویٹی تو شروع
نہیں کر دی تا۔“ وہ مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
”استغفر اللہ! بندہ صبح کا نکلا رات گئے گھر آیا
ہے۔ کھانا، چائے کا پوچھتے بنا تفتیش شروع کر کے
گھر والی ہونے کا ثبوت دے رہی ہوں!“

وہ گھر میں داخل ہوا تو غڈ حال تھا مگر اس کی
صورت دیکھ کر تازگی عود کر آئی تھی۔
”ہاں تو پوچھوں گی نا۔ یہ کیوں سا وقت ہے آنے
کا، اور مگر بھی بند تھا۔“ وہ کلاس لے رہی تھی۔

”اک بڑی کنسانٹ کی آج ڈیلیوری تھی بس
اسی سلسلے میں دیر ہو گئی اور سیل کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔“
”میری جان پر بی بی ہے اور لوگ بڑس کو فروغ
دے رہے ہیں۔“ وہ جمل گئی۔ جواب میں وہ کچھ نا
کہہ سکا۔ کہتا بھی کیا۔ ہزار سوچنے کے بعد بھی کوئی
راہ نہیں نکل رہی تھی جس سے سونیا کو منایا جاسکتا۔

کنسانٹ روانہ ہو گئی تھی اس کے بعد بھی وہ بے
مقصد سرکوں پر پھرتا رہا تھا۔
”عید سے دو دن پہلے ممانے نکاح کی تاریخ
رکھی ہے۔“

اندھیری رات میں وہ اک بار پھر اس کے
سامنے تھی۔ مکمل خاموشی ہے اسے دیکھے گیا تھا۔ کیا
جواب دیتا۔ علیہا کو بھی خبر تھی اس کے پاس کوئی
جواب نہیں ہوگا۔ ثانیہ اور غازی صاحب کی بار بار کی
کوشش بھی دونوں کے کونٹس میں تھی۔ سونیا اس سے
مس نہیں ہوتی تھیں۔

”مکمل ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“
میٹر جیوں پر اس سے اک اسٹیپ اوپر بیٹھی وہ
بے ساختہ اس کا بازو تھام گئی۔

”چچی جان اور چچا جان کو دھوکا دے کر تمہیں
حاصل کرنا گوارا نہیں۔ محل کو یہی بے قاعدگی تمہیں
افسوس میں مبتلا کر دے گی..... تم میری بیوی تو سب
کے سامنے، یوں چوری چھپے نہیں۔“

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

بلیک جنر، ٹی شرٹ اور گرے جیکٹ میں ملبوس وہ بلا کا وجیہ لگ رہا تھا۔ بلیک بوٹ والا اک پیپر اسٹیپ کے اوپر اور دوسرا اس سے نیچے تھا۔
 ”میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی سہیل۔“ وہ بے حد درود سے گویا تھی۔ گردن موڑ کے وہ بے ساختہ اسے دیکھے گا۔ بلیک سوٹ پر گرے شون کا دوپٹا لیے جس کے چاروں طرف بلیک لکڑی پٹی تھی۔ ادھر کھلے بالوں میں وہ پریشان نظر آرہی تھی۔
 ”میں کب تمہیں گنوا نا چاہتا ہوں؟“ الٹا سوال ہوا۔

وہ کھڑکی طرف بڑھی تھی۔ اک یہ ہی دھڑکا تو روز
اول سے میل کے دل کو لگا تھا اگر سو نیا ناما میں تو اور
وہ نہیں مان رہی تھیں۔

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ مکمل فوراً بولا۔
”پہلے شرط تو سن لو۔“ علیہا سے تمہارا نکاح اسی صورت ہوگا جسپ تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر گھر و اماں بن کے رہو گے۔ مکمل غازی کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کی غیرت و غرور پر کیسے تازیانہ لگانے والے جملے تھے۔
ثانیہ اور غازی کو بھی افسوس ہوا نا کی ذہنیت پر۔

تھے۔ ان کے چھوڑنے کے بعد یہ ملازموں میں بھی بے قاعدگی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے آئے دن وہ اب ان کے عتاب کا نشانہ بنتے تھے۔ یونیا کے سامنے تو بھی بولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی وہ ساری بھڑاس ملازموں پر نکال کر اپنی مردانگی کو سہلاتے رہتے تھے۔ لیکن النابیہ دانتا تھا۔ ان کی ڈانٹ پھٹکار سے تنگ آ کر وہ ملازموں نے کام بھی چھوڑ دیا تھا۔ سیزن کے موقع پر ملازم کی کمی ان سمیت گا بک کو بھی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں نے کئی لوگوں کو بول رکھا تھا۔ مگر اتنی جلدی ملازم ملنا ممکن نہیں تھا۔ اوپر سے مال کی کمی نے انہیں سوچ بچار پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے سیلاٹر سے رابطہ کیا تھا اور اس نے ساری بے منت عیش کی صوت میں کہہ کر انہیں حیران کر دیا تھا۔

”کہا تھا تا، علیہا ہادی تم پر قربانی تو ہو سکتی ہے قربانی نہیں دے سکتی۔“ مسکراتے لیوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

”باگل لڑکی!“ متاع حیات کی طرح سمیٹے وہ اپنی مضبوط پھلی سے اس کی کلائی دبا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے اٹھا کر باہر کی سمت بھاگا تھا۔ غازی صاحب پہلے ہی گاڑی نکالنے کو دوڑے تھے۔ ثانیہ تقریباً بھاگ کر میل کے ہر قدم ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہادی صاحب بھی متوحش پیچھے لگے تھے۔ سونیا حق دق لڑکھڑا کر دروازے سے الجھتی تھیں۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو دواؤں کی بو..... اسٹینڈ پر لگی ڈرپ، باپٹل کی چھت کو دیکھتے اس نے کرب سے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ دوسرا ہاتھ کی گھنٹوں سے تھامے فہیل جو بنا پلکس جھپکے اس پر نظر میں جمائے بیٹھا تھا۔ اس سے یہ عمل پوشیدہ نہ رہ سکا۔ کبھی بچھ کر کلائی میں لگے ٹانگوں میں کھجوا صاف محسوس ہوا تھا۔ اس کی طرف گردن موڑے بنا وہ اس لک کو پہچانتی تھی۔ ”میں زندہ کیوں ہوں؟“ آنسو آنکھ کے کونے سے نکل کر تکیہ میں جذب ہونے لگا تھا۔

”میرے لیے۔“ ہتھیلی پر زری سے دباؤ ڈال کر اس نے ہولے سے کہا تھا۔

”کتنے گھنٹوں کی اذیت دی ہے تم نے، کچھ خبر ہے۔ جان نکال دی تھی۔“ جیسی آواز میں گھر کر رہا تھا۔ بند پلکوں سے گرم گرم آنسو بے جا رہے تھے۔

”جب اپنا نہیں بنا سکتے تو پچایا کیوں..... مرنے دیتے۔“

”اگر جو خبر ہوتی میری بچی اتنا انتہائی قدم اٹھالے گی تو کب کا اپنا چکا ہوتا۔ یوں اس وقت اتنی ذیت میں تاہوش۔ آئے ہیٹ مائے سلیف“ ندامت بھرے لہجے میں اس کی سماعت کو نرم دھیمے لہجے میں بھگور رہا تھا۔

”کہا تھا تا، جان وار سکتی ہوں..... تم نے کبھی مجھے سجدی گی سے لیا ہی نہیں۔“ بند پلکوں سے گلے کرتی

وہ سیدھی دل میں اتری جا رہی تھی۔

”اب یہ خطا دوبارہ نہیں ہوگی..... صرف تمہاری مانوں گا.....“ ہولے سے اعتراف ہوا تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”وعدہ!“ تصدیق چاہتی تھی۔

”لکا وعدہ!“ مسکرا کر زری سے ہتھیلی میں دباؤ بڑھا رہا تھا۔ گھٹکار نے کی آواز کے ساتھ سب اندر آئے تو سب کی موجودگی کو محسوس کر کے فہیل غازی اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”کیسی چیری بچی۔ کیا بے وقوفی کی حرام موت کی سزا کتنی طویل ہے پتا ہے۔“ ثانیہ پیار کرنے کے ساتھ سرزنش بھی کر رہی تھیں اور وہ مسکرا کر ان کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

”کچھ لوگ زندگی اتنی حرام کر دیتے ہیں کہ حلال موت کا انتظار گراں گزرتا ہے۔“ وہ ہلکی سے مسکرائی۔

”اچھا بس بس..... ایسی باتیں نہیں۔“ ثانیہ کے سمجھانے پر وہ مسکرا کر رخ پھیر گئی۔ سونیا اور ہادی پر نظر پڑتے ہی اس کے لب پہنچ گئے تھے۔

”نما جان! جلدی سے میرے ڈسچارج کی بات کریں۔ مجھے گھر جانا ہے۔ اب سے میں آپ کی طرف رہوں گی۔ آپ رہیں گے نا مجھے اپنے گھر۔“ اس کی فرمائش پر سب ہی اک بل کو حیران ہوئے تھے۔ وہ منت آس سے غازی صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

”کیوں نہیں بیٹا..... ہمارے ساتھ ہی چلو گی۔ اب میں بھی دیکھتا ہوں کون تمہیں زبردستی لے جاتا ہے۔ غازی صاحب سر پر مان سے ہاتھ رکھتے ہادی صاحب کو دیکھنے لگے تھے کہ شاید وہ کچھ کہیں مگر وہ نظر چرائے گئے تھے۔

”تم ان کے ساتھ نہیں جاؤ گی..... میں بھی دیکھتی ہوں کیسے کوئی تمہیں لے جاسکتا ہے..... اغوا کی ایف آئی آر کنواڈوں کی میں۔“ سونیا اس وقت بھی چٹکھڑانے لگیں تو علیہا ہادی کے چہرے پر زمانے بھر کی سختی درآئی۔

”کس کے خلاف ایف آئی آر کنواڈیں گی.....؟ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنی مرضی سے

آپ کو چھوڑ کے جانا چاہ رہی ہوں۔ ہے کسی قانون میں مجھے روک لینے کی ہمت.....“ وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔ سونیا چٹکی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھیں۔ فہیل نے اسے نرم پڑنے کا اشارہ کیا مگر وہ حواسوں میں نہیں تھی۔ سونیا کو تارے دکھانے لگی۔

”آپ نے دنیا کو زری کیا ہوگا۔ مگر مخلصانہ مشورہ ہے مجھ سے مت اچھیے گا۔ میں ثانیہ یا غازی نہیں ہوں جو آپ لوگوں کی ہر زیادتی پر صبر کروں..... میں علیہا ہادی ہوں..... آپ کا خون..... آپ ہی کی طرح ضدی، خود غرض.....“

بہت کچھ باور کرا تا لہجہ تھا۔ بہت جتنا ہی ہوئی نظریں تھیں۔ سونیا جیسے آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی تھیں۔ انہیں سکھتا سا ہو گیا تھا۔ غازی صاحب اسچارج کی بات کرنے چلے گئے تھے۔ کمرے میں خاموشی رہ گئی۔

”تانی جان پلےز، تھوڑا سا پانی ملا دیں۔ گلاس کوکھ رہا ہے۔“ ماں باپ کو مکمل نظر انداز کیے وہ ثانیہ سے پانی مانگ رہی تھی۔ فہیل اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔ اور وہ گلے ہونے کے باوجود غیروں کی طرح کھڑے تھے۔ فہیل خاموشی سے اس کی بند پلکوں کو دیکھ رہا تھا جو پانی پینے کے بعد اس نے دوبارہ بند کر لی تھی۔ صاف ظاہر تھا وہ ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

”سونیا بیگم کیا ملا تمہیں یہ فساد کا بیج بوکے؟“ بھائی کو بھائی سے الگ کر کے؟ پیسوں کی حرص میں نظروں سے گرا کے؟ تم نے سالوں کی کوشش سے ہمیں الگ کر دیا۔ لیکن تمہاری بیٹی نے ایک ہی لمحے میں ہمیں تمہاری اوقات دکھادی..... آج تم یہاں غالی تھو بیٹھی ہو اور تمہاری سگی بیٹی جسے تم نے پیدا کیا وہ ان کے گھر اپنی مرضی سے رہ رہی ہے۔ جن سے تم ملوث کرتی ہو، دشمن سمجھتی ہو۔ دیوار اوچی کر دی لیکن بیٹی کے دل سے وہاں کا حشر نا نکال سکیں۔

ہو گیا شوق پورا۔ مل گئی اتنا کونسیکین؟ مقابلے بازی نے تمہیں نہیں کا نار کھا۔ تم نے اپنی آخری حد آزمائی مگر تمہیں شکست ہو گئی۔ جانتی ہو کیوں کیونکہ

مقابلہ سیدھی سادی درگزر کرنے والی ثانیہ بھابھی نہیں، تمہارا پر تو..... تمہارا اپنا عکس تمہاری بیٹی تھی..... جسے تم نے جنم دیا اور اس کی رگوں میں دوڑتے خون نے بتا دیا کہ وہ بھی تمہاری طرح ضدی اور جتنیے کے لیے بنی ہے۔

تم ہار گئی ہو سونیا بیگم! اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں جاؤ پیسوں کو بوجھ، دیوالیہ ہوتے اسٹور کا جشن مناؤ..... بھابھی بیگم کو مل کر دو۔ کیونکہ تمہاری بیٹی ماں کی گرمی ان میں محسوس کرتی ہے تم میں نہیں۔

تم ماں ہو ہی کب تم تو رقابت و حسد کی آگ میں جلنے والی اک ٹکی عورت ہو، تم نے تو کوئی رشتہ ہی نہیں نبھایا سوائے حسد، رقابت اور خود نمائی کا۔

تم اک کم ظرف عورت ہو سونیا بیگم جو رشتوں کو سمیٹنے کے لیے قربانی نہیں دیتی بلکہ ڈائن بن کر سب سے قربانی چاہتی ہے..... بیٹھو آرام سے..... جشن مناؤ اپنی ہار کا..... میں جا رہا ہوں اپنے بھائی اور بھابھی سے معافی مانگنے..... تمہاری صحبت میں، میں نے ان کا دل دکھایا۔ وہ کاروبار میری محنت سے نہیں بلکہ بھائی صاحب کی نیک نیتی پر چل رہا تھا اور تم جیسی ناکام عورت نے مجھے بھی ناکام و رسوا کر دیا۔

ہمارے گھر دو بیٹیں ایک ساتھ آئی تھیں کاش کہ تمہاری فطرت بھی بھابھی بیگم جیسی ہوتی تو تم یوں خالی ہاتھ نہ رہتیں..... افسوس مجھے اب تم پر ترس بھی نہیں آ رہا۔“

ہادی صاحب زمانے بھر کی بھڑاس نکال کر جا چکے تھے۔ علیہا تھاپٹل سے وہیں واپس آئی تھی اور اب ہادی بھی چلے گئے۔ نکاح کے عین موقع پر اس حادثے کے باعث اوپس اور آئی نے انہیں جی بھر کے ذلیل کیا تھا لیکن انہیں کچھ سناٹی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں بس ہار ہو گئی تھی..... ضد اور مقابلے بازی میں وہ اتنی اندھی ہو گئی تھیں کہ بیٹی کے جذبات بھی مفل کرنے افسوس نہیں ہوا تھا۔ اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ گھر سائیں سائیں کر رہا تھا اور ان کے اندر بھی دور تلک سناٹا پھیل گیا تھا۔ نظریں اونچی دیوار پر تھیں اور ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

Medora
Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو بہا دے
تازگی جو ہر کوئی چاہے



خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ حسان

MEDORA OF LONDON

”آؤ سونیا.....!“ انہیں تھکتے جانچنے نے خوش دلی سے کہا تو سونیا ان کے سامنے ہاتھ جوڑ گئیں۔
”بھابھی بیگم! معاف کر دیں گی مجھے.....“ بہت نڈھال انداز میں سوال ہوا تھا۔ سب کو اس کا یا پلٹ کی امید نہیں تھی۔ تب ہی حیران ہوئی ثانیہ نے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا۔

”معافی کس بات کی۔ تم چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔“ سالوں کے گلے شکوے لگوں میں دور ہو گئے تھے۔

”یہ عید قربان میں کبھی نہیں بھولوں گی جس میں میں نے اپنے اندر کی حاسد عورت کو قربان کیا۔ جانوروں کی قربانی تو فرض ہے۔ اپنی ذات میں بے غلط عناصر کی قربانی ہی اصل قربانی ہے۔

بھابھی بیگم! اب سے میں آپ سے کوئی حد نہیں کروں گی۔ سیکھنے کی کوشش کروں گی۔ آپ کی اچھی عادت اپنانے کی لگن رکھوں گی۔“

سونیا اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرنی اعتراف کر گئیں تو سب نہال ہو گئے۔

”حقاً مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ تم بھی نہیں اگر میری اولاد نا ہوتیں.....“ اسے گلے لگائے سونیا سرگوشی میں اعتراف کر گئی تھیں۔

”بھائی صاحب، بھابھی بیگم! عید الاضحیٰ پر مفتی کریں ان دو بچہروں کی یا نکاح؟“ سونیا خوش دلی سے سوال کر رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے میل اپنی آزادی قربان کرنے میں زیادہ خوشی محسوس کرے گا۔

ثنائیہ نے چھیڑا تو وہ مسکرا کر سر جھکا گیا۔ سب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

شمیل غازی کی نگاہ بے ساختہ اس پر اٹھ گئی تھی اس لگی کی محبت نے پتھر میں جو تک لگا دی تھی۔ نگاہ کی تپش پر علیہا کی نظر مل گئی۔ دودل آسودہ ہو کر اک ہی لے پھر کئے لگے تھے۔

☆☆

☆☆☆

”اف تو بہ ہے تائی جان۔ اب میں اتنی بھی کوئی بیمار نہیں کہ سوپ، دلیہ، مچھڑی کھا کھا کر منہ کا ذائقہ خراب کرو۔“ ثانیہ اسے سوپ پلا رہی تھیں اور وہ بینڈ لگی کلائی کود کھینچتے منہ بھرے دہائی دے رہی تھی۔ غازی اور میل مسکرا رہے تھے۔

”پوری کلائی ادھیڑ ڈالی اور سوپ پیتے شور کر رہی ہو۔ خون اتنا الگ بہا۔ جب تک ٹانگے کچے ہیں یہ ہی ملے گا۔“ ثانیہ نے لگی لپٹی رکھے بنا کہا تو وہ منہ بھر کر سوپ پینے لگی۔ ساتھ ہی سیل فون اٹھا کر پیج ٹایپ کرنے لگی۔

”گول گپے لا کر اپنے کمرے میں چھپا کے رکھنا۔ تائی جان نا دیکھیں۔“ فرمائش کے ساتھ ہدایت فری تھی۔

پیج بڑھ کر شمیل غازی نے ہاتھ کی روک بنا کر لبوں پر رکھتے بے ساختہ اٹھ آنے والی مسکراہٹ چھپائی۔

اسی اثناء میں ہادی صاحب آئے تھے اور آتے ہی جس طرح غازی کے پاؤں پڑ گئے۔ انہوں نے گھبرا کر انہیں کھڑا کر دیا۔

”چھوٹے بھائی کی جگہ دل میں ہوتی ہے۔ قدموں میں نہیں۔“ بنا کچھ جتاے خوش دلی سے گلے لگا گئے تو ہادی صاحب اپنی نادانی پر پھوٹ پھوٹ کے رو دیے۔ وہ بار بار سب سے معافی مانگ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے باپ کو شرمسار دیکھتی خوش تھی کہ انہوں نے غلامی کی زنجیریں تو توڑ دیں۔

”میری کم ہمتی اور بزدلی نے سونیا کے ہاتھ مضبوط کر کے میری بی بی کی جان پر بنادی۔“ انہیں قلعہ تھا۔

”جو بہت گیا اسے دہرا کے کیا فائدہ.....“ آنے والے کل کی فکر کرو۔“ ثانیہ نے مدبرانہ انداز میں کہا تو سب کی نظریں سونیا کو دیکھ کے ساکت رہ گئیں۔

”تائی جان! اگر آپ لوگوں نے مجھے دوبارہ ان کے پاس بھیجا تو میں قسم کھا رہی ہوں دوبارہ کلائی کاٹ لوں گی۔“ علیہا ہادی کو یہی لگا تھا دونوں اسے لینے آئے ہیں۔

گفت عبد اللہ

ہیرے کی بیگم

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھادج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتھے حیدر علی کی طرح تیز و طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سیدہ، خزیںہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سیدہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزیںہ اپنے پاس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزیںہ کا خالہ زاد شریل اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حیدرہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے پاس حسان صاحب کی بیٹی ریکا اس کو پسند کرنے لگتی ہے جو وقتاً فوقتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔

تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زدنی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔



سونا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خزیںہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے۔ وہ خزیںہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر کے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خزیںہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خزیںہ تیمور کی بات میں رضامند ہو جاتی ہے اور حیدرہ بیگم کو بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خزیںہ کو ایک الگ فلیٹ میں لے جاتا ہے۔

دسویں قسط



”چلاؤ مت۔ میں نے اپنی مرضی دان ضرور کی تھی لیکن اپنی اتنا خودداری گروی نہیں رکھی کہ تم جب جہاں چاہو مجھے ڈکیل کر لو یا کروالو۔“ وہ بھی بے قابو ہو گیا تھا۔

”حمزہ..... یہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں تمہیں ذلیل..... اومانی گاڈ! حمزہ میں نے تمہیں اپنے دل کی سب سے اونچی مسند پر بٹھایا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں لوگ تمہیں سر اٹھا کر دیکھیں۔ اور میرے بارے میں ایسا گمان کر رہے ہو۔“ وہ تاسف میں گھر گئی تھی۔

”یہ صرف گمان نہیں ہے ربیکا! تم مجھے اپنے گھر لے گئیں کیا مقصد تھا تمہارا۔“

”میں تمہیں مہمانے ملوانا چاہتی تھی۔“ ربیکا نے بتایا تو وہ فوراً بولا۔

”جبکہ وہ مجھ سے ملنا تو دور کی بات، میرا نام تک سننا پسند نہیں کرتیں۔“

”یہ تم سے کس نے کہا۔“ وہ ٹھٹھکی تھی۔

”کسی نے نہیں۔ میں نے خود دیکھا ان کی آنکھوں میں میرے لیے کتنی نفرت کتنی حقارت تھی اور تم مجھے یہی دکھانے لے گئی تھیں۔“ وہ اسے بھی ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔

”اف.....“ ربیکا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے اتنا بدگمان کیوں ہو گیا ہے۔

”سوری ربیکا۔ میں تحقیر، تذلیل برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اگر میرا ساتھ چاہتی ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ انڈر اسٹینڈ۔“ وہ اسے باور کرا کے اٹھنا چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”ایک منٹ حمزہ! تمہارے دل میں کچھ اور ہے تو وہ بھی کہہ دو.....“ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر سر کے بل لگا کر گویا ہوا۔

اور یہ کہ میں جو ہوں جیسا ہوں، میری حیثیت یہ ہے کہ میں تمہارے ڈیڑکی فرم میں ملازم ہوں اور تم مجھے میری اس حیثیت کے ساتھ اپنے لوگوں میں متعارف کراؤں گی۔ کراسکتی ہو؟“ حمزہ نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ تملکا کر اٹھ جائے گی لیکن وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

”کیوں نہیں۔ جب چاہو بلکہ ایسا ہے کہ آج شام میں حسن شیرانی کے ہاں ایک تقریب ہے تو وہاں ساتھ چلتے ہیں۔“

”شٹ.....“ وہ خود تملکا گیا تھا لیکن اس پر ظاہر نہیں کیا کندھے اچکا کر بولا..... ”ٹھیک ہے ایڈریس سیٹ کرو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“

”میں تمہیں پک کر سکتی ہوں۔“

”نہیں، وہیں ملیں گے۔“ اوکے۔ وہ اٹھا اور مضبوط قدموں سے اسے پیچھے چھوڑ آیا۔ لیکن یہ محض اس کا خیال تھا۔ ربیکا پیچھے رہ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کا پیچھا قبول کر کے وہ جانے کیا کرنے والی تھی۔

حمزہ نے سوچا ضرور لیکن پھر سر جھٹک دیا تھا۔ وہ ابھی صرف ربیکا کی ماما کو تملکاتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جو انتہائی حقارت سے کہہ رہی تھیں۔

”آئے ہو تو بیٹھو کچھ کھاؤ۔“

”بہر حال شام ڈھلے جب آسمان پر ستارے جگمگانے لگے تھے وہ حسن شیرانی کے عالی شان بیگلمے طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اندر آ کر رک گیا۔ وسیع لان میں روشنیوں کا سیلاب اتر آیا تھا۔ اس نے ربیکا کی حلائی میں نظریں دوڑائیں تو وہ اسے حسن شیرانی کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ بلاشبہ وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی کہ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اور جانے کب تک بہوت رہتا کہ اس کے سیل فون کی بیل نے چونکا دیا۔

اس نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا شہرینہ کی کالی تھی۔ اس نے کال نہیں لی۔ موبائل واہیریت پر لگا رہا۔ جیب میں ڈالا اور پھر دیکھا تو ربیکا وہاں موجود نہیں تھی۔

”کہاں چلی گئی۔“ وہ سوچتے ہوئے چند قدم آگے بڑھ کر پھر رک گیا۔ اب اسے جھٹکا لگا تھا کہ نظروں کے میں سامنے تیور غزنی ایک حینہ کی کمر میں بازو حمال کیسے سب سے پہلو ہائے کر رہا تھا۔ اگر صرف تیور غزنی ہوتا تو وہ آگے بڑھتا لیکن اب وہ لائے قدموں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تیور غزنی اسے دیکھے۔

جب ہی گیٹ سے نکلے ہی وہ تقریباً بھاگتے قدموں سے بایک تک آیا اور پھر بایک بھگاتے ہوئے اس نے گھر آ کر ہی جیسے سانس لیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ بیلا سے چائے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور گوکہ وہ اہتمام سے تیار نہیں ہوا تھا۔ روزمرہ جیسی تیاری تھی۔ پھر بھی اس نے چائے آنے تک کپڑے بدل لیے۔

”آپ تو کسی دعوت میں گئے تھے۔“ بیلا نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے کہا تو وہ بس ہوں کر کے رہ گیا۔

”کیا ہوا دعوت کینسل ہو گئی کیا؟“ بیلا کچھ اجنبی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم کیا تفتیش کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ چلو جاؤ۔“ اس نے ڈانٹ کر بیلا کو بھگایا پھر چائے پیتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اب اس کی سوچوں کا محور ربیکا نہیں، تیور غزنی اور اس کی پارٹنر تھی۔ اور وہ نادان نہیں تھا۔ ان دونوں کے انداز سے ان کے پیچھے لعلق کبھی سمجھ گیا تھا۔

”تو کیا خزینہ بھی جانتی ہے یا اسے اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔“ وہ اب اس نچ پر سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ حمزہ سے سخت ناراض تھی اور اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ ایک تو اتنے دن سے شکل نہیں دکھائی تھی، دوسرے شام سے وہ اسے فون کر رہی تھی تو نہ اس کی کال ریسوی اور نہ کسی میج کا جواب دیا۔ اگر مصروف تھا تو دوسرے وقت میج دیکھ کر جواب دے سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ سامنے آ جاتا تو پتا نہیں کیا کر ڈالتی۔ کتنی بار سوچا حمیدہ بیگم سے اس کے بارے میں پوچھے لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ غصہ اپنی جگہ، سوطر کے دسو سے بھی پریشان کر رہے تھے۔

اسی غصے اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں وہ کالج آ تو گئی تھی لیکن نہ پڑھنے میں دل لگا، نہ کسی اور بات میں۔ جیسے تیسے وقت گزار کر کالج سے نکلی تو دل چاہا باز کر گھر پہنچ جائے۔ اصل میں رونا چاہتی تھی اور یہ کام وہ اپنے دل میں ہی کر سکتی تھی۔

تیز تیز چلتے ہوئے اسٹاپ پر آ کر رہی تھی کہ حمزہ نے بایک اس کے بالکل قریب لا روکی۔

”جلدی بیٹھو۔“ حمزہ نے کہا تو اسے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر وہ پھر آگے چل پڑی۔

”دیکھو راستے میں غصہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔“ حمزہ کی بایک اس کے ساتھ رہنے لگی۔

”بات مت کرو مجھ سے۔“ وہ دھاڑی تھی۔

”بہنیں کروں گا۔ پکا وعدہ تمام راستہ چپ رہوں گا۔ بیٹھو شاباش“ اس کے پچکارنے پر وہ آنسو پیتے ہوئے ہی بیٹھی حمزہ نے بایک بھگادی۔

”مجھے سیدھا گھر لے جا کر اتارو۔“ اس کی آواز غصے سے بھری ہوئی تھی۔

”سن رہے ہو۔“ حمزہ نے جواب نہیں دیا چپ رہنے کا وعدہ جو کر چکا تھا۔ اپنے کندھے پر اس کے کچے بھی

چپ چاپ برداشت کرتا رہا۔ اور جب اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں اسے لاکر بٹھایا تب اس کا رونا برداشت نہیں ہوا۔

”دیکھو..... میں پہلے ہی پریشان ہوں تم رو کر مجھے مزید پریشان مت کرو۔“ حزرہ نے کہا تو وہ آنسو ہلر آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں کیا پریشانی ہے؟“

”ہا ہا..... تمہارا مطلب ہے مجھے کوئی پریشانی ہو ہی نہیں سکتی۔“ حزرہ نے حسرت بھری آہ کھینچ کر کہا تھا۔

آنکھیں رگڑ کر استفہایہ نظروں سے دیکھنے لگی تو حزرہ نے گلاس اس کے سامنے کر دیا۔

”پانی پیو۔“

”نہیں پیتا۔“ روٹھا انداز تھا۔ حزرہ نے اصرار نہیں کیا خود ہی گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا تو وہ کچھ دیر خشکیوں نظروں سے اسے گھورتی رہی پھر دانت پیس کر بولی تھی۔

”بتاتے کیوں نہیں تم کیوں پریشان ہو۔“

”پہلے تم بتاؤ۔ تمہیں کیا ہوا ہے۔ اتنے آنسو بہانے کا مطلب۔“

”بس میرا دل چاہ رہا تھا۔“ وہ کہہ کر دوسرے طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ گئی تھی کہ اس کا غصہ دور کرنے کی غرض سے حزرہ نے خواہ مخواہ اپنی پریشانی کا شوشا چھوڑا ہے۔

”اور میرا دل چاہ رہا ہے بس کہیں دور بھاگ جاؤں۔“ حزرہ نے غمگین لہجے میں کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں یار..... چلو کہیں بھاگ چلتے ہیں اس عہد کے ساتھ کہ پلٹ کر نہیں دیکھیں گے۔“ وہ اس کی طرف جھک کر بولا اور وہ اچھل پڑی۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کسی ہلکی ہلکی باتیں کر رہے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو تمہاری ان باتوں میں الجھ کر میں غصہ تمہوک دون کی تو بھول جاؤ۔ میں تم سے ناراض ہوں اور ناراض ہی رہوں گی۔ سمجھے۔“

”سمجھ گیا لیکن ناراضی کی وجہ بتاؤ۔“ حزرہ نے معصوم شکل بنا کر استفہار کیا تو وہ پھٹ پڑی۔

”میں بتاؤں۔ اتنے دن سے غائب ہوا اور کل میں فون کر کر تھک گئی اتنے سچ کیے کسی ایک کا جواب نہیں دیا کیوں؟“

”کیونکہ تمہارے سچ میں نے صبح دیکھے اور دیکھو بھاگ چلا آیا۔ آفس بھی نہیں گیا تمہاری خاطر۔“ حزرہ کا جواب اسے ہضم نہیں ہوا۔

”جھوٹ مت بولو۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ رات اصل میں موبائل واہیرینٹ پر تھا۔ اس لیے مجھے پتا نہیں چلا ورنہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے کال کرو اور میں فوراً تمہیں کال بیک نہ کرو۔ بتاؤ ایسا ہوا ہے کبھی؟“ وہ اب نرمی سے اسے رام کر رہا تھا۔ شہرینہ نے نفی میں سر ہلایا لیکن منہ پھولا ہوا تھا۔

”پھر بھی ایم سوری۔“ حزرہ نے مزید ہاتھ جوڑ کر اسے بے بس کر دیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔“

”معافی مانگ رہا ہوں موڈ ٹھیک کرو ورنہ یہیں ناک سے لکیریں کھینچنی شروع کر دوں گا۔“ حزرہ نے ٹھنڈے ٹھنڈے اسے وارن کیا تو وہ زچ ہو کر بولی۔

”میرا موڈ ٹھیک ہے۔ اب گے چلو۔“

”چلتے ہیں کچھ کھانی تولیں۔ بلکہ کھانا گھر جا کر کھائیں گے ابھی آنسکریم۔“ حزرہ نے کہہ کر آنسکریم آرڈر کر دی۔ پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”خزینہ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے جب سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگی ہے اکثر آ جاتی ہے۔ کل بھی آئی تھی۔“ اس نے بتایا تو حزرہ ان نظروں میں کل شام کا مظہر گھوم گیا جب ہی پوچھنے لگا۔

”اور غری، وہ نہیں آئے؟“

”نہیں ان کا تمہیں پتا تو ہے، بس دن میں خزینہ کے پاس جاتے ہیں۔ پھر آفس پھر اپنے گھر.....“

”ہاں..... آں.....“ اس نے ہاں کو لمبا کھینچ کر پوچھا۔ ”خزینہ خوش ہے؟“

”بہت، کسی دن بیلا کو لے کر آؤ ناں پھر ہمیں خزینہ کے ہاں لے چلنا۔“ شہرینہ نے فوراً پروگرام سوچ لیا۔

”بیلا کو لانے کی کیا ضرورت ہے ہم دونوں چلیں گے۔“ حزرہ نے آنسکریم کا چمچ منہ میں ڈال کر کہا تو وہ فوراً بولی۔

”جی نہیں اکیلے تو امی نہیں جانے دیں گی۔“

”اکیلے کیوں، میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔“

”تم تو ابھی بھی میرے ساتھ ہو اور اگر ابھی امی یہاں آ جائیں تو پہلے تم اٹھ کر بھاگو گے۔“ وہ اپنی دھن میں بولی تھی۔ حزرہ کو ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ آنسکریم کے مزے لینے کے ساتھ وہ منے بھی جا رہا تھا۔

”سنو..... میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔“ وہ اسے جیکھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”لطیفوں پر ہنسی کہاں آتی ہے۔“ وہ ابھی بھی محظوظ ہو رہا تھا۔

”بہر حال اب چلو اور آئندہ اتنے دلی غائب مت رہنا۔ ورنہ میں.....“ شہرینہ نے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارنک دی پھر اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔ دوسو سے سے نکل کر جہاں دل لگا ہوا وہاں سب اچھا اچھا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

دوپہ کے کھانے کے بعد وہ پندرہ منٹ کی نیند ضرور لیتا تھا اس کے بعد فریش ہو کر دوبارہ آفس جاتا۔ اس وقت وہ ابھی سو رہا تھا کہ ”آ“ کی آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

”خزینہ۔ خزینہ کہاں ہو؟“ اس نے گھبرا کر پکارا تو ڈیرینک روم سے اس کی آواز آئی۔

”یہاں ہوں۔“ وہ ایک ہی جھست میں اس تک جا پہنچا۔

”یہاں کیا کر رہی ہو؟“

وہ پیکٹ اوپر رکھ رہی تھی۔ ”خزینہ نے الماری کے اوپر اشار کیا تو اس کی گھبراہٹ میں غصہ بھی شامل ہو گیا۔“

”تمہیں کیا ضرورت ہے یہ سب کرنے کی۔ اور یہ تم اسٹول پر مانی گاڑا اگر بلب ہو جاتیں تو.....“

”اوہ وغری! آپ تو یوں پریشان ہو رہے ہیں جیسے میں پہاڑ پر چڑھ گئی تھی۔“

”یہ تمہارے لیے پہاڑ سے کم نہیں ہے۔ چلو ادھر۔“ وہ اسے تھام کر کمرے میں لے آیا اور بیڈ پر بیٹھا کر پوچھنے لگا۔

”تم کراہی تھیں ناں۔“

”نہیں وہ تو بس اسٹول سے اترتے ہوئے۔“ خزینہ اسے اس قدر متوحش دیکھ کر خائف ہو گئی تھی۔

”میرے جیسا“ اور وہ اپنی دھن میں تھی۔ پوچھنے لگی۔
”کیسا ہے وہ پکبل۔“

”مائی گاڈ سارہ پھر تم پوچھو گی اس کے دادا دادی کیسے ہیں۔ یعنی وہ جیسے بھی ہوں، بچہ ہمارے پاس آئے گا ہمارے جیسا ہی ہو جائے گا۔“ وہ اس بالوں کی لٹکھٹکھٹا کر اٹھ کھڑا ہوا اور گلے سے مائی کیٹھ کر نکالی۔
سارہ کو احساس ہوا۔

”سوری نیکی۔ میں نے تم سے کھانے کا تو پوچھا ہی نہیں۔ چلو تم جلدی سے چینیج کرو میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔“

”کیا مطلب تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟“ وہ ڈرینگ روم کی طرف بڑھتے رک گیا۔

”میں نے تو کھالیا ہے تمہارے لیے۔“

”نہیں میں صرف کافی پیوں گا۔۔۔۔۔۔ بلیک کافی۔“

”ابھی لائی۔“ اس نے کھانے کی جرح نہیں کی اور فوراً کمرے سے نکل آئی۔ پھر کافی بناتے ہوئے وہ سارہ کے بارے میں سوچتی رہی اور یہ کہ اس کے لیے اسے کیا کیا لینا ہوگا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ناموں کی فہرست بننے لگی تھی۔

☆☆☆

حزہ کو اندازہ تھا کہ ریکا اس کا کیا حشر کرنے والی ہے۔ اور شاید وہ اس کا یقین بھی نہیں کرے گی کہ وہ حشر وانی کے ہاں تقریب میں شرکت کی غرض سے گیا تھا لیکن اس سے نہیں مل سکا۔ وجہ جو کہ تیور غزنی تھا۔ دیکھتے ہی وہ واپس پلٹ آیا تھا۔ لیکن ریکا کو وہ یہ وجہ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ تیور غزنی سے اس کا ایسا رشتہ بن چکا تھا کہ اب وہ کسی مقام پر اسے خود سے نظریں چراتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اور بہت کچھ سوچ کر اس آگیا تھا۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد ہی ریکا غصے میں بھری اس کے روم میں داخل ہوئی تو اس کے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

”دیکھو۔ پہلے میری بات سن لو۔“

”کیسا؟“ تم یہی کہ سوری میں آنا چاہتا تھا لیکن میری بائیک خراب ہو گئی یا پھر۔“

”یا پھر یہ کہ میں آیا تھا۔ واقعی آیا تھا۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”جھوٹ۔“

”کس کس بات کو جھٹلاؤ گی۔“ وہ جیسے چینیج کر رہا تھا۔

”مطلب۔۔۔۔۔۔“

مطلب یہ کہ تم نے بلیک ٹراؤڈرز پنک شرٹ پہن رکھی تھی جو تمہارے رنگت سے میچ کر رہی تھی اور تمہارا دائیں کلائی میں فقط ایک لیکن تھا یا جوڑی جو اتنی دور سے میں سمجھ نہیں پایا البتہ کلر بلیک تھا اور تمہارے کانوں میں جو ٹائپ تھے وہ بھی بلیک تھے بس یا مزید بیان کروں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تو وہ چبا کر بولی۔
”آئے تھے تو مجھ سے ملے۔ کس نہیں؟“

تمہارے پاس ہی آ رہا تھا کہ گھر سے فون آ گیا اماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ بس پھر میں پریشانی میں وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ جس کا خود مجھے افسوس ہے۔ ورنہ میں بہت خوش تھا کہ تم نے میری

مان لی۔“ وہ بولے چلا جا رہا تھا کہ ریکا نے ٹوک دیا۔

”اچھا بس۔ اب مجھے اپنے گھر کوئی فنکشن کرنا پڑے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ ریکا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

”کیا سوچنے لگے؟“

”ہم وہ اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ سوچ رہا ہوں یہ سب تو تمہارے پرنٹس کو کرنا چاہیے۔ اگر وہ مجھے قبول کرتے ہیں تو۔“

”سنو، شادی مجھے کرنی ہے اپنی پسند اپنی مرضی سے اور میرے پرنٹس کو اگر میری پسند سے اختلاف ہو ابھی تو انہیں اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ اس کی ہٹ دھرمی پر وہ جیسے کوئین کی گولی نکل کر بولا تھا۔

”تو چلو پھر ابھی کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“

”تم۔۔۔۔۔۔ تم بہت شارپ ہو حمزہ، میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔“ وہ تنفر سے بولی تھی۔

”یہی تو نہیں کر رہا۔ خیر چھوڑو۔“ وہ سر جھٹک کر اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کرنے لگا تھا۔ ریکا اس کی

کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ اچانک غالباً اسے آزمانے کی غرض سے کہنے لگی۔

”پتا ہے حمزہ میں نے اپنی فرینڈز سے کہا تھا کہ آج میں انہیں ایک خاص ہندے سے ملواؤں گی۔ اور وہ سب تو جانے کب سے اس انتظار میں تھیں۔ اتنے شوق سے تمہارا انتظار کرنے لگیں کہ کیا بتاؤں۔۔۔۔۔۔ بار بار پوچھتیں کب آئے گا خاص ہندہ۔ میں نے کہا جب بھی آئے گا تم لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان جاؤ گی۔“ حمزہ صرف نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے آپ محفوظ ہوتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔

”پھر پتا ہے کیا ہوا۔ جب میں حسن شیر وانی سے بات کر رہی تھی تو میری تمام فرینڈز نے دھاوا بول دیا اور حسن شیر وانی کو مبارک باد دینے لگیں۔ اب پتا نہیں وہ بے چارہ کیا سمجھا میں بہر حال وہاں سے بھاگ گئی تھی۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”پھر تم نے اپنی فرینڈز کی غلط فہمی دور نہیں کی؟“ حمزہ نے قدرے رک کر پوچھا تو وہ اسی محفوظ انداز میں بولی۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں انہیں سربراہ دوں گی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ حمزہ ذرا سا مسکرایا پھر اچانک خیال آنے پر کہنے لگا۔

”میں نے شاید وہاں غزنی انٹر پرائز کے اوپر کو بھی دیکھا تھا کیا نام ہے بھلا ان کا؟“

”تیور۔۔۔۔۔۔ تیور غزنی، ہاں وہ بھی تھے اپنی سسر کے ساتھ۔ ٹاکس پل ہے ناں۔“ ریکا نے بتا کر اس کی تائید چاہی تو وہ ذرا سا سر ہلا کر رہ گیا جبکہ اس کا ذہن پھر منتشر ہو گیا تھا۔

”اچھا سنو۔۔۔۔۔۔ شام میں آؤ تنگ پر چلو گے۔“

”سوری۔ آج نہیں۔ پھر کسی دن، اب پلیز مجھے کام کرنے دو۔“ حمزہ نے معذرت کے ساتھ کہا۔ تو وہ مسکرا کر اڑکے، کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔

حمزہ نے اپنے سامنے رکھی فائل کھول لی لیکن اس کا ذہن بار بار بھٹک رہا تھا۔ کبھی تیور غزنی اور اس کی سسر پر خیرینہ کو سوچنے لگتا کہ اگر خیرینہ نے اپنے خوشی سے تیور غزنی کی دوسری بیوی بننا منظور کیا تھا تب تو کوئی بات نہیں تھی دوسری صورت میں یہ سراسر اس کے ساتھ دھوکا تھا۔ اور وہ خیرینہ کے ساتھ دھوکا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

خزینہ نے نجمہ خالہ سے اون سلائیوں منگوائی تھیں اور اب ان ہی سے سوئٹر بننا سیکھ رہی تھی۔ گوکہ بچے کے لیے کتنے اون سوٹ خرید چکی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے شوق چراتا تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے کام اسے انوکھی خوشی سے ہلکانا کرتے تھے۔

”بازاری چیزیں دیکھنے میں تو اچھی ہوتی ہیں پر پائیدار نہیں ہوتیں۔ پہلی دھلائی میں ہی ستیاناس ہو جاتا ہے۔“ نجمہ خالہ سلائی میں پھندے ڈالتے ہوئے بول رہی تھیں۔ ”میری بہو بڑے شوق سے بازاری چیزیں اٹھا لاتی ہے۔ پھر بیٹھی دکا نداریوں کو کوستی ہے۔ پیسہ الگ برباد۔“

”تو خالہ آپ نے اسے نہیں سکھایا۔“ اس نے خالہ کے چلتے ہاتھوں پر دھیان رکھ کر یونہی پوچھ لیا۔
”لو میں تو بہت کہتی رہی پر وہ سنتی نہیں۔ یوں بھی بیٹا ساری بات شوق کی ہوتی ہے۔ اب دیکھو ہمیں تو کوئی کی نہیں لیکن شوق ہے اور تم جلدی سیکھ لوگی۔“

”جی؟“ وہ خوش ہو گئی۔ ”لایئے اب میں بناتی ہوں۔“
”ہاں لو۔ کوئی پھندا گرانامت۔“ نجمہ خالہ نے سلائیوں اسے پکڑائیں پھر اس کے ہاتھ پکڑ کر بتانے لگیں تو ایک سلائی میں ہی وہ سمجھ گئی۔

”اب میں بن لوں گی خالہ۔ آپ دیکھتی جائیں۔“
”پریشی لکھی ہوتاں جب ہی جلدی سمجھ گئیں۔“ نجمہ خالہ نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔
”تمہیں خالہ دیہاتی لڑکیاں جو پریشی لکھی نہیں ہوتیں ان کی بنائی سلائی، کڑھائی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”ہاں وہ تو بچپن سے یہی کام کرتی ہیں۔ پر بے چاروں کو اتنی اجرت نہیں ملتی۔ سارا منافع تو یہ شہری لوگ لے جاتے ہیں۔“ نجمہ خالہ ابھی مزید کچھ کہتیں کہ ڈورنیل بیٹے سے وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی۔
”کون آیا ہے۔“ نجمہ خالہ اٹھ کر دروازے پر گئیں تو حزرہ کی آواز سن کر اس نے جلدی سے اون سلائیوں

شاہر میں رکھ کر دوپٹا پھیلا کر اوڑھ لیا۔
”السلام علیکم..... حزرہ سے پہلے شہرینہ اور بیلا آگے آئی تھیں۔“
”وعلیکم السلام..... وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں سے گلے کر حزرہ کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”بڑے دنوں سے شہرینہ کہہ رہی تھی تمہارے ہاں لے چلوں آج آفس سے جلدی آ گیا تو آنے کا پروگرام بن گیا۔“
”اچھا کیا..... بیٹھو امی اور چچی جان کو بھی لے آتے۔“ اس نے کہا تو شہرینہ بول پڑی۔
”ہاں وہ تو جیسے آ جاتیں۔ ہمیں اتنی مشکل سے اجازت ملی ہے۔“

”کیوں؟“ وہ شہرینہ کو دیکھنے لگی۔
”بس امی کہتی ہیں خزینہ آ تو جانی ہے پھر تمہیں کیا ضرورت ہے جانے کی۔“
”یا اللہ لڑکیوں کو موقع ملنا چاہیے شکایات کا۔“ حزرہ گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔
”میں شکایت نہیں کر رہی جو امی نے کہا وہی بتا رہی ہوں اور تمہارے سامنے ہی تو امی نے کہا تھا۔“

”اچھا بس اب تم دونوں لڑنا مت شروع کر دو۔“ خزینہ نے دونوں کو ٹوکا پھر بیلا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔
”تم کیسی ہو بیلا اور چچی جان؟“

”نیکھ ہر امی بہت یاد کرتی ہیں آپ کو.....“ بیلا اس حیکتے دیکتے گھر میں پہلی بار آئی تھی۔ اس لیے کچھ

ریکا آفس سے لوٹی تو آگے حسن شیروانی اپنے پیرنس کے ساتھ موجود تھا جیسے دیکھتے ہی اس کی نظروں میں اپنی سہیلیوں کا اس پر دھاوا بولنے کا منظر کھوم گیا تو بے ساختہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔ اس کے ساتھ وہ کھڑے کھڑے اس پمپلی کے ساتھ بلبوہائے کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔

پہلے میسرور کو سینڈل کی قید سے آزاد کیا پھر واش روم کی طرف بڑھ رہی تھی کہ شمرہ کو آتے دیکھ کر رک گئی۔
”رانی جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ۔ حسن ہماری باتوں سے بور ہو گیا ہے۔“ شمرہ نے آتے ہی کہا تو وہ کچھ نا سبھی سے دیکھنے لگی تھی۔

”بیٹا تمہارے ڈیڈی پر پتا نہیں کب آئیں گے۔ جب تک تم حسن کو کمپنی دے سکتی ہو۔“
”آپ چلیں میں آئی ہوں۔“ وہ کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی اور تقریباً دس منٹ بعد وہ حسن شیرازی کو وہاں سے اٹھا کر اس کے ساتھ لان میں آگئی تھی۔

موسم پچھلے کی دنوں سے خوش گوار چل رہا تھا اور ابھی تو بادل بھی اٹھا کر آ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بارش جم کے برے گی۔ ہوا میں ہلکی سی محسوس ہو رہی تھی۔
”آپ نے کیا خود کو آفس کے لیے ہی وقف کر دیا ہے؟“ حسن شیروانی نے اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے پوچھا۔

”فی الحال تو ایسا ہی ہے۔“ ریکا نے ذرا سے کندھے اچکائے تھے۔
”اور آئندہ..... آئندہ کا کیا پروگرام ہے۔ آئی مین شادی؟“ حسن شیروانی نے لمبی تمہید نہیں باندھی تھی۔
وہ آیا ہی اسی مقصد سے تھا۔

”شادی بھی ہو جائے گی۔“ وہ ہنوز بے نیاز تھی۔
”ہو جائے گی.....؟“ حسن شیروانی رک کر اسے دیکھنے لگا۔
”یعنی جب اللہ کو منظور ہوگا۔“ اس کی وضاحت پر حسن شیروانی مطمئن نہیں ہوا۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے لیکن ہم اپنے طور پر بھی تو کچھ سوچتے ہیں اور میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کیا سوچا ہے؟“
”کچھ نہیں ابھی تک تو میں نے کچھ نہیں سوچا۔“ وہ کندھے اچکاتی حسن شیروانی کے دل میں اتر رہی تھی۔

”تو اب سوچ لیں۔ اسپتالی میرے بارے میں۔“ میں آپ کو پر پوز کر رہا ہوں..... دل سے۔“ حسن شیروانی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ بولڈ لڑکی قدرے نروس ہو کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔ سوچیں گی ناں؟ محبت بھرا اصرار تھا۔

ریکا نے بے دھیانی میں پھر اس پر نظریں جمادیں۔ غالباً ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ حسن شیروانی اس کی بے دھیانی نوٹس کرنا حسان صاحب کی گاڑی کے ہارن سے دونوں چونک کر ادھر متوجہ ہو گئے۔

”ڈیڈی آ گئے۔ آئیے اندر چلیں۔“ ریکا نے کہنے کے ساتھ قدم بڑھا دیے تو حسن شیروانی نے پہلے آسمان پر نظر ڈالی پھر اس کی تقلید کی تھی۔
اندرا کر وہ ریکی نہیں سیدھی اسے کمرے میں آگئی اور بیڈ پر اوندھے منہ گرتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔

”حسن شیروانی تو سیریس ہی ہو گیا۔“ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے سوچنے لگی تھی۔ سر جھٹکتی لیکن پھر سوچ کا سراو ہیں سے جڑ جاتا اور پھر غیر ارادی طور پر وہ اس کا موازنہ حزرہ سے کرنے لگی تھی۔

سراسیمہ سی تھی۔
”میں آؤں گی کسی دن۔ میرا بھی بہت دل چاہتا ہے۔ سچی جان سے ملنے کو۔“

”پورے دن کے لیے آئیے گا۔“
”اچھی بات ہے۔“ اس نے بیلا کے گال پر پیار سے چٹکی کاٹی پھر حمزہ کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔
”ہاں بھئی کیا موڈ ہے۔ ٹھنڈا یا گرم۔“

”میں صرف چائے پیوں گا اور ان دونوں کے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ حمزہ نے کہتے ہوئے شرارت سے شہرینہ کو دیکھا تو وہ اسے منہ چڑا کر بولی۔
”جی نہیں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ بیلا تمہیں گھر دکھادیں۔“ بیلا نے حمزہ کو دیکھا اور اس کے اشارے پر شہرینہ کے ساتھ اٹھ گئی۔

”اور سناؤ..... غزنی کیسے ہیں۔“ حمزہ نے آرام دہ انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔
”ٹھیک ہیں۔ تم لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی گئے ہیں۔ بلکہ میں نے زبردستی بھیجا تھا۔“ وہ ہنسی

تھی۔
”کیوں.....؟“

”بس جتنی دیر رہتے ہیں سر پہ سوار رہتے ہیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو، ایسے مت اٹھو، ایسے مت چلو میں تنگ آ جاتی ہوں۔“
”ارے، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے، اتنا خیال کرتے ہیں تمہارا..... کوئی اور ہوتی تو خود پر رشک کرتی۔“ حمزہ نے قصداً کوئی اور کہہ کر اس کے تاثرات دیکھنے چاہے تھے۔

”رشک تو میں بھی خود پر کرتی ہوں حمزہ۔ بس کسی کسی وقت طبیعت اکتا جاتی ہے۔ خیر تم سناؤ جواب کیسی جا رہی ہے تمہاری۔“

”غزینہ نارمل بات کر رہی تھی۔ حمزہ نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور یونہی ادھر ادھر کی باتوں کے دوران چائے پی پھر بیلا کو پکار کر گلے کا کہا تو غزینہ ناراض ہونے لگی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ کیا صرف چائے پینے آئے تھے۔ آرام سے بیٹھو رات کا کھانا کھا کر جانا اور شہرینہ تم رک جاؤ تا میرے پاس۔“ اس نے اچانک شہرینہ کو مخاطب کر کے کہنے کا کہا تو وہ فوراً بولی۔
”نہیں بھئی امی اکیلی ہوں گی۔“

”ہاں تو امی کو ابھی سے اکیلے رہنے کی پریکٹس کر لینی چاہیے۔ میں بات کرتی ہوں امی سے۔“ غزینہ نے اس کی ایک نہیں سنی اور سیل فون کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے اٹھ کر بیڈروم میں آ گئی۔ سیل فون وہیں موجود تھا۔ اس نے حمیدہ بیگم کو کال ملائی اور ریسور ہوتے پر پہلے ان کا حال احوال پوچھا پھر کہنے لگی۔
”امی اگر آپ کو براہم نہ ہو تو شہرینہ میرے پاس رہ جائے۔ نہیں میں اپنی وجہ سے کہہ رہی ہوں طبیعت کچھ

بوجھل سی ہے۔ جی..... پھر میں دو تین دن میں خود اسے چھوڑ جاؤں گی۔“
”چلیں یہ ٹھیک ہے آپ دو دن عالیہ خالہ کے پاس رہ آئیں ان کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے امی پھر میں شہرینہ کے ساتھ آؤں گی۔ اللہ حافظ۔ وہ فون رکھ کر واپس آئی تو شہرینہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔
”امی نے اجازت دے دی ہے۔“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ امی دو دن کے لیے عالیہ خالہ کے ہاں جا رہی ہیں اور اب تم لوگ آرام سے بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔“ دوسری بات اس نے حمزہ کو دیکھ کر کہی تھی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد حمزہ بیلا کو لے کر چلا گیا تو غزینہ کچھ دیر شہرینہ کے ساتھ ٹیس پر ٹہلتی رہی۔ ڈاکٹری ہدایات کے مطابق اس کے لیے اب واک بہت ضروری تھی۔

”غزنی امی سچ میں عالیہ خالہ کے ہاتھ جائیں گی۔“ شہرینہ نے اچانک خیال آنے پر پوچھا۔
”ہاں بتا رہی تھیں عالیہ خالہ نے شرجیل کے لیے کوئی لڑکی دیکھی ہے اور وہ امی کو بھی دکھانا چاہ رہی ہیں۔“ غزینہ نے بتایا تو شہرینہ اچھل پڑی۔

”کیا شرجیل بھائی شادی کے لیے مان گئے۔“
”کیوں اس نے کیا شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔“ وہ رک کر شہرینہ کو دیکھنے لگی۔

”نہیں قسم تو نہیں کھائی تھی۔ لیکن مجھے لگتا تھا کہ وہ کم از کم دس سال تو ضرور تمہاری بے وفائی کا غم مناتے رہیں گے۔“ شہرینہ بنجیدہ نہیں تھی جب ہی وہ بھی ہنس کر بولی تھی۔

”سٹاپ میں نے اسے کوئی آس نہیں دلائی تھی۔“
”لیکن غزنی، وہ تو تمہیں پسند کرتے تھے ناں اور بتا ہے جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے وہ ہمارے گھر کا راستہ

ہی بھول گئے ہیں اس کا مطلب ہے وہ صرف تمہارے لیے آتے تھے۔“ اس نے شہرینہ کی بات سکران سنی کر دی۔ پھر بھی وہ بولے لگی۔

”ویسے غزنی تم نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ گو کہ اس وقت مجھے افسوس ہوتا تھا کہ تم شرجیل بھائی کی محبت کو سمجھ نہیں رہیں۔ لیکن اب دیکھتی ہوں غزنی بھائی تمہیں ان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ پھر جو آسائش تمہیں یہاں میسر ہیں وہ

شرجیل بھائی تو نہیں دے سکتے تھے۔ ہیں ناں.....“ آخر میں اس کی تائید چاہی تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی تھی۔
”یہ سب نصیب کی باتیں ہیں۔“

”ہاں تمہارے جیسا نصیب اللہ سب کا بنائے۔“
”اچھا اندر چلو میں تمک گئی ہوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔

”تمہارا کیا اب سونے کا پروگرام ہے؟“ بیڈروم میں آتے ہی شہرینہ نے پوچھا۔
”تم کیا جانتی ہو؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”مجھے تو انجمنی نیند نہیں آرہی لیکن میں تمہیں ڈسٹرب بھی نہیں کرنا چاہتی۔“
”تو ایسا کر دلاؤ نج میں چلی جاؤ۔ ٹی دی دیکھو یا حمزہ کے ساتھ چینگ کرو۔“ اس نے بڑے آرام سے کہہ کر

اسے ہی ان کر دیا۔
”دونوں کام کر لوں گی۔“ شہرینہ ہنستے ہوئے بیڈروم سے نکل گئی تو اس نے لائٹ آف کر دی۔ پھر اسے سونے

میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ ان دنوں وہ بے خبری کی نیند سوتی تھی۔ جب ہی پتا ہی نہیں چلا شہرینہ کب اس کے پاس آ کر سوتی تھی۔

صبح معمول کے مطابق وہ اٹھ گئی۔ اس وقت شہرینہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اسے نہیں اٹھایا اور فریش ہو کر کمرے سے نکل آئی۔ نجمہ خالہ روزانہ کی طرح کچن کو مزید چمکانے میں لگی تھیں۔ اسے دیکھا تو جلدی سے

ناشتا بنا کر میز پر لا رکھا۔ اور اس کے بیٹھنے پر پوچھنے لگیں۔
”تمہاری بہن، ناشتا نہیں کرے گی۔“

”ابھی تو سو رہی ہے خالہ۔ میں نے اٹھایا نہیں۔ چنانچہ رات کب سوئی تھی۔“ وہ سلاٹس پر جام اچھٹے لگائی۔
 ”ہاں رات بہت دیر تک جاگ رہی تھی اور بیٹا اب یہ سو کے تو کس کھانا چھوڑو، پراٹھا نہیں۔“ تو کم از کم کھنکھناتی لگا لیا کرو۔ اس وقت کا کھانا پیا کام آتا ہے۔“ نجمہ خالہ حسب عادت لیکچر دینے سے باز نہیں آئیں۔
 ”اچھا کل سے میرے لیے پراٹھا بنا دیجیے گا۔“ اس نے مزید لیکچر سے بچنے کی خاطر کہا تھا۔
 ”ابھی بنا دیتی ہوں۔“

”خزئی کی بچی، پاگل ہو گئی ہو کیا۔“

”سوری تم تو برامان گئیں۔ خبر یہ بتاؤ کیاں جانے کا پر و گرام بتایا ہے تم دونوں نے۔“ خزینہ نے بمشکل سنجیدہ ہو کر پوچھا۔
 ”کہیں نہیں۔“ وہ ہنوز روکھی ہوئی تھی۔
 ”اچھا ٹھیک ہے پھر میں سوری ہوں۔ جزہ سے کہنا زیادہ دیر نہیں بس گھنٹے دو گھنٹے میں واپس آ جانا۔“ خزینہ نے
 کہہ کر روٹ بدل لی تو وہ اس کے کندھے پر گھونسا مار کر اٹھی تھی۔

سچ کو سنا

وہ بابا سائیں کے ساتھ ان کا سفری سامان اٹھائے بانٹتا ہوا دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے بی حطیم اور ارجمان منتظر کھڑے ملے۔ ان کو دیکھ کر جھٹ سے قریب آئے اور باری باری بابا سے بغل گیر ہوئے۔

”ارے بابا! سامان اٹھاؤ۔ مجھ سے کیا لیٹ رہے ہو۔“ بابا نے حطیم کی پیٹھ پر دوپ ماری تو وہ بلبلا اٹھا۔ ارجمان نے فوراً آگے بڑھ کر حطیم کے ہاتھوں سے بابا کا سفری بیگ لیا۔

”یہ بھی۔“ حطیم نے کندھے سے لٹکتا ایک اور بیگ حطیم کو تھمایا۔

”نادر کہاں ہے؟“ بابا کو ملازم کا دھیان آیا۔

”جی وہ سبزی لینے گیا ہے۔“ ارجمان نے بتایا۔

”بڑا اثر زرا (چھچھورا) چھچھورا ہے۔ اسے سنجال کر پیسے دیا کرو۔“ انہوں نے کہا تو تینوں نے مشتق ہو کر سر ہلایا۔

”جی چھچھورا اور پھو پھو بھی بہت ہی برا کھانا پکاتا ہے۔“ حطیم نے لگے ہاتھوں گنوا یا۔

”تم لوگوں کو ایسا ہی ملازم مل سکتا ہے۔“ بابا نے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”جی میں ارجمان کا فرض نمٹانے یہاں آیا ہوں۔ ندری سے لگ گیا ہے شادی کر لے گا تو تم دونوں بھی سہولت ہو جائے گی۔ بھابھی کے ہاتھ کا پکا کھانا۔“ وہ اطمینان سے بولے تو دونوں نے بے ساختہ ارجمان کو

دیکھا۔ جو کان کی لو کھانے لگا۔

”کوئی اچھا سا کنگ رکھ لیں گے۔“ پھر پست سی آواز میں بولا تو بابا چونک گئے۔

”کیوں بابا۔ باورچی کیوں رکھو گے گھر میں عورت کے ہوتے ہوئے۔“ ان کی آواز سخت تھی ارجمان خاموش ہو گیا۔ ”اچھی بیوی اپنے گھر کو کندھوں پر اٹھا لیتی ہے۔“ بابا اپنی شلوار جھاڑ کر کہنے لگے۔

”کندھوں پر پورا گھر۔“ حطیم نے جھٹ کو بغور دیکھا اور صنف نازک کے کندھوں کا تصور کیا۔

”مخاورا چھچھو پنگے۔“ حطیم نے ٹھوکا دیا۔

”لیس بابا صحن نہیں۔“ ارجمان بچن سے بھرا جگ اور گلاس لے آیا۔

”نصیحتیں بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔“ بابا نے ایک گلاس بی کر واپس کر دیا۔

”کوئی ٹھنڈی لسی بناتے۔ بابا۔“

”جوسر کی بنی کسی آپ کو پسند نہیں۔ ہم کیا کریں۔“ ارجمان نے کندھے اچکائے۔

”بس بابا! میرا خیال تو تمہاری ماں رکھتی تھی۔ تم بچے تو اپنے مزاج کے ہو۔ خیر حطیم بیٹا! میرے چری بیگ سے میرا حقہ تو نکال کر دینا۔“ وہ صوفے پر پیر پھیلا کر لیٹ گئے۔

”بابا اندر چل کر آرام کریں۔“ حطیم نے کہا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”وڑے جتنا تو فلیٹ سے تمہارا۔ اندر کروں میں دم گھٹتا ہے۔ میرا بستر رات کو نہیں لگا دینا۔“ وہ اطمینان سے بولے تو حطیم گھبرا گیا۔

”نن..... نہیں بابا! اندر سوئے گا۔ ادھر تو اسے سی بھی نہیں۔ اندر لگا ہے۔“

”اوہ چھوڑو، اس مصنوعی ٹھنڈ کو۔ ہم کیا جانیں کھلے صحن میں سونے والے۔“ بابا نے ہاتھ جھٹکا۔ حطیم ان کا حقہ لایا۔ پھرتی سے اس کو سیٹ کیا اور چلم تازہ کر لی۔

”حطیم! کھڑکی کھولو کچھ ہوا تو آئے۔“ بابا نے



حقے کی نے منہ میں ڈال کر کہا تو حطیم نے ناچار کھڑکی کھولی۔ چھوٹے سے لاؤنج میں بابا کے حقہ کی گڑگڑاہٹ اور ان کے منہ سے نکلا دھواں فضا میں رقص کرنے لگا۔ حطیم نے کچھ پریشان ہو کر کھڑکی کو دیکھا۔

”حطیم کھڑکی پوری کھولو۔ ذرا ہوا اندر آنے دو۔“ حطیم نے اس کی کیفیت کا لطف لیا تو حطیم نے اسے گھورا۔ اتنے میں نادر کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

”ہو جھالو..... ہو جھالو۔“ وہ انڈیا دھن میں

اگست
 2018

کے شمارے کی
 ایک جگہ

ضرب آہن

خزانے کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے نوجوان کی سرگزشت
 جاوید راہی کے قلم کا جادو

محبت خواب

محبت میں انسان اپنی خواہش محبوب کی خواہش کے
 طالع کر دیتا ہے محبت کا جذر کتنے والوں کے لیے
 ایم اے راحت کا تھن خاص

خیال باطل

قل اور کوہ کی مثال چ کر دیئے والے پروفیسر کی
 بہادری و شجاعت کی داستان

سببین شمشک کے خیالات کی پرواز

کایا پلٹ

ایک ایسے شہر کا قصہ جہاں کی کایا پلٹی تو ایک انہونی
 افتاد آ پڑی اور انسان انسان نہیں رہا

جرمن ادب سے ماخوذ عبد العزیز خان کی ایک پرمختی تحریر

مقید خاک

پراسرار سرزمین سے وابستہ حیرت انگیز واقعات کی بازگشت
 ایک شخص کی آپ بیتی

ضواریہ ساحر کی ایک منفرد کہانی

اس کے علاوہ دیس مدیس کی رومینس، سسٹمز اور تجسس سے
 بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

اگست 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

”صرف ایک منٹ کے لیے اپنی لائٹ بند
 کر کے کھولو اور اپنی محبت کا ثبوت دو۔“ سیل پر
 فرمائشی میسج آیا۔ حطیم نے بے بس ہو کر دور سے
 جھلک دکھائی عروہ کو دیکھا۔

”بابا میں چپک کرتا ہوں کیا مسئلہ ہے۔“ وہ
 اٹھ کر اپنے سوچ بورڈ تک گیا اور ٹیوب لائٹ بند
 کر کے دوبارہ کھولی۔

”گڈ ورک.....“ حوصلہ افزائی کا میسج ان
 باکس میں آمو جود ہوا۔

”یہ تم اپنی لائٹ کیوں چپک کر رہے ہو۔ مسئلہ
 تو ادھر ہے۔“ بابا نے نا جی کے عالم میں حطیم کو
 دیکھا۔

”وہ..... بات دراصل یہ ہے کہ ادھر کا مسئلہ
 ادھر سے حل ہوتا ہے۔“ وہ گڑبڑا کر بولا تو نادر کی ہنسی
 گوئی۔ حطیم نے کچن سے باہر نکلے نادر کو آنکھیں
 دکھائیں۔

”اب دیکھیں، صحیح ہو گیا نا۔“ پھر وہ اطمینان
 سے دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھا تو بابا نے حیرت سے
 سامنے دیکھا۔ جہاں اب لائٹ بالکل ٹھیک طرح
 جل رہی تھی۔

☆☆☆

”بابا آج رومیسہ آپ سے ملنے آرہی ہے۔“
 ارحمان نے انہیں اطلاع دی تو بابا نے حیران ہو کر
 اسے دیکھا۔

”مجھے بچی کے والدین سے ملنا ہے بیٹا!“
 ”بابا اس کے والدین تو امریکا ہوتے ہیں۔“
 دراصل ان کے بیٹے وہیں رہائش پذیر ہیں۔“
 ارحمان نے وضاحت کی۔

”پھر میں رشتہ کدھر لے کر جاؤں گا؟“ بابا نے
 بد مزہ ہو کر پوچھا۔

”رشتہ کیسا؟ ہم دونوں نے شادی طے کر رکھی
 ہے۔ اس کا بھائی پاکستان آئے تو ڈیٹ فکس کر لیں
 گے۔“ ارحمان نے کندھے اچکا کر کہا تو بابا خاموش
 ہو گئے۔

گئی۔
 ”جی! کھڑکی کے بالکل سامنے لگایا ہے۔“ وہ
 حطیم کو دیکھ کر ہنسا۔

”بہت اچھے۔“ بابا نے دھوتی کو ہاتھوں سے
 سمیٹا اور بستر پر بیٹھ گئے۔ ”ادھر آ کر میرے پیر دبا دو
 حطیم!“ پھر بستر پر لیٹ کر کہا تو حطیم بڑی سانس
 کھینچتا ان کے پاس آیا۔

”تم کیوں کھڑے ہو، جاؤ یہاں سے۔“ اس
 نے نادر کو گھر کا تو وہ بد مزہ ہو کر کچن میں چلا گیا۔
 ”جیتے رہو بیٹا! میرا خیال کر کے یہاں بیٹھے
 ہو۔“ بابا نے پیار سے حطیم کو دیکھا۔

”ان کو آپ کا خیال کم کسی اور کا زیادہ ہے۔“
 نادر نے کچن سے سر نکالا تو حطیم نے پاس بڑی چپل
 اٹھالی۔ بابا نے کروٹ بدلی اب ان کا چہرہ کھڑکی کی
 طرف تھا۔ جدید طرز کی قد آدم کھڑکی کے کھلے
 سلاخوں سے دو فٹ کے فاصلے پر ایک اور فلیٹ کی
 کھڑکی نظر آرہی تھی۔ بابا نے بغور دیکھا تو چونک
 سے گئے۔

”حطیم..... پڑوس کے فلیٹ کی بجلی کیوں جھلکے
 کھا رہی ہے۔“ انہوں نے فکر مندی سے حطیم کو متوجہ کیا تو
 اس نے دوسری طرف کی لائٹ جلتے بجتے دیکھی اور
 سر پیٹ لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے۔ میرے بابا ساتھ بیٹھے
 ہیں۔“ حطیم نے تیزی سے تاج ٹاپ کر کے سینڈ
 کیا۔

”لائٹ کا جواب لائٹ سے چاہیے۔“ سب سے
 نہیں۔“ فوراً رپلائی آیا۔ حطیم نے غصے والا ایجو جی
 سینڈ کر دیا۔ جواباً شیطانی شکل والا ایجو جی چلا آیا۔
 ”ان کی لائٹ کو ہوا کیا ہے کچھ پتا تو کرو۔ آخر
 پڑوسی ہیں۔“ بابا ہنوز فکر مند تھے۔

”جج..... جی..... وہ ان کی لائٹ میں یہی
 مسئلہ ہے جلتی بجھتی رہتی ہے۔ آپ توجہ نہ دیں۔“ وہ
 ان کے پیر تیز تیز دبا تے کھبرا کر بولا۔
 ”ہیں..... اس کیوں؟“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

شار اٹھائے گنگنا تا آ رہا تھا کہ سامنے بابا کو دیکھ کر شہ
 گم ہو گئی۔ ”سلام بابا سائیں!“ وہ فوراً نزدیک آیا۔
 بابا نے سر پر ہاتھ رکھا۔

”وعلیکم السلام۔ خوش ہو۔“
 ”جی بابا سائیں!“
 ”ہاں ہماری خوشیاں برباد کر کے بہت خوش
 ہے۔“ حطیم جل کر بڑبڑایا۔

”کیوں بھی میرے بیٹوں کو تنگ کر رکھا ہے؟
 کھانا صحیح کیوں نہیں پکاتے۔“ بابا نے آنکھیں
 دکھائیں تو نادر سر کھجانے لگا۔

”بابا میں تو اے دن کھانا پکاتا ہوں۔ بھائی
 لوگوں کو پتا نہیں کیوں پسند نہیں آتا۔“ وہ معصوم شکل
 بنا کر بولا۔

”اچھا پکا کر دینے! میں گاؤں سے سچا گھی لایا
 ہوں اب اسے ڈال کر کھانا پکاتا۔“ بابا کے کہتے ہی
 نادر اچھل پڑا۔

”ارے واہ۔ اب مزا آئے گا۔“ وہ چٹخارہ
 لے کر بابا کے بیک کی طرف دوڑا۔

”بابا! کیوں لائے اصلی گھی۔ اب یہ پگلا ہمیں
 بھر بھر کر کھلائے گا۔“ حطیم نے ناپسندیدہ نظر نادر پر
 ڈالی جو گھی کا ڈبا بیک سے نکال رہا تھا۔

”خالص چیز جتنی کھاؤ گے اتنی صحت بنے گی۔
 شہر آ کر تینوں لڑکے چھو ہارے بن گئے ہو۔“ بابا کی
 مثال پر تینوں نے احتجاجاً انہیں دیکھا۔ مگر وہ بے
 نیازی سے حقہ گڑ گڑاتے رہے۔

☆☆☆

رات کو بابا کا بستر لاؤنج میں لگے نادر کی ہنسی
 بے قابو تھی۔ بابا نے رات کے کھانے کی بہت
 تعریف کی تھی۔ انہوں نے اس کو دو سو روپے انعام
 بھی دیا جبکہ تینوں لڑکوں کے منہ اترے ہوئے تھے۔
 ارحمان تو ذرا سا کھانا کچھ کر میز سے اٹھ گیا۔ حطیم اور
 حاطب بھی مارے باندھے کھاتے رہے تھے۔

”نادر بیٹا! میرا بستر لگا دیا۔“ بابا دھوتی پہنے
 لاؤنج میں داخل ہو کر بولے تو حطیم کی جان پر بن

”جب تم دونوں خود طے کر چکے ہو تو میرا یہاں کیا کام۔ میں کل گاؤں واپس جا رہا ہوں۔“ بابا نروٹھے پن سے بولے تو ارجمان مسکرایا۔
”اے کیسے جانے دوں آپ کو۔ آپ تو میرے بابا چھی ہیں اور ماں بھی۔“ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بولا تو بابا ابدیدہ ہوئے۔
”آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو وہی ان باتوں کو کہتی۔“
”بابا پلیز! آپ رنجیدہ نہ ہوں۔“ ارجمان ان کے گلے لگا گیا۔
”بس بیٹا جیسی رب کی مرضی۔“ وہ سنبھل کر رومال سے چہرہ صاف کرنے لگے۔

☆☆☆
”یو آرسوسٹ بابا۔“ رومیصہ نے ان کے ہاتھ سے گاؤں کی جگہ (کڑھائی) والی قمیص لیتے خوشی کا اظہار کیا۔ وہ انتہائی ماڈرن لڑکی جس کا لباس بھی مغربی تھا ان کے ساتھ پچھلے آدھے گھنٹے سے خوب باتیں بگھا رہی تھی۔ وہ اس بہت بڑی لکھی لڑکی کی باتوں سے نہ بور ہو رہے تھے نہ ہی خوش۔
”اس سے تو بہتر میری موی (بیٹی) ہے۔“ کتنی سادی بھولی بھالی لیکن ان لڑکوں کو کون سمجھائے جو گٹ پٹ انگریزی بولتی ماڈرن لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔

”نادر اونا نادر! میرا حق تو لے آ۔“ آخر وہ حق منگوا بیٹھے۔ حالانکہ ارجمان نے رومیصہ کے سامنے حق پینے سے منع کر رکھا تھا۔
”جی لایا۔“ نادر فوراً حق لے آیا۔
”شاباش بیچے۔“ بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
”یہ دیسی شیشہ ہے۔“ رومیصہ نے بغور دیکھ کر پوچھا۔

”شیشہ! ارے نہیں بیٹا! اس میں شکل کہاں دکھتی ہے۔“ بابا نے سادگی سے کہا تو حاطب کی ہنسی نکل گئی۔ اتنے میں ارجمان لاؤنج میں آیا تو سامنے کا

منظر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ نادر کان دبا کر بھاگا اور جا کر بابا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔
ارجمان بہ مشکل اپنے تاثرات نارمل کرتا ان کے قریب گیا۔
”ارجی! انکل کتنے سہیل ہیں۔ اتنے بڑے لینڈ لارڈ تو فیل ہی نہیں ہوتے۔“ رومیصہ ارجمان کو دیکھ کر اٹھلائی۔
”بڑا! لینڈ لارڈ! کا کیا مطلب؟“ بابا نے چونک کر رومیصہ کو دیکھا۔

”آئی مین..... ارجی نے بتایا۔ ادھر گاؤں میں آپ کی ہزاروں ایکڑ زمینیں ہیں تو میرے ذہن میں آپ کا کچھ اور تصور بناتا تھا۔ بڑی موچھیں، بڑی سی گڑی اور غصہ ور..... بابا۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسی۔ بابا نے ارجمان کو گھورا جس نے نظریں چرا لیں۔

”رومیصہ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں کافی دیر ہو گئی۔“ وہ فوراً بولا تو رومیصہ کھڑی ہو گئی۔
”اوکے بابا! ٹکس ٹو میٹ یو۔“ وہ خوش دلی سے بولی تو بابا نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئے اور پیچھے بابا گہری سوچ میں پڑ گئے۔

☆☆☆
”السلام علیک بابا! وہ نادر کے ساتھ ٹی وی پر ڈرامہ دیکھ رہے تھے کہ ٹیلی ویژن پر متوجہ ہوئے۔ سامنے ایک من موٹی لڑکی کھڑی تھی۔
”ولیکم السلام!“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے جو نادر کو ایک ڈونگا تھا رہی تھی۔

”آپ کیسے ہیں بابا؟ میں پڑوس سے آئی ہوں۔ وہ سامنے والا فلیٹ ہمارا ہے۔“ لڑکی نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔
”آپ کا نام کیا ہے بیٹی۔“
”عروہ نام ہے بابا!“ اس کی آواز بہت خوش نما تھی۔ شلوار قمیص پر سلیٹ سے دو پاؤں اڑھے عروہ ان کو اچھی لگی۔

”پڑھتی ہو؟“
”جی انٹر کر رہی ہوں۔“ وہ متلاشی نظریں گھمانے لگی۔
”بابا! یہ آپ کا.....“ حطیم کسی کام سے ادھر آیا تو عروہ کو دیکھ کر ساکت ہوا۔

”یہ سامنے سے آئی ہیں بیٹا۔“ کھڑکی کے اس طرف سے۔“ بابا نے ”کھڑکی“ پر زور دے کر کہا تو حطیم چونک گیا۔

”تو کیا بابا اس کا کھڑکی کے آس پاس منڈلاتا محسوس کر گئے تھے؟“ وہ کچھ جھینپ کر نزدیک آیا۔
”ہم نے آج کڑھی بیٹائی تو آپ کے لیے لے آئی۔“ وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔ ”جب ہمارے گھر میں کچھ اچھا کھا ہو بابا! اسی یہاں ضرور بھیجتی ہیں۔“ ہنسی میں بے چارے لڑکوں کی نہ ماں ہے نہ بہن۔ کون کچھ کر کھلاتا ہوگا۔“ وہ مزید بولتی رہی۔ حطیم نے اسے گھورا۔

”بہت شکر یہ بیٹے! آپ لوگ اتنا خیال رکھتے ہو۔ ویسے ایک لڑکا رکھا ہے۔ ان کو پکا کر دیتا ہے۔“
”کون نادر! اس کو تو صرف دماغ پکانا آتا ہے۔“ وہ کھلکھلائی۔

”آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں بیٹا۔“
”بہت کچھ بابا! میں یہ جانتی ہوں کہ جب یہ تینوں چھوٹے سے تھے جب ان کی ڈنڈھ ہوئی۔ آپ نے ہی اپنے بیٹوں کو ماں با۔ بن کر پالا اور اتنی زمینوں کے ہوتے ہوئے اس کی سادگی سے پرورش کی۔ ان کو پڑھا لکھا کر اپنے زور بازو پر کمانے کے لیے شہر بھیجا اور.....“ عروہ کی زبان نان اسٹاپ چل رہی تھی اور بابا بالکل سن ہو کر اسے سن رہے تھے۔

”عروہ! باہر آپ کا چھوٹا بھائی آیا ہے۔“ حطیم نے گھبرا کر کہا۔
”وہ کس لیے آیا ہے؟“ عروہ بد مزاج ہوئی۔
”اچھا بابا! میں چلتی ہوں۔“
”جلدی جائیں عروہ!“ حطیم نے دانت پیس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مفت	قیمت
شہول کھانا	شہول کھانا	500/-
نچوانا	نچوانا	250/-
میر	فرحت ایشیائی	400/-
میں دے آؤ	فرحت ایشیائی	250/-
جس جہاں ہے	فرحت ایشیائی	500/-
دل دہلیس	فرحت ایشیائی	350/-
ہنسی کا ایک	فرحت ایشیائی	300/-
وہ ملی ملی دہلیس	آپ بے ترقی	400/-
آؤ گھر آئی	آپ بے ترقی	400/-
ایک سید اور بہت	میر	200/-
لا مائل	میر	180/-
اسرقل	میر	450/-
اک دیوانے راکا	بابا	300/-
۵ چٹوہاں سے کڑکے	بابا	120/-
میرے خواب بزرگ	بابا	300/-
موسم کا پتلا	فرحت ایشیائی	300/-
دل سے اصرار ہے	آپ بے ترقی	300/-
زکریا کی دوستی	رعنا شہزاد	500/-
میرے اس کے قطر	زہرا	180/-
کھانا کھانے کا	قادر	180/-
میری جھ	زہرا	250/-
بہن	فرحت ایشیائی	150/-
اسے حق کہاں ہے	راحت	350/-
ٹام آؤ	ایک سلاٹر	300/-
رنگ خوشیوں ہوا	نکس لڑکی	400/-
آنکھیں کاغذ	قادر	400/-
یاد آئی	میر	300/-
میرے خواب بزرگ	کھانا	400/-

ناول نگار کے لیے 50 روپے کا نسخہ - 30 روپے
کچھ عروہ اور نجسٹ 30 روپے کا نسخہ - 30 روپے
فون نمبر: 32216362

کر کہا۔

”جاری ہوں تا۔“ عروہ پیر پختی باہر نکل گئی۔ بابا کی گھوڑیاں حطیم کو بھی وہاں سے نو دو گیارہ ہونے پر مجبور کر گئیں۔

☆☆☆

”حطیم! یہ لڑکی عروہ تمہیں پسند ہے؟“ رات کو پیردہاٹے حطیم کے ہاتھ بابا کی بات پر رک گئے۔

”جی بابا! میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے اختیار بولا۔ ”دراصل میں جس فارما پہنٹی میں انٹرن شپ کر رہا ہوں وہیں سے جاب کی آفر آگئی ہے تو سوچا ہے جاب ملے ہی گھر بسالوں۔ ویسے بھی ارجمان بھائی شادی کے بعد بھابھی کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے اور پھر چند سالوں بعد امریکا۔“ حطیم آج انکشافات کر رہا تھا۔ بابا چپ سے ہو گئے۔

”اچھی بات ہے۔ سب کو اپنا مستقبل سنوارنے کا حق ہے۔ تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کل ہی اس بچی کا ہاتھ تمہارے لیے مانگنے جاؤں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”کل.....“ حطیم حیران ہوا۔

”نیک کام میں دیری کیسی؟ ویسے بھی پرسوں مجھے گاؤں جانا ہے۔“

”آپ پرسوں جارہے ہیں۔“ حطیم رکھا سا ہوا۔

”ہاں بہت رہ لیا۔ خیر کل شام کو چلیں گے عروہ کی طرف۔“ انہوں نے حتیٰ لچے میں کہہ کر کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

عروہ کے والدین سے مل کر ان کو حقیقتاً خوش ہوئی۔ بہت پر خلوص لوگ تھے۔ ان کے لیے حطیم کا رشتہ آنا حیران کن نہیں تھا۔ لڑکا لڑکی کی پسند سے وہ واقف تھے۔ ان کی دوسری بیٹیاں تھیں تو حطیم ان کا بیٹا بن کر اندر باہر کے کئی کام کر دیا کرتا تھا۔ بابا نے عروہ کی والدہ کی زبانی بہت کچھ جان لیا اور اپنے بیٹے کی ادکاری پر دل میں داد دی جو پڑوسیوں سے گہرا تعلق

چھپا رہا تھا۔ انہوں نے عروہ کو گلن کے پیسے دیے۔ ”آپ لوگ اس بڑی عید پر ہمارے گاؤں ضرور آئیے گا۔ میرے بیٹے بھی وہیں ہوں گے۔ آپ ہمارے خاندان سے مل کر خوش محسوس کریں گے۔“ آتے وقت انہوں نے عروہ کے والدین کو دعوت دی جس کو انہوں نے گرم جوشی سے قبول کیا۔ حطیم کا چہرہ اتر گیا۔ وہ بابا کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے دن ان کی رومیصہ کے بھائی سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے عید الاضحیٰ پر اپنی آمد کا عندیہ دیا۔ بابا نے اس کو بھی گاؤں آنے کو کہہ دیا۔ ارجمان بوکھلا گیا لیکن وہ دعوت دے چکے تھے۔ اب دونوں بھائی سرچڑک کر بیٹھے تھے اور بابا مزے سے اپنا سامان پیک کر کے گاؤں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ ”اللہ کی امان میں بابا!“ کچھ بھی تھا دونوں کو باپ سے محبت بہت تھی سو انہیں انکسین تک چھوڑنے آئے تھے۔

☆☆☆

اور آج عید الاضحیٰ کا دن تھا۔ فجر کے بعد دھوپ کی کرنیں جب کھلے محن میں استراحت فرماتے شہری لڑکوں کی بند آنکھوں میں چھپنے لگی تو چار پائیوں پر ان کے وجود کسمانے لگے۔ ساتھ ہی مرغ کی زوردار آواز نے کانوں میں گھس کر ان کو بستر چھوڑنے پر مجبور کیا۔

”اف ہوا! کیا مسئلہ ہے۔ ٹھیک سے سونے بھی نہیں دیتے۔ رات میں پچھرون میں یہ مرغ!“ ارجمان بے زاری سے جسم کھجاتا بولا۔

”بابا ان بکروں کو تو کہیں اور باندھتے۔ ساری رات میرے سر ہانے میں میں“ کر کے سر کھا گئے۔ ”حطیم نے تکیہ شیخ کردہائی دی۔ حاطب البتہ اوندھے منہ چار پائی پر مزے سے پڑا تھا۔

”آج عید کا دن ہے۔ نہادھو کر اللہ کا نام لو۔ پھر قربانی کرنی ہے۔“ بابا نے بکروں کے آگے چار ڈالتے ان تینوں کو گھر کا جو بنیان اور شلوار۔ ملبوس جمائیاں روک رہے تھے۔

”لینڈلارڈ باپ کے خرچے بیٹوں! جلدی اٹھو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے تو ارجمان اور حطیم نے ان سے نظریں چرا لیں۔ پھر تینوں فریٹش ہو کر بابا کے ساتھ نماز پڑھ آئے تو قربانی کے تین صحت مند بکرے اور ایک گائے کو گھوانے اور بٹانے میں ہی پورا دن نکل گیا۔ ذرا فرصت ملے ہی یہ اپنے اپنے موہاں کان سے لگائے گھر سے بھاگ نکلے کہ گھر میں تو سارا خاندان اٹھ آیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کے وقت رومیصہ اور اس کا بھائی اور عروہ کے والدین گاؤں آئے تو ارجمان اور حطیم کو وہ جگہ نہیں مل رہی تھی جہاں ان کو بٹھائیں۔ دونوں لڑکے انتہائی بوکھلاہٹ کا شکار تھے حالانکہ اچھا خاصا کشادہ گھر تھا مگر ان کے بتائے گئے حویلی نایاب گھر کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ بابا کے ساتھ تایا اور چاچا نے بھی شہری مہمانوں کی بڑھ چڑھ کر مہارت کی۔ خاندان کی عورتوں نے رومیصہ اور عروہ کی والدہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ذائقہ دار کھانوں سے ان کی تواضع کی گئی۔ میزبان، مہمانوں کے آگے بچھے جارہے تھے۔ یہی ان کی روایت تھی، یہی ان کا طریقہ تھا کہ مہمان کو آنکھوں پر رکھتے تھے۔

”مجھے آپ لوگوں سے کچھ کہنا ہے۔“ خوش گوار ماحول میں باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ بابا نے گلا کھکا کر کہا تو سب ہمہ تن گوش ہوئے۔

”میں بہت بڑا جاگیردار نہیں ہوں۔ چھوٹا سا زمین دار آدمی ہوں۔ عزت سے گزارا ہو رہا ہے۔ رب کا کرم ہے۔ میری کل جاگیر میرے بیٹے ہیں۔ ان کی ماں بہت بچپن میں ان کو چھوڑ گئی تھی میں ان کی ماں بھی بن گیا اور باپ بھی۔“ وہ ذرا خاموش ہوئے۔ ”کسی قیمتی متاع کی طرح میں نے ان کی پرورش خالص اور بناوٹ سے پاک ماحول میں کی۔ ان کو ہمیشہ سچ کہنا اور سننا سکھایا۔ ان کو باشعور اور خواندہ بنانے کے لیے ہر سال اپنی زمین کا ایک ٹکڑا بیچا۔ بدلے میں انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ تعلیمی اور اخلاقی لحاظ سے اچھے رہے۔ پانچ سال ہو گئے

ان کو شہر گئے۔ میرا چڑھایا سچ کا رنگ کب اترایا کب انہوں نے خود پر جھوٹ کا ملمع چڑھالیا پتا ہی چلا۔“ ان کی آواز پر مٹی نے غلب پالیا۔

”یہ گاؤں میں سادگی اور وضع داری کو تو عزت سمجھتے تھے لیکن شہر جا کر یہ مغالطے میں پڑ گئے ان کو لگا عزت کا معیار پیسہ ہے اسی لیے انہوں نے آپ لوگوں سے غلط بیانی کر ڈالی جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولے تو ارجمان اور حطیم کے سر شرمساری سے جھک گئے۔

”آپ سب کو یہاں بلانے کا مقصد اپنی حیثیت سے آپ کو آگاہ کرنا ہے۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ ہم اتنے ہی دولت مند ہیں جتنے آپ کو نظر آ رہے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کا ہے۔“ انہوں نے کہہ کر گہری سانس بھری۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”اس اوکے بابا!“ رومیصہ کی آواز سب سے پہلے ابھری۔

”ہمیں آپ کی سادگی اور سچائی نے بہت متاثر کیا ہے انکل!“ اس کا بھائی بھی بول پڑا۔

”سچ بات تو یہ ہے بھائی صاحب! ہمیں ان کی بڑی بڑی باتوں نے نہیں بلکہ آپ کی گئی تربیت نے متاثر کیا ہے۔ بہت مہذب اور شریف بچے ہیں آپ کے۔“ عروہ کے پاپا نے حطیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ محل اٹھا۔

”بالکل انکل! روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ ہماری رومیصہ کی پسند نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ ارجمان ایک بہتر لڑکا ہے۔“ رومیصہ کا بھائی مزید بولا۔ بابا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی انہوں نے اپنے بیٹوں کو بغور دیکھا جو بچپن میں بیٹنی مسکراہٹ کے ساتھ تعریفیں وصول کر رہے تھے۔

ان سب کو گاؤں بلانے کا ان کا فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس طرح ان کے بیٹوں کو ہمیشہ کے لیے ایک سبق مل گیا تھا جو شاید ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور غصہ سے سیکھ پانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

لڑکھائے عشق

دوسری قسط



”دل آویز..... ہیلو“۔ مبین نیازی کلر پنڈن شاہنگ سینٹر آکسفورڈ میں کوشا کیفے کی باہر لگی میز پر بیٹھا کیپوچینو کے ساتھ چیز اینڈ ٹماٹو ٹوسٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس وقت شاہنگ سینٹر میں بے تحاشا رش تھا۔ کیفے کے بالکل سامنے ”زارا“ میں ونٹر سیل عروج پر تھی۔ دھڑا دھڑ لوگ ”زارا“ میں لگی اس سیل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھے، مبین نیازی نے چیز اینڈ ٹماٹو ٹوسٹ کا بائٹ لیا اور دوسرے پلے آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے اس کی نظر کیفے میں داخل ہونے والی اس لڑکی پر پڑی۔ جس کی تلاش میں وہ پچھلے دو ہفتوں سے سرگرداں تھا۔ اور یہ تو ممکن تھا ہی نہیں کے وہ اس کو پہچان نہ سکتا۔

مبین نیازی نے اسے پکارا لیکن شاید اس کی سماعت تک اس کی آواز نہ پہنچی تھی۔ اس لیے اپنا ٹوسٹ اور براؤنیز اور کیپوچینو ڈیں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ایکسیکوزمی..... دل آویز.....“ مبین لوگوں کے جھوم میں کاؤنٹر کے پاس اسے نمبر کا انتظار کر رہی دل آویز کے بالکل پاس کھڑا اس کو پکار رہا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

”لیس..... ہو آر یو؟“ (آپ کون ہو) اس کے الفاظ، اس کا لہجہ، اس کی نظر اجنبیت سے بھرپور تھے۔ ہلکا سا بھی پہچان کا شائبہ تک نہ تھا۔ مبین نیازی کے لیے یہ لمحات نہایت پرسوز ثابت ہو رہے تھے۔ اسے یوں اپنا تعارف کروانا بہت محسن لگ رہا تھا۔

کبھی یک دم ایک انجانی سی خوشی جانے لیاں سے کہیں کوئے کھدرے سے نکل کر دل میں ایک اھل پھل بچا دیتی ہے، اور جی چاہتا ہے ساری دنیا کو اس خوشی کی خبر ملے، کوئی مجھ اس خوشی کو چاروں طرف پھیلا دے..... اور بھی بیٹھے۔ بٹھائے اچانک ایک انجان سی یا سبت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک ایسی کیفیت جو پل بھر میں ہی غڈ حال کر دیتی ہے۔ اور حیران کن بات یہ ہوتی ہے کہ ہم اس وجہ کو کھوج نہیں پاتے ہیں یا شاید دل کی ان کیفیات کو لفظوں میں ڈھالا ہی نہیں جاسکتا ہے۔

محبت بھی انہی کیفیات میں سے ایک ہے جو لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی، صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس دھڑکن کی طرح جو دل میں تو موجود ہوتی ہے لیکن دکھائی نہیں دیتی، اسی خوشی کی طرح جو دل میں چھپتی ہے لیکن نظر نہیں آتی، اس اضطراب کی طرح جو یک دم طاری تو ہوتا ہے لیکن وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس ہوا کی طرح جو فضا میں ہر پل موجود ہوتی ہے لیکن نگاہوں کی پکڑ میں نہیں آتی۔

مبین نیازی کا دل بھی آج کل انہی رنگا رنگ کیفیات سے دو چار تھا۔ لگن تھی ہو، دل میں محبت ہو، جذبوں میں صداقت ہو تو مثل مشہور ہے کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ مبین یازنی بھی اپنی لگن میں سچا تھا۔ محبت کی شدت پر بھروسہ تھا۔ بھی تو دیدار یار نے نظروں کی نشانی کو سیرابی عطا کی تھی۔

”تم لالہ سے بات کر دو میں ابھی آتی ہوں۔“
عروش نے عفاف کو بھی وہاں سے اٹھنے کے لیے
برقوت لے دیکھ کر سرگوشی کی۔ تو وہ لا چاری سے اس کو
دیکھ کر رہ گئی۔ اور عروش سفینہ کا کپ اٹھا کر باہر نکل
گئی۔

مبین مسلسل خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے
اپنا کپ پکڑے بیٹھے تھے۔ عفاف نے اسے دیکھا۔
ایک عجیب شش و پنج میں مبتلا عفاف نے پہلو بدل کر
سامنے میز پر رکھا کپ اٹھایا۔

”آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟“ عفاف جو
اس کو مخاطب کرنے کے لیے الفاظ کو تڑپ دے رہی
تھی اس کے سوال پر چونک کر اسے دیکھا۔
”کوئی مسئلہ ہو تو آپ بلا جھجک ڈسکس کر سکتی
ہیں۔ آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔“ اس کے
لب و لہجہ میں کوئی ایسا تاثر ضرور تھا کہ عفاف شیشا
گئی۔

”تھینک یو سوچ۔۔۔۔۔ فی الحال مجھے کسی مدد کی
ضرورت نہیں ہے۔“ عفاف قدرے ساٹ انداز
میں بولی۔

”آہم۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔“ مبین نے مدھم
مسکراہٹ کو چھپانے کی خاطر کپ کو ہونٹوں سے لگا
لیا۔ ایک بار پھر ایک خاموشی چھا گئی۔

”بارش۔۔۔۔۔“ مبین کی آواز پر اس نے یک دم
باہر دیکھا۔۔۔۔۔ اور پھر حیرت سے مبین کی طرف۔
”بارش سے تو لگاؤ ہوگا آپ کو؟“ مبین نے اس کی
طرف دیکھ کر سوال کیا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے بارش سے کوئی لگاؤ نہیں
ہے۔“ عفاف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”عموماً لڑکیوں کو تو بارش بہت پسند ہوتی ہے
پھر آپ کیوں اتنی مختلف ہیں۔“ مبین کو اس کے
جواب پر واقعی حیرت ہوئی تھی۔

”مسٹر نیازی۔۔۔۔۔ میں یہاں عروش کے حوالے
سے بات کے لیے رکھی ہوں اپنی پرسنل باتیں ڈسکس
کرنے کے لیے نہیں ٹھہری ہوئی ہوں۔ بہتر ہوگا

آپ اس طرف توجہ دیں۔۔۔۔۔“ عفاف نے لہجے کی
غیر معمولی نجی مبین نیازی کے اندر ایک اطمینان کی لہر
دوڑائی۔

”نہیں شیور۔۔۔۔۔ کیری آن۔۔۔۔۔“ مبین نے اس
کے تھکے تیوروں کو بغور دیکھ کر نہایت محل مزاحی سے کہا
تھا۔ عفاف نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مسٹر نیازی میں ایک پروفیشنل اور انٹرپرائسٹ
ادارے کی انچارج ہوں اور جہاں تک میرا علم ہے
آپ بھی ایک ویل ایجوکیٹڈ مین ہیں اور ایک ویل
اسٹبلشڈ بزنس کو نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے
ہیں۔ میں یہاں اس وقت ایک اہم مسئلے کو ڈسکس
کرنے کے لیے ہوں میں اس وقت آپ کی طرف
سے کسی بھی غیر سنجیدہ رویے کی توقع بالکل نہیں رکھ
رہی ہوں۔ سو پلیز آپ اپنے اپنی ٹیوڈ کو پیچور کریں
تاکہ میں بات کر سکوں۔۔۔۔۔“ عفاف نے مبین کی
اپنے آپ پر جمی نظروں اور غیر سنجیدہ رویے کو مد نظر
رکھتے ہوئے کہا۔

مبین نے ابرواچکا کر اسے دیکھا۔
”اوکے آپ بوبس میں پوری کوشش کروں گا
کہ اپنے آپ کو ویل ایجوکیٹڈ اور ویل میز ڈیپرف کر
سکوں۔۔۔۔۔“ مبین بظاہر مکمل سنجیدگی سے گویا ہوا تھا
لیکن اس کے اندر قہقہے گونج رہے ہیں یہ وہ بھی جانتا
تھا اور عفاف سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ آپ پر شاید میرا
بہت برا ایمپریشن ہے۔ اسی کو زائل کرنے کی کوشش
کر رہا تھا۔“ مبین نیازی نے مسکرا کر کہا۔ تو عفاف
کے چہرے پر حیرانی درآئی۔

”برا ایمپریشن۔۔۔۔۔؟“ عفاف نے غائب
دماغی سے کہا۔

”عروش کے ساتھ مجھے تھوڑا سا سخت رویہ رکھنا
پڑتا ہے۔ بہت ضدی ہے اور من مانی بہت کرتی
ہے۔ لیکن کچھ معاملات سوچ سمجھ کر دیکھے جاتے
ہیں۔“

”آپ مبینس پلیز۔“ مبین نے قدرے صلح

جو اور دوستانہ انداز اپنایا تو عفاف کو مجبوراً دوبارہ بیٹھنا
پڑا۔ مبین اپنی سیٹ کی طرف بڑھا۔

”آپ نے کیا بات کرنی تھی؟“ مبین نے
عفاف کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”عروش بوجے کے جانا چاہتی ہے۔“ عفاف نے
ہنا تمہید اپنی بات شروع کی تھی۔

”وہ بوجے نہیں جاسکتی۔“

”لیکن کیوں؟“ اس سے پہلے کہ مبین مزید کوئی
بات کرنا عفاف نے تیزی سے پوچھا۔ تو مبین نے
گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔

”عروش کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ
ایکلی بوجے کے جائے۔“ مبین نے کشن کو گود میں رکھ کر
اپنے مخصوص انداز میں یوں کہا کہ عفاف چند بل کچھ
بول نہ سکی۔

”اس میں نامناسب کیا ہے؟“ عفاف جھنجھلائی
تھی۔

”دیکھیں مس عفاف۔ عروش یہاں سیٹل ہے
انسٹیوٹ کو چوبیس گھنٹے اس کی توجہ کی ضرورت ہے۔
بے شک میں اس کے ساتھ ہوں، دیکھ بھال میں اس
کی مدد کرتا ہوں لیکن میں مکمل ذمہ داری نہیں لے سکتا
ہوں میری اپنی ذاتی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔“
مبین نے محل مزاحی سے کہا تو عفاف یک لخت
ناموش ہو گئی۔

”عروش جانا چاہتی ہے۔ کچھ عرصے کی بات
ہے زیادہ سے زیادہ دو سال۔“ عفاف نے پھر کوشش
کی۔

”دو سال میں چوبیس مہینے بھی ہوتے ہیں۔“
مبین کے پاس تو جیسے ہر انکار کا جواز موجود تھا۔ عفاف
نے اسے دیکھا۔

”اگر معاملہ صرف انسٹیوٹ کا ہے تو۔۔۔۔۔“
عفاف نے ہاتھ مروڑتے ہوئے تھوک نگلا تھا۔
”مبین نے چونک کر اسے دیکھا۔“ تو میں عروش کی جگہ
ان معاملات کو سنجال سکتی ہوں۔“ عفاف نہ چاہتے
ہوئے بھی اپنی خدمات پیش کرنے لگی تھی۔

”اور آپ کی اپنی جاب؟“ مبین بے حد حیران
ہوا تھا۔

”میں اتنی نازک نہیں ہوں کہ ایک وقت میں دو
ذمے داریاں نہ اٹھا سکوں۔“ اس کے لہجے کی
جھنجھلاہٹ اور خفیف سا طنز مبین کو مسکرانے پر مجبور کر
گیا۔

”ایسی بات نہیں کہ میں ذمہ داری نہیں لے سکتا
لیکن مکمل طور پر انسٹیوٹ کی دیکھ بھال نہیں کر
سکتا۔۔۔۔۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری کوئی بھی ذاتی
مصروفیت انسٹیوٹ کی ریسپونسیبلٹی کو متاثر کرے۔ اس
لئے میں نے حامی نہیں بھری۔۔۔۔۔“ مبین انتہائی
پر سکون انداز میں اس کو بتا رہا تھا۔

”اور اگر آپ ذمہ داری لیں گی تو وہ بھی فل ٹائم
نہیں ہوگی۔ آپ کی اپنی جاب بھی ہے۔“ مبین مزید
گویا ہوا۔ عفاف مسلسل سوچ میں تھی۔

”آپ کی بات میں سمجھ رہی ہوں مسٹر نیازی
لیکن عروش کی خوشی کے لیے آپ کو تھوڑی بہت قربانی
تو دینی ہی پڑے گی۔“ عفاف کا لہجہ نجائے کیوں نہ
تھا۔ شاید وہ مبین کی اسے آپ پر پڑی نظروں سے
جھنجھلا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مبین اس کی جھنجھلاہٹ
سے باخبر ہے اس کی مدھم مسکراہٹ، بولتی آنکھیں اور
شائستہ انداز، خواہ مخواہ کا دوستانہ رویہ۔۔۔۔۔ عفاف
ایک ہندوؤں کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

”آپ مجھے مبین کہہ سکتی ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی
اور آپ کے لیے بھی مشکل نہیں ہوگی۔“ مبین ایک
بار پھر اپنی پوشیدہ شرارت سے اس کو زبردستی لگا تھا۔

عفاف نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا۔
”اگر آپ عروش کے بھائی نہ ہوتے تو۔۔۔۔۔“ وہ
دانت پس کر آہستہ سے بڑبڑائی۔

”تو۔۔۔۔۔!“ مبین نیازی اس کے ہلنے لہوں
سے ادا کیے گئے الفاظ سے بخوبی واقف تھا۔ عفاف
نے اسے دیکھا۔ شعلہ انگلی نظریں، مسکراتی نگاہوں
کے مقابل تھیں۔۔۔۔۔ ایک طرف مسکراہٹیں بکھری تھیں
تو دوسری طرف جھنجھلاہٹیں عروش پر تھیں۔ ایک طرف

جھٹلا ہوں سے لطف لیا جا رہا تھا تو دوسری طرف مسکراہٹیں زوج کیے جا رہی تھیں۔

”تو آپ کا سرف ہال بن چکا ہوتا۔“ عفاف بنیاطاظ و مروت دانت چیں کر بولی۔

”ہا ہا ہا..... آئی انجوائے دیٹ۔“ مبین خلاف معمول ایک شوخ و شنگ لڑکے کا کردار ادا کر کے عروش کو جھوٹا ثابت کر رہا تھا۔

”لالہ.....“ اسی لمحے عروش کمرے میں داخل ہوئی۔ مبین کا تہتہ اور عفاف کی شعلے برسانی نگاہیں عروش کو کسی جنگ کے ہونے کی پیش گوئی دے رہی تھیں۔

”عروش مجھے اب جانا ہے۔“ عفاف یک لخت اٹھی تھی عروش نے حیرت سے اسے دیکھا جب مبین مسلسل مسکرا رہا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ عروش کو عفاف کے خطرناک تیوروں پر کچھ ایسا ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا جو اس کے موڈ میں بگاڑ پیدا کر گیا۔

”کچھ نہیں کافی دیر ہو گئی ہے نا تو اب جانا ہے۔“ عفاف سپاٹ لہجے میں بولی۔

”جانے کی فکر نہ کرو میں اور لالہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔ ہے نا لالہ؟“ عروش کہتے ہوئے مبین سے تعذیب چاہنے لگی تھی۔

”ہاں شیور۔“ مبین نے ہامی بھری تو عفاف نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”لیکن وہ اب متوجہ نہ تھا۔“

”عفاف اگر آپ انسٹیٹیوٹ کی ذمہ داری بھا سکتی ہیں تو عروش تم اپنے کورس کے لیے یو کے جاسکتی ہو۔“ مبین موبائل اسکرین پر نظریں جماتے بولا تو دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”رنگی لالہ.....!“ عروش یک دم ہی پر جوش لہجے میں اس سے پوچھنے لگی جبکہ عفاف ابھی تک خاموش تھی۔

”عفاف کیا یہ ذمہ داری بھا سکتی ہیں؟“ مبین براہ راست اس سے مخاطب تھا۔ ”مسل پرویشنل طریقے سے آپ کو اپائنٹ کیا جائے گا۔ سیلری طے

کی جائے گی۔“ اس سے پہلے کے عفاف کچھ بولتی مبین مزید گویا ہوا۔ لہجہ بحر کو وہ جھٹکی لیکن اگلے لمحے نارمل ہو گئی۔ اس کی تجویز نے عفاف کو حیران تو کیا ہی تھا ساتھ ایک سوچ میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔

”لیکن عفاف کی اپنی جاب.....؟“ عروش نے اس کو سوچ میں گم دیکھا تو بولی۔

”اپنی دوست کی خوشی کے لیے ان کو تھوڑی سی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔“ مبین عفاف پر اپنی مسکرائی نظریں جمائے بولا۔

”میں سب کر لوں گی۔“ یک دم عفاف بولی۔ تو عروش نے متوجہ نظریں سے اسے دیکھا۔

”عروش تم ساری تفصیل مجھے ای میل کر دینا۔ کل میں تھوڑی مصروف ہوں گی۔ پرسوں مینگ رکھ لیتے ہیں۔“ مجھے انسٹیٹیوٹ کی پالیسی کے بارے میں معلومات چاہیے ہوں گی۔“ عفاف مبین کو نظر انداز کرتی مکمل طور پر عروش سے مخاطب تھی۔

”لیکن پرسوں میرے پاس ٹائم نہیں ہوگا مینگ کا۔“ مبین کی آواز پر دونوں چونکیں۔

”آپ کی شمولیت ضروری بھی نہیں..... میں نے عروش سے ذیل کی ہے۔“ عفاف ایک بار پھر لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”شاید آپ کے علم میں نہیں کہ میں انسٹیٹیوٹ میں پچاس فی صد کا حصہ دار ہوں اور قانونی طور پر کوئی بھی تبدیلی آئے تو دونوں پارٹنرز کا مینگ میں موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔“ مبین نیازی سنجیدگی سے اس کو بتاتے اسی کو حیران کر گئے۔ عفاف نے استغنامیہ نظروں سے عروش کو دیکھا۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلا کر مبین کی بات کی تصدیق کر دی۔

”مینگ کی ساری ڈیٹیل کے نوٹس آپ تک پہنچ جائیں گے۔“ عفاف نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”لیکن مس عفاف..... چونکہ آپ عروش کی جگہ چارج لیں گی اس لیے اصولی طور پر یہ مینگ میرے ساتھ ہونی چاہیے کیونکہ عروش کے جانے کے

بعد آپ کو میرے ساتھ ساری چوبیس ڈسلس کرنی پڑے گی۔“ مبین نجائے کیوں اپنی سی ایک انجانی کوشش میں مبتلا اس کو زیر کرنے کے لیے طرح طرح جھٹکنے سے آزمانے لگے تھے۔

”کیا سلیپنگ پارٹنر بن سکتے ہیں؟“ عفاف نے بمشکل خود کو کٹیخ کھائی سے باز رکھا تھا۔

”نہیں.....“ مبین مسکراہٹ دبا کر بولے۔ جبکہ عروش کے لیے مبین کا یہ انداز قطعی نا تھا۔ یہ مسکراہٹ، یہ شوخیوں بھی مبین نیازی کی شخصیت کا حصہ رہی تھیں لیکن اب عرصہ دراز سے مبین ایک خول میں بند تھا۔ یوں اچانک یکا یک اس کا رویہ بدل جانا یقیناً ایک حیران کن تجربہ تھا۔

”اور دیے بھی سلیپنگ بیوٹی ہوتی ہے سلیپنگ پارٹنر نہیں۔“ جو کہ میں کسی صورت بھی نہیں بن سکتا چاہوں تب بھی نہیں.....“ مبین کے لہجے میں ایک شرارت پنہاں تھی۔ جس نے عفاف کو تو حیران کیا ہی تھا ساتھ میں عروش کو بھی چونکا دیا تھا۔ عفاف نے کبھی نظروں سے عروش کو دیکھا جن میں صاف صاف درج تھا کہ تم تو کبھی بھی کہ لالہ بہت غصے والے ہیں۔

بہت سخت مزاج ہیں لیکن یہاں تو انوکھے ہی انداز براجمان ہیں۔ عروش نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ عفاف نے بے اختیار سر تھا۔ جانتی تھی اب حامی بھری ہے تو اس کو نبھانا بھی پڑے گا۔

”او کے جب ٹائم ملے گا مینگ کا وقت بتا دینا میں پہنچ جاؤں گی۔“ عفاف اب اس فضول بحث سے عاجز آ چکی تھی۔ جھنجھلا کر بولی۔ عروش نے اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن ایک مسئلہ ابھی تک ویسے کا دیا ہی پڑا ہے؟“ مبین نیازی نے ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔

”اب کیا مسئلہ ہے لالہ.....“ عروش نے مبین کو دیکھ کر پوچھا۔

”تمہاری وہاں رہائش کا بندوبست؟“ مبین تشکرانہ انداز میں مدھم آواز میں بولا۔

”عروش کے رہائش کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ وہ

ذمہ داری میری۔“ عفاف نے محبت پاش نظروں سے عروش کو دیکھ کر کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ اس سے پہلے کہ عروش اس اطلاع پر خوشی کا اظہار کرتی مبین نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”عروش میرے والدین کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ کوئی براہم نہیں ہوگی۔“ عفاف نے عروش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ کے گھر.....؟“ مبین کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”میرے گھر، میرے بابا جان اور می کے پاس.....“ عفاف اعتماد سے بولی۔ عروش نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ چاہیں تو بابا جان سے بات کر سکتے ہیں۔“ عفاف نے کہا۔

”وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ عروش کو می اور بابا جان سے بہت تحفظ اور محبت ملے گی۔“ عفاف پھر بولی۔

”ہاں میری ان سے بات کروادیں۔ تاکہ تسلی ہو جائے۔“ مبین نیازی نے ذمہ دارانہ سنجیدگی سے کہا تو عروش نے فخریہ انداز سے اسے دیکھا۔ عفاف نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ابھی شاید بابا گھر نہ ہوں۔ عروش کے جانے سے پہلے بات کروادوں گی۔ لیکن فکر نہ کریں عروش کو وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مجھ سے بھی زیادہ اس کو وہاں پیار ملے گا۔“ عفاف نے یقین دہانی کرائی۔

اس کے ذہن میں عدی کی خواہش گونج رہی تھی۔ عروش کے رہائش کا مسئلہ سامنے آنے سے پہلے ہی اس نے یہ سوچ لیا تھا۔

”او کے میری بات کروادینا..... اور آپ اپنا نمبر دے دیں تاکہ میں آپ سے انسٹیٹیوٹ کے حوالے سے رابطے میں رہ سکوں.....“ مبین نے اٹختے ہوئے کہا۔ تو عفاف شپٹا گئی۔

”زیر و تھری..... آگے؟“ اس سے پہلے کہ

عفاف کسی قسم کا کوئی ری ایجنٹ ظاہر کرنی یا انکار کرتی۔ مبین دو قدم چلا اس کے پاس آکھڑا ہوا اور موبائل ہاتھ میں پکڑے انتہائی چالاک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا نمبر لینے لگا۔

”مجھے جب ضرورت پڑے گی میں آپ سے خود رابطہ کر لوں گی۔“ عفاف نے عروش کی موجودگی کے باوجود انتہائی تلخ انداز میں انکار کیا تو مبین، جس کو غصہ آتا چاہیے تھا، نے مسکرا کر موبائل واپس پاٹ میں ڈال دیا۔

”اوکے..... جب آپ نے جانا ہو بتا دیجیے گا۔ میں ذرا فریٹش ہوں۔“ مبین نے عروش کی طرف دیکھ کر کہا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

”یار یہ تو بہت ہی زبردست ہو گیا۔“ اس کے جاتے ہی عروش کو بھی اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کرنے کا موقع مل گیا۔ عفاف دھیسے سے مسکرائی لیکن اس کے ذہن میں مبین نیازی کی بے تکلفی بری طرح چبھ رہی تھی۔

”ویسے بہت عجیب بات ہے۔ میں تو جب سے باہر جانے کے چانس کا پتا چلا تھا لالہ کو کہے جارہی تھی۔ ہمیشہ آگے سے نامی جواب میں ملا لیکن تم نے تو ایک ہی ملاقات میں لالہ کو راضی کر لیا۔ آئی ریٹی لو یو عنی.....“ عروش متجھبہ لہجے میں کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

”اچھا اب کافی وقت ہو گیا ہے۔ دادو سے مل لوں پھر میں نے جانا ہے۔“ عفاف نے باہر کی جانب قدم بڑھائے تو عروش بھی اس کے پیچھے پئی۔ ”لیکن میں اور لالہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے ناں کیا جلدی ہے۔ جانے کی؟“ عروش اس کے ہمراہ چلتی کہنے لگی تھی۔

”ایک دوسری کام کرنے ہیں اس لیے اب جاتی ہوں اور اپنے لالہ کو آرام کرنے دو۔ میں گاڑی لائی ہوں آج.....“ عفاف سفینے کے کمرے کے دروازے کو کھولتے ہوئے بولی۔

”دادو اب میں جا رہی ہوں۔ بہت مزے کھانا تھا اور بہت اچھا لگا آج کی شام آپ کے ساتھ گزار کر۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ عفاف سفینے سے ملنے ہوئے بولی اور ان سے دعائیں لے کر واپس آنے لگی۔

”عجیب بات نہیں کہ تم نے آج ڈرائیو کی عروش نے اسے دیکھ کر اپنی حیرت اس پر آشکار کی۔“ ”بھی بھئی عجیب باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔“ عفاف نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کیا لالہ کو نہیں بتانا کہ تم جا رہی ہو؟“ عروش کے سوال نے قدم بڑھاتی عفاف کو چونکا گئے۔ ”تم بتا دینا۔ ویسے اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔“ عفاف نے بیک سے چابیاں نکال کر قدرے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تمہاری لالہ سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟“ عروش نے حیرت سے اس کے تیور کو دیکھا تھا۔ ”نہیں تو..... میری بھلا ان سے لڑائی کیوں ہو گی؟“ عفاف نے اچھی نظر اس پر ڈالی۔

”پھر..... تم اتنی خفا کیوں ہو رہی ہو.....؟“ عروش نے پوچھا تو عفاف ٹھٹھکی گئی۔ ”تم جانتی ہو میں لڑکوں سے زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کرتی ہوں۔ تمہارے غصیلے لالہ کی بے وجہ کی شوخی اور تکرار مجھے پسند نہیں۔“ عفاف نے صاف گوئی سے کہا۔

”میرے لالہ ایسے نہیں ہیں۔“ عروش نے مبین کا دفاع کیا۔ ”جی بالکل ایسے نہیں ہیں۔“ عفاف کے تسخیرانہ انداز پر عروش ہنسنے لگی۔ ”تمہیں لالہ کو بتانا چاہیے کہ تم جا رہی ہو۔ ورنہ وہ ناراض ہوں گے اور ویسے بھی وہ گھر کی لڑکیوں کے لیے بہت پروٹیکٹیو ہیں۔ تمہارا اکیلے جانا انہیں اچھا نہیں لگے گا۔“ عروش باہر کی جانب بڑھتی عفاف کا ہاتھ پکڑ کر مبین کے کمرے کی طرف بڑھی۔ تو چاہے

کے باوجود عفاف اپنا ہاتھ چھڑانہ سکی۔ دستک دینے پر اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے.....؟“ اور اس سے پہلے کے عروش کچھ کہتی ہاتھ میں پکڑا اس کا موبائل بج اٹھا اور بنا جواب دیے وہ ذرا سیڑ پر ہو گئی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا..... مبین نیازی عفاف کو دیکھ کر ٹھٹھکیا گیا جبکہ وہ ہنسا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”آگے ٹریفک دیکھو اور اپنے آپ کو ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار رکھو۔“ مانی نے اسے بتایا۔ وہ ایک بار پھر ڈرائیونگ لیسن کے لیے مانی کے امراہ تھی۔

”اب گاڑی اسٹارٹ کرو..... اور یوں سمجھو تم ایسی ہو..... میں اب صرف ایک سینیئر ہوں جس نے تم سے لفٹ لی ہے.....“ مانی نے اسے تھوڑی سی ہدایت دی اور دوستانہ انداز میں کہا۔ دل آویز نے اسے دیکھا اور مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”انڈیکسٹر آن کرو، بلائنڈ اسپاٹ چیک کر کے گاڑی موڈ کرو۔“ دل آویز نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی طرح چاروں طرف دیکھ کر گاڑی کو موڈ کیا۔ ”تمہارے انٹرست کیا ہیں؟“ ”پروفیشنل لائن سے ہٹ کر کیا گیا سوال دل آویز کو چونکا گیا تھا۔

”مجھے بارش سے عشق ہے۔ مجھے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ موویز دیکھنا پسند ہے، سونگز سننا میری لاورٹ پیٹ ہے۔ ان سب میں اب ایک چیز کا اضافہ ہوا ہے۔“ دل آویز پر جوش لب و لہجے کے ساتھ بولی مانی کو چونکا گئی۔

”وہ کیا.....؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی مانی نے پوچھا۔

”آپ سے ڈرائیونگ سیکھنا.....“ دل آویز نے مسکرا کر ذرا کی ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ ”تمہاری اسٹیڈیز مکمل ہو گئی ہے؟“ وہ اب ایک لمبی قدرے تنگ سڑک پر ڈرائیو کر رہی تھی۔ انوں طرف گاڑیاں پارک تھیں۔ دل آویز کو تنگ

سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے مشکل پیش آرہی تھی۔ مانی دیکھ رہا تھا لیکن وہ بولا کچھ نہیں، کوئی ہدایت، کوئی مفید اشارہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ دیکھتا چاہتا تھا کہ وہ اس مشکل روڈ کو کیسے ہینڈل کرے گی۔ ”میری ڈگری اگلے سال مکمل ہو جائے گی۔“ دل آویز بمشکل بولی۔

”تمہاری عمر کیا ہے؟“ مانی نے پھر پوچھا۔ ”اگلے مہینے ایس سال کی ہو جاؤں گی۔“ دل

آویز نے ساری توجہ روڈ کی طرف مبذول کرتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ ایسی جگہ پر تھی جو بہت تنگ تھی۔ دوسری طرف سے بھی گاڑیاں آرہی تھیں۔ وہ ایک ایسی جگہ رک گئی تھی جہاں سے دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کو روکنا پڑا تھا۔ دل آویز ریورس گیر سے گاڑی کو پیچھے بھی نہیں لے جا سکتی تھی کیوں کہ اس کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی لائن لگی تھی۔ سامنے سے آنے والی گاڑی کے پیچھے بھی تین چار گاڑیاں موجود تھیں۔ ایسی صورت حال سے مکمل کنٹرول کے ساتھ گاڑی کو ٹکالنے کے لیے بہت مہارت درکار تھی۔

دل آویز کے لیے اس لمحے کنٹرول بھی محال ہو رہا تھا۔ مانی خاموش بیٹھا تھا۔ دل آویز کو ہنسنے سے روک دیا۔ ”اس نے مانی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ مانی نے اسے دیکھا اور اگلے لمحے وہ مدد کرنے لگا۔

”اگر تم اس تنگ موڑ تک آنے سے پہلے گاڑی کو روک لیتیں تو ہمیں اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ ٹیمپٹ میں ایسی جوتھیں پر تم مل ہو.....“ مانی اپنے مخصوص انداز میں ایک بار پھر اس کو سمجھا رہا تھا۔

”اپنی توجہ روڈ کی طرف رکھنی پڑتی ہے تاکہ ہم جلد از جلد سامنے کی کسی طرح کی بھی صورت حال کو منج کر کے اس سے نکل جانے کی تدابیر کر سکیں.....

بریک، بریک، بریک..... مرر..... سلو ڈاؤن..... لک ایسے ہیڈ..... لیکن نہیں تم..... تمہاری نظریں تو روڈ پر ہوتی ہیں لیکن دماغ غائب..... جلدی فیصلے لینے پڑتے ہیں..... کسی قسم کی تبدیلیوں کو جلد از جلد پک کرنا

پڑتا ہے۔۔۔۔۔“ دل آویز سر جھکائے بیٹھی تھی اور مانی قدرے رعب دار آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔
 ”تم میرے کیرئیر کی مشکل ترین اسٹوڈنٹ ہو دل آویز اور مجھے خود پر حیرت ہو رہی ہے کہ میں تمہیں کیوں نہیں سکھا پا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ اتنی رعایت کیوں برت رہا ہوں۔۔۔۔۔“ مانی پر ایک جھنجھلاہٹ غالب آئی تھی۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔“ یک لخت ہی دل آویز خوشی سے بولی۔ مانی نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔ اور لب سمجھنے لگے۔ جب کہ دل آویز شرمندہ ہو کر ایک بار پھر سر جھکا گئی۔

”دل آویز میں نے انسٹرکٹرن کر تمہیں سکھایا۔ دوست بنا کر بھی تمہیں سکھانے کی کوشش کی لیکن تم سنجیدگی سے سیکھنے پر آمادہ نظر نہیں آتی ہو۔ میری انرجی، اپنا پیسہ اور وقت برباد کر رہی ہو۔۔۔۔۔ اور یہ محبت کہاں سے آگئی؟“ مانی اس کی حرکتوں پر حیران ہو رہا تھا۔

دل آویز مانی کے لیے بے حد مشکل اسٹوڈنٹ ثابت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ بھی وہ مانی کو ایک چیلنج لگتی تو کبھی کسی معرکہ کی طرح اس کے سامنے ہوتی تھی۔۔۔۔۔ جو مانی کا زعم بھی (کہ اس سے اچھی طرح ڈرائیونگ کوئی سکھا نہیں سکتا) تو ڈر رہی تھی۔ اور اس کو زنج بھی کر رہی تھی۔ ایسے میں مانی کا بھڑک جانا یقیناً ایک فطری عمل تھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ ریلی سوری۔۔۔۔۔ شاید واقعی سنجیدگی سے سیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ شاید میں ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے آپ کے ساتھ ہوں ہی نہیں۔ ڈرائیونگ تو کسی سے بھی سیکھی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی سکھا سکتا ہے۔ لیکن میں نے آپ کو۔۔۔۔۔“ دل آویز نے ہنسیوں سے مانی کے ہنسنے تیوروں کو دیکھ کر مدھم آواز میں کہنا شروع کیا تو مانی نے اسے دیکھا تو اس نے اپنی بات پوری کرنے سے پہلے ہی لب سمجھ لے۔

”میں جانتا ہوں کہ ہر انسان میں سیکھنے کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ کوئی جلدی سیکھ لیتا ہے۔ کسی کو وقت درکار ہوتا ہے۔ تم جلدی سیکھ سکتی ہو۔ میں، میں نے وہ شوق دیکھا ہے۔ تم صرف اس سنجیدگی سے سیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔“ مانی اب قدرے نرم انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

”لیکن میں نے آپ کو دل سنگھاسن پر بٹھا ہے۔ وہاں آپ کی حکمرانی چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ دھڑکن کو آپ کا تابع ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں، اس شاہراہ محبت کو آپ کے نام کی پہچان دینا چاہتی ہوں ہر کونے میں آپ کے نام کی راہداری چاہتی ہوں، آپ کی بادشاہت چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ محبت گونجا کرے تو ہر طرف ہمارے چرچے ہوں۔ میں ایسا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اور چاہتی ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی چاہیں۔“

”دل آویز۔۔۔۔۔“ مانی کی پکار پر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکل۔

”کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟“ دل آویز نے اس کی طرف دیکھا۔

”صرف دوست۔۔۔۔۔“ اس کی خاموش نظروں میں ابھرتے سوالوں کو دور گزر کرتے ہوئے وہ مزید بولی۔

”مطلب تم اگر کچھ سیکھ نہ سکو تو کم از کم میرے شائع نہ ہوں۔ وقت کی خیر ہے، بے شک شائع ہو جائے۔“ مانی نے نیم رضامندی سے مسکرا کر کہا۔

”افف یہ مسکراہٹ۔۔۔۔۔ آپ مسکرایا نہ کرو۔۔۔۔۔ یہ مسکراہٹ ہی تو ہے جو میری محبت کو جلا جاتی ہے۔“ وہ ایک بار پھر اس کی مسکان میں کھونے لگی تھی۔ لیکن چند لمحوں میں ہی حواسوں میں لوٹ آئی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ دل آویز کا وعدہ ہے کہ اس دوستی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤں گی۔“ اگلے پل وہ وعدے کر رہی تھی۔ لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ان وعدوں کی پابند نہ رہ سکے گی۔ جانتی تھی کہ اپنے جذباتوں کے سامنے وہ کس قدر بے بسی سے

غیر پارہی ہے، جانتی تھی کہ مانی کے ہمراہ وہ اپنے حواسوں پر کیسے بند باندھتی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کی ایک مسکراہٹ۔۔۔۔۔ ہلکی سی ایک مسکراہٹ اس کی دھڑکنوں کو کس قدر باغی کر دیتی تھی اور اس کو کن کن زنجیروں سے ان کو جکڑنا پڑتا تھا۔ وہ سب جانتی تھی۔ لیکن پھر بھی وعدہ کر رہی تھی۔

”اوکے شکایت کا موع دیا تو سزا بھی ملے گی اور جرمانہ بھی بھرتا پڑے گا۔“ مانی نے دوستی کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

”وعدہ کیا ہے تو پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو شکایت نہ ہو۔ آئی ایم شیور اگر آپ نیچر نہیں ایک دوست بن کر سکھائیں گے تو میں جلدی سیکھ جاؤں گی۔ ایسے ایک ڈر سارا رہتا ہے۔ میں سمجھ سیکھ نہیں پاتی۔ پھر آپ کو غصہ آتا ہے اور۔۔۔۔۔ مجھے پیار۔“ دل آویز نے آخر دو لفظ ہی دل میں ادا کیے تھے۔

”ہاہاہا۔۔۔۔۔“ مانی کا گونجنا قبضہ اس کو نظریں آنے پر مجبور کر گیا۔ لیکن ایک دوستی کی ابتدا ہو چکی تھی۔

☆☆☆

”میں۔۔۔۔۔ میں مجھے دیر ہو رہی ہے تو اب جانا ہے۔ لیکن میں اپنی گاڑی لانی ہوئی ہوں اس لیے آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے یوں ایک دم دروازہ کھول دینے پر اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش میں اس کا لٹھ مار سا انداز مبین کی ناعت سے ٹکرایا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ عفاف نے اسے دیکھا اور رخ موڑ کر قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔

”آپ اور عروش چلیں میں چابیاں لے کر آتا ہوں۔“ مبین نے پیچھے سے کہا۔

”لیکن۔۔۔۔۔ مجھے صبح گاڑی کی ضرورت پڑتی ہے۔“ عفاف نے چلتے چلتے پھر احتجاج کیا۔

”آپ اپنی گاڑی کی چابیاں مجھے دیں۔ صبح آپ کی گاڑی آپ کے اپارٹمنٹ میں پہنچ جائے

گی۔“ مبین نیازی نے ہاتھ بڑھایا تو طوطا کہنا عفاف کو چابیاں اس کو دینی پڑیں۔ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی عفاف کو مبین اور عروش کے ہمراہ واپس آنا پڑا تھا۔۔۔۔۔ مبین نے اس کے احتجاج کو اہمیت نہ دی تھی۔ عروش خوش تھی۔ مبین کے تاثرات وہ جاننے سے قاصر تھی۔ کیونکہ وہ اس کی طرف ایک نظر بھی نہ ڈال پارہی تھی۔ جبکہ عفاف مسلسل پہلو بدل رہی تھی۔ ”نجانے کب دو سال گزریں گے۔۔۔۔۔“ اس کے چہرے سے اس کی بے زاری انتہائی واضح تھی۔ اور مبین کی نظریں بیک ویو پر رہے اس پر وقتاً فوقتاً پڑ رہی تھیں۔ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر اس کا اپارٹمنٹ آتے ہی وہ جلد از جلد گاڑی سے نکل گئی تھی۔

”لالہ کیا بات ہے آپ بہت مختلف لگ رہے ہیں آج۔۔۔۔۔“ واپسی پر عروش نے کب سے اپنے اندر چھلنے سوال کو بالآخر الفاظ ڈھال ہی دیا۔

”مختلف کیسے؟“ مبین نے ایک نظر اسے دیکھ کر دوبارہ اپنی توجہ روڈ کی جانب مرکوز کی تھی۔

”بہت عرصے کے بعد میں نے آپ کو ایسے بے ساختہ ہنسنے دیکھا ہے۔“ عروش نے مبین کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

”آپ ایسے ہنسنے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں۔ پہلے بھی آپ ایسے ہی تھے۔ مہما اور بابا کے بعد بھی آپ ہنسا کرتے تھے، ہماری دوستی بھی تھی۔ لیکن پچھلے تین چار سال سے نجانے آپ کو کیا ہوا ہے نہ ہماری دوستی ویسی رہی، نہ آپ کی بھی۔۔۔۔۔ درحقیقت آپ بہت مغرور بھی ہو گئے ہیں۔“ عروش نے مبین کو کہا تو اس نے لب سمجھ کر اسے دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس بزنس کا پریشر ہے اس وجہ سے باقی طرف زیادہ دھیان نہیں دے پا رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ اب کے کوئی شکایت نہ ہو۔“ مبین کے لہجے میں ایک شرمندگی در آئی تھی اور افسوس بھی ہوا تھا کہ اپنی ناکامی پر اس نے اپنی میلی کو سزا دی ہے۔

”اچھا لالہ آپ خفا نہ ہوں تو ایک اور بات پوچھوں؟“ عروش نے قدرے جھجکتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔ تو اس نے استغما یہ نظروں سے اسے دیکھا اور دھیمے سے مسکرائے۔

”عفاف کسی لگی آپ کو؟“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ مبین نیازی کا بے ساختہ قہقہہ عروش کو شرمندہ کر گیا۔

”کیا ہوا؟“

”جانتا تھا یہی پوچھنے والی ہو۔۔۔ ایک ملاقات سے کسی کے بارے میں کیسے کوئی رائے قائم ہو سکتی ہے؟“ مبین نیازی نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں یہ بھی ہے۔۔۔“ عروش خواہ خواہ ہی شرمندہ ہوئی۔

”اچھا لالہ لڈ ٹائٹ۔۔۔“ باقی کا پانچ دس منٹ کا سفر خاموشی سے گنا تھا۔ گاڑی پور بچ میں رکھتے ہی عروش اس کو لڈ ٹائٹ کہہ کر اندر بڑھ گئی تھی۔ جبکہ مبین نیازی تکی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔۔۔ اور اپنے رویے کے بارے میں غور کرتا رہا۔۔۔ اور پھر گاڑی لاگ کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ احسن ندیم کو مسلسل کال کیے جا رہی تھی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہو رہا تھا۔

”بابا جانی پلیز فون اٹھالیں۔۔۔“ عفاف اب جھنجھلائی تھی۔ اوپر سے ستم یہ تھا کہ عدی کا موبائل مسلسل بزی مل رہا تھا۔

”سوری سوری بیٹا۔۔۔“ وہ ایک بار پھر ڈائل کرنے لگی تھی کہ احسن ندیم کی کال آ گئی۔

”بابا جانی ناٹ فیر۔ جان نکال دی میری۔۔۔ آپ سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“ عفاف جو چند لمحے پہلے انتہائی شکر انداز میں دعائیں مانگے جا رہی تھی اب غصے سے کہنے لگی۔

”سوری بیٹا وہ دراصل تمہارے پیارے سے

بابا جانی کے ساتھ بہت بڑی ٹریجنڈی ہو گئی تھی۔ احسن ندیم نے اسے بتایا۔

”اللہ خیر کرے۔ کیا ہوا بابا جانی آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟“ وہ تو ٹھیک ہیں ناں؟“ ایک دم عفاف ایک بار پھر بے حد پریشان ہوئی۔

”بیٹا آج کے زمانے میں سب سے بڑی ٹریجنڈی یہی ہے کہ موبائل کا گلا گھونٹا ہوا ہو، مطلب سائلٹ پر ہوا اور وہ مل نہ رہا ہو۔۔۔“ احسن ندیم قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

”بابا جانی۔۔۔“ وہ دانت پیس کر انتہائی غصے سے فقط اتنا ہی کہہ سکی جبکہ وہ مسلسل قہقہے لگا رہے تھے۔

”تم عدی کو کال کر لیتیں ناں۔“ وہ ہنسنے لگا اپنی ہنسی روک کر بولے۔

”کیا تھا ناں، اس دفتر کا موبائل مسلسل بزی تھا۔“ عفاف نروٹھے لہجے میں ان کو بتانے لگی تھی۔

”اور ایسی کیا ایرجنسی آ گئی تھی؟“ احسن ندیم نے اب اس کی جھنجھلاہٹ نوٹ کی تھی۔

”بابا جانی وہ میری دوست سے نا عروش۔ وہ یو کے جا رہی ہے اس کو لنڈن یونیورسٹی میں ایڈمیشن ملا ہے۔ اس کی رہائش کا مسئلہ ہو رہا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ہمارے گھر رہ سکتی ہے۔“ عفاف نے احسن ندیم کو اپنی کال کی وجہ بتائی۔

”ہاں تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ احسن ندیم نے تحمل انداز میں کہا۔

”پریشانی کی بات تو نہیں لیکن آپ کو انفارم تو کرنا تھا ناں۔“ عفاف مدہم آواز میں ساری تفصیل انہیں بتائی۔

”بے فکر ہو جاؤ۔ بیٹا یہ تمہارا گھر ہے، تمہاری سہیلیاں جب چاہیں آ سکتی ہیں۔“ احسن ندیم نے فراخ دلائی انداز میں کہا تو عفاف مسکرانے لگی۔

”بیٹا عروش کے ساتھ تم بھی آ جاؤ ناں۔“ احسن ندیم التجائیہ انداز میں کہا۔

”بہت دل کر رہا ہے تم سے ملنے کا۔ تمہیں بھی

ایک مل جائے گی۔“ اس کی خاموشی پر احسن ندیم ایک بار پھر بولے۔

”بابا جانی میں نے آنا تھا۔ آپ سب سے ملنے کا بہت دل کر رہا ہے۔ لیکن ایک مسئلہ کی وجہ سے نہیں آ سکتی۔“

”کیا مسئلہ بیٹا؟“ عفاف نے کوئی براہم ہے کیا؟“ احسن ندیم شکر انداز میں پوچھنے لگے۔

”نہیں بابا جانی۔“ عفاف نے بہت اچھی ہے لیکن عروش کے انشٹیوٹ میں عروش کی جگہ انچارج سنبھالنا ہے۔ اس لیے فی الحال آنا ممکن نہیں ہے۔“ عفاف نے انہیں بتایا۔

”یہ کیا بات ہوئی بیٹا۔ وہ انشٹیوٹ کے لیے کوئی اور انتظام کرے ناں۔“ احسن ندیم نے قدرے روٹھے لہجے میں منہ بسور کر کہا۔

”ایسی بات نہیں ہے بابا جان۔ دیکھ بھال کی آمد داری ہے۔ لیکن یوں سمجھیں گے ایک بھروسے کو بھانتا ہے۔ بس آپ کی دعائیں چاہیے ہوں گی۔“ عفاف مسکرا کر بولی۔

”تم جیسی بیٹی کے لیے تو ماں باپ ہر وقت اما میں کرتے نہیں تھکتے بیٹا۔ تم تو ہمارا فرخ ہو۔ اللہ تعالیٰ مزید کامیابیاں عطا کرے گا۔“ عفاف نے کوئی تھوڑے سے آگے بڑھاؤ کی تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ نوٹ لے۔“ احسن ندیم نے ہمیشہ کی طرح اس کو اپنی ہونٹوں کو پاکیزہ رکھنے کا سبق دیا۔

”ان شاء اللہ بابا جانی۔“ عفاف مسکرائی۔

”عدی کہاں ہے۔“ دوسرے پل عفاف نے عدی کا پوچھا۔

”گھر ہی ہے۔ بات کرنی ہے؟“

”ہاں کروادیں۔“ اس کے کہتے ہی احسن ندیم عدی کے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

”ہائے اپو، والس اپ۔۔۔“ موبائل کان سے لگاتے ہی عدی پر جوش آواز میں بولا تو احسن ندیم نے شکیں نظروں سے اسے دیکھا۔

”سلام دینے کی روایات کیا اب ختم ہو چکی

ہے؟“ احسن ندیم بڑبڑائے عدی نے انہیں دیکھا اور کھینا سا ہنس دیا۔

”السلام علیکم ایسا جان۔ کیسی ہو؟“ عدی نے جھکنے کے سے انداز میں کہا اور احسن ندیم کی طرف دیکھ کر اشارے سے ”اب ٹھیک ہے“ پوچھا تو وہ بے اختیار ہنسنے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر ہر نقل گئے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ عفاف اس کے وطیرہ بدلنے پر حیرت سے گویا ہوئی۔

”بابا جانی کا پچھ۔۔۔“ عدی نے اسے بتایا۔

”تو کیسے یاد آئی۔۔۔؟“ عدی نے پھر پوچھا۔

”عروش یو کے آ رہی ہے۔ اس کا لنڈن یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے اور اس کی رہائش ہمارے گھر ہوگی۔ بابا جانی کو انفارم کر دیا ہے۔ لیکن تمہیں وارن کر رہی ہوں۔ عروش ویسی لڑکی نہیں ہے۔ اس لیے اگر تمہارے دل میں کوئی ایسی بات ہے تو فکر نہ کرو۔“ عفاف نے بڑی بہن کا فریضہ بخوبی نبھایا۔ عدی ہونٹوں کی طرح اس کی بات سے جا رہا تھا۔

”کتنی تو تین آ میز اور منجھڑیاں ہیں، میں آپ کے اس انتخاب سے بہت ناراض ہوں۔“ عدی انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا تھا۔

”سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ دوسرے پل عفاف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”کیا میں ایسا لگتا ہوں آپ کو؟“ وہ اچھا خاصا برا مانا چکا تھا۔

”نہیں میں تمہیں ایسا قطعاً نہیں سمجھتی۔ لیکن جس خواہش کا تم نے اظہار کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کوئی غلط انداز سے سامنے آئے اور بات سننے کے بجائے بگڑ جائے۔“ عفاف اس کو تفصیل بتانے لگی۔

”او کے آپ بے فکر ہو۔ عروش کی صرف آواز پسند آتی تھی۔ ایسا کوئی غش نہیں ہوا مجھے۔ اگر می اور بابا جانی کو پسند آئی تو آگے کے مراحل طے ہو جائیں گے۔“ عدی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ہاں میرے خیال میں بھی یہی بہتر ہوگا۔ اس کو ایئر پورٹ سے پک کرنا پڑے گا اور ہو سکتا ہے اسے تمہاری مدد کی ضرورت پڑتی رہا کرے تو ذرا خیال رکھنا۔“ عفاف کی ہدایت پر عدی نے گہرا سانس لیا۔

”اوکے..... مدد کر دیا کروں گا جب جب اسے ضرورت پڑی۔“ عدی کے حامی بھرنے پر عفاف نے مسکرا کر سانس خارج کیا۔

”شکریہ..... عروس کے بھائی نے بابا جانی سے بات کرنی ہوگی۔ میں ان کا نمبر فارورڈ کر دوں گی تو بابا جانی سے کہنا کے کال کر لیں ان کو۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ اور کوئی حکم.....؟“

”ناں بس اتنا ہی کافی ہے.....“ عفاف ہنس کر بولی۔

”بائے دادے..... سالے صاحب کا نام کیا ہے۔“ عدی تہقہ لگاتے ہوئے پوچھنے لگا تو عفاف کو بھی اپنی ہنسی روکنا محال ہو گیا۔

”بہت بدتمیز ہو تم..... مبین نیازی۔“ اس کو تنبیہ کرتے ہوئے عفاف نے اسے نام بتایا۔

”ڈونٹ وری ایسا امپر لیس کریں گے کہ خود ہی اپنی بہن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے۔“ عدی نے کالر جھاڑ کر کہا۔

”زیادہ شوخیان نہ مارو۔ اچھا میں اب فون رکھتی ہوں..... عروس کی سیٹ کنفرم کر کے ساری تفصیلات میج کر دوں گی۔“

”اوکے اللہ حافظ۔“ عفاف نے بھی اللہ حافظ بول کر فون بند کر دیا اور دوسرے پل نجائے کیسی سوچ میں گم ہو گئی۔ اب وہ مسلسل مبین نیازی کے رویے کے بارے میں سوچے جا رہی تھی..... اور ایک بار پھر الجھ چکی تھی۔

☆☆☆☆

”تعلی کو ہاتھ پر رکھ کر مٹھی بند کر لینے سے ہاتھ تو رتکین ہو جاتے ہیں لیکن تعلی مر جاتی ہے..... اور اگر

مٹھی بند نہ کی جائے تو تعلی اڑ جاتی ہے۔ پھر دونوں صورتوں میں اعتدال کا ہونا ضروری ہوتا ہے، کوئی بھی چیز جب اپنی حدیں پھلانگنے لگتی ہے تو وہ ہستی کی جانب قدم بڑھا دیتی ہے۔“

”ہاں لیکن محبت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔“

پرزور لہجہ ایک ضد لیے ہوئے تھا۔

”کوئی بھی جذبہ ضرورت سے کم یا زیادہ ہو جب وہ حدود تجاوز کرنے لگے تو نقصان دہ ثابت ہوتا ہے پھر چاہے وہ جذبہ ”محبت“ ہی کیوں نہ ہو۔“

”آئی ابجیکٹ یور اونر..... محبت میں کیسی حدیں؟ محبت میں کون سی پابندیاں؟ محبت میں متحاسن اس کو کڑواہٹ میں کیسے بدل سکتی ہے؟“ م۔

ح۔ ب۔ ت۔ ”محض چار حروف کو باہم کرنے سے محبت کا وجود نہیں بنتا۔ یہ حروف اپنے اندر پوری کائنات سمیٹے ہوئے ہیں۔ جب آپ اس چار حرفی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں سے واپسی کے سارے دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔ پھر

وہاں حدیں کیسی؟ پابندیاں کیسی؟ محبت جب ہو جاتی ہے آپ کے دل میں اتر جاتی ہے پھر وہ بھی قسم نہیں ہوتی۔ اس کی راہ کسی ہی پر خراب ہو، ان پگڈنڈیوں پر چلتے پاؤں لبو لہان ہو جائیں، کڑکتی دھوپ میں چلنا پڑے یا صحراؤں کی تپتی ریت پر، ان جذبول کی تلی ت مرنی ہے نہ اڑتی ہے۔“ اس کا جوش قابل دید تھا۔

”جذبول کی تلی کو دیوبچ لینے سے وہ مر جاتی ہے۔ اور پھنسی کھلی رکھنے سے تپتی دامن مقدر بن جاتے ہیں۔“ ایک مخصوص ٹھہرا ہوا، فسوں خیز انداز اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوتا۔“ وہ زیر لب بولی۔

”جذبے بھی حد بندی کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہاں بھی..... جذبول کی دنیا میں بھی حدود کا نظام چلتا ہے..... جہاں پر بندوٹا سمجھو سب کچھ بہہ گیا۔“

”لیکن..... محبت میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔“ اس کے انداز میں اب ایک جھنجھلاہٹ

آئی تھی۔

”جب جذبے اپنی حدیں پار کرنے لگتے ہیں تو ان کے حصے میں سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں آتا۔“ کوئی بھی جذبہ ضرورت سے کم ہو یا حد سے زیادہ، وہ ڈمگمانے لگتا ہے۔ پھر چاہے وہ جذبہ محبت ہو، بگائیگی..... یا پھر نفرت یا التعلق..... جب اس کا توازن کھو جائے تو جذبول کی تلی پھڑ پھڑا کر دم توڑ دیتی ہے یا پھر اڑ جاتی ہے اور ہاتھ آتے ہیں تو خسارے..... پچھتاوے اور..... رت جگے۔“ وہی دلکش انداز، وہی دلربا لہجہ وہ چاہنے کے باوجود کسی بات سے اختلاف نہ کر سکی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا..... نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ پھر منمنائی۔

”دل آویز..... تم بہت جذباتی ہو۔ اس لیے تمہیں لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ آگے راؤنڈ اپاؤٹ ہے تو ذرا دھیان رکھنا۔“

مائی اب ایک ڈرائیونگ انسٹرکٹر نہیں، ایک دوست کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ اور زیر بحث محبت تھی۔ جذبے تھے۔ دل آویز کی اپنی دلیلیں، مائی کی اپنی سوچ..... جس سے دل آویز کو اختلاف تھا۔ لیکن اس کا انداز، اس کے الفاظ، اس کا لہجہ ایسا سحر انگیز تھا کہ دل آویز اس کی کبھی ہر اک بات، ہر اک دلیل سے اختلاف رکھنے کے باوجود خاموش ہو گئی۔ اور اب دھیان ڈرائیونگ کی طرف تھا۔

”روڈ سائن اس لیے ہوتے ہیں تاکہ ان کو پڑھا جائے، ان پر لکھی گئی ہدایات ہمارے لیے ہوتی ہیں کہ ہم راستہ نہ بھول جائیں، ایک سائن مس ہو گیا تو میلوں کے فاصلے درمیان میں آ جاتے ہیں۔ گھبراہٹ میں دل آویز نے غلط طرف گاڑی موڑ دی تھی۔ اور اب جو رستہ پانچ منٹ میں طے ہونا تھا وہ گھٹنے میں ہوتا۔ اب اس کو واپسی کے لیے ایک دوسرے روٹ کا سہارا لینا تھا۔ مائی ایک بار پھر گاڑی کا سارا کنٹرول سنبھالنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور دل آویز ایک بار پھر اس کی قربت میں خود کو سنبھالنے میں

لگی تھی۔

”ویسے تم نے آج ڈرائیونگ اچھی کی ہے۔“ بالاخر وہ نارل ڈرائیونگ میں لوٹ آئی تھی اور اب وہ سیدھے رستے پر مکمل اپنے بل بوتے پر ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

”آپ ایک دوست بن کر سکھائیں گے تو میں جلدی سیکھ جاؤں گی۔“ دل آویز اپنی مخصوص چٹکتی آواز میں بولی۔

”اب تمہیں زیادہ پریکٹس راؤنڈ اپاؤٹ میں کرنی ہے۔ مینورز بھی تقریباً سارے کور ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی اور پریکٹس کی ضرورت ہے۔“ مائی نے ایک بار پھر کہا۔ اب دل آویز مکمل خاموش تھی۔

ایک دو بار مائی کو بریک پڈل پریس کرنا پڑا تھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں..... دل آویز کچھ دیر پہلے محبت کی حدود کی دلیلیوں کو فراموش کیے نہ صرف گاڑی کو آگے بڑھا رہی تھی بلکہ مائی کے لیے اپنے دل میں محبت کے گیزرز کو بھی ہائی لیول پر لے کر جا۔ نہ تھی۔

”لیکن محبت تو محبت ہے نا؟ اس میں حدیں کیسی؟ عمروں کا حساب کیا؟“ وہ زیر لب بڑبڑاتی..... اور مسکراتی نظروں سے مائی کو دیکھا۔ وہ متوجہ نہ تھا لیکن سب خبریں اسے۔

”اسپیڈ پر دھیان دو..... آگے ٹریفک لائٹس ہیں۔“ اس کی طرف دیکھے بنا وہ جانتا تھا کہ اس کا دھیان کہاں ہے۔

”اوکے باس.....“ وہ ایک بار پھر کھلکھلائی..... تو مائی بھی مسکرا دیا..... بے اختیار..... بلا ارادہ۔

”کیا محبت عمروں کے فرق کی پابند ہوتی ہے؟“

”تم ہمیشہ محبت پر کیوں بات کرتی ہو.....؟“ مائی نے اس کے پر جوش انداز کو دیکھ کر پوچھا۔

”سوال کے جواب میں سوال کرنا اصولاً جرم ہے اور اس کی سزا بھی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہماری نئی نئی دوستی ہے اس لیے یہ پہلا جرم معاف.....“ اس کے انداز میں شوخیان تھیں۔ شرارت تھی اور شاید بے پناہ

محبت بھی۔ مانی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا تھا۔

”واہ! تم تو بہت ہی مہمی ہو۔“

”ایسی ویسی..... ابھی تو آپ مجھے جانتے ہی کہاں ہو.....“ دل آویز، شاہانہ انداز میں گیتز بدلتے ہوئے بولی۔

”دھیان سے، دھیان سے..... سائیکل سوار ہے۔“ دل آویز ہوا نہ گڈی کو سائیکل لائن کی طرف لے گئی تھی۔ اس نے بائیں طرف کا شیشہ نہیں دیکھا۔ اور یک لخت آگے والی گاڑی نے بریک لگائی تو اسے بھی ایمر جی بریک لگانی پڑی جس کی وجہ سے سائیکل سوار لڑکھڑا کر بمشکل سنبھلا تھا۔

مانی نے تیزی سے کہا۔ تو دل آویز جو پچھلے چالیس منٹس سے آرام سے ڈرائیو کر رہی تھی ایک بار پھر مانی کے بل بوتے ہو گئی۔ دل آویز کی ایک کمزوری تھی۔ اگر اس کو ایک غلطی پر سختی سے تنبیہ کی جاتی تو وہ پھر غلطیوں پر غلطیاں کیے ہی جاتی ہے۔ ٹوک دینا اور وہ بھی قدرے سخت لہجے میں اس کے اعتماد کو صفر پر لے جاتا تھا۔ اور مانی اس کی اس کمزوری سے واقف تھا۔ اگر اس پل مانی ٹوکتا نہ تو سائیکل سوار لڑکھڑاتا نہ دل آویز کا اعتماد ڈگمگاتا۔ لیکن اس لمحے یہ ضروری تھا۔ محبت سے بچنا ضروری تھا۔ اس کے سوال کو یوں ہی درگزر کرنا ممکن نہ تھا..... تو ایک چال تو چلتی ہی تھی..... اور وہ بے جنگ میں تو سب جائز ہوتا ہے ناں..... مانی نے دل آویز کے گھبرائے تاثرات کو دیکھ کر لب بھینچ کر مسکراہٹ روکی اور اب وہ اس کو حوصلہ دے رہا تھا۔ اس کا اعتماد بحال کر رہا تھا..... اپنے مخصوص انداز میں اپنے دلکش و دلنشین لب و لہجے میں..... اور دل آویز..... محبت تو محبت ہے، محبت میں حساب کیسا؟ عمروں کا تضاد کیسا؟ محبت تو محبت ہے..... کی رٹ لگاتے اس سے ”ڈرائیونگ“ سیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

”پلیز اسٹاپ دس نان سنس..... میں انٹر سٹڈ نہیں ہوں۔“

”میں کوئی آوارہ قسم کا لڑکا نہیں ہوں۔ اچھے

خاندان سے ہوں، ویل ایجوکیٹڈ ہوں۔ محبت کوئی جرم نہیں ہے۔ اور کسی کا اچھا لگ جانا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا.....“ وقتاً فوقتاً میجر کے بعد آج وہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

”لیکن کسی کو محبت کے لیے مجبور کرنا، زچ کرنا ایک جرم ہے۔“ وہ جھنجھلائی تھی۔ ایک تو پہلے ہی اس کے وقت بے وقت میجر سے تنگ تھی۔ اب یک دم محبت.....

”محبت کے بدلے محبت کی خواہش کرنا جرم نہیں ہے۔“ وہ اپنی بات پر ڈٹ چکا تھا۔ جو بات وہ پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں کہتا رہا تھا اب دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

”لیکن اگر دوسرے کے دل میں ایسی خواہش نہ ہو تو اس کو مجبور کرنا تنگ کرنا جرم ہے۔ پلیز ڈونٹ فالو می..... یہاں مت آیا کریں۔ محبت یک طرفہ فیصلہ نہیں ہوتا۔ ایک عہد ہوتا ہے جو دو دلوں کو باندھتا ہے۔ ایک اقرار ہوتا ہے جو بنا کر نبھایا جاتا ہے۔ دو دلوں کی دھڑکنوں کو ملانے کا نام محبت ہوتا ہے..... محبت زبردستی کے سودے نہیں ہوتے مسٹر مبین۔ پلیز! آپ یہ راگ الاپنا بند کر دیں۔“ دل آویز کا لہجہ انتہائی ترش تھا، انداز میں ایک کاٹ تھی۔ لیکن مبین نیازی میں ایک اور گن بھی تھا کہ وہ جب تک ہار نہیں مانتا تھا جب تک امید کی ساری شمعیں بجھ نہ جائیں۔

”محبت میرے لیے کپلسری بھجکت کبھی بھی نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ انڈر سٹینڈنگ کو اہمیت دی ہے اور پہلی نظر یا یک طرفہ محبت..... مبین نیازی کا انداز نہیں تھا..... بھجکتی شام میں میری زندگی میں تمہاری آمد نے میرے سارے اصول توڑ دیے۔ میں محبت میں کبھی بھی جلد بازی کا قائل نہیں تھا۔ لیکن دل آویز تم نے لمحوں میں فیصلہ کروا دیا..... کہ مبین نیازی کو پہلی نظر میں جو ہوا ہے..... وہ محبت ہے۔“ مبین نیازی نے ایک نظر اس کو دیکھ کر انتہائی گہیرے لہجے میں ایک وار کیا تھا۔ دل آویز نے حیرانی سے اسے

دیکھا۔ ایک پل میں اس نے ”آپ سے تم“ کا فاصلہ منادیا تھا۔ جوں آویز کو انتہائی ناگوار گزرا۔

”نان سنس.....“ دل آویز نے رخ موڑ کر زیر لب کہا۔

”کیا میرے چہرے سے لگتا ہے کہ میں محبت کے نام پر فراڈ کروں گا؟“ مبین نیازی اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

”مجھے چہرے پر ہنسنے نہیں آتے.....“ دل آویز نے اکتاہٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”محبت پر یقین نہ رکھنے کے باوجود میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں دل آویز کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ مبین نیازی کا یوں سر راہ دو ٹوک اقرار، دل آویز کو انتہائی ناگوار گزرا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

”مسٹر مبین..... مجھے آپ کی اس بے یقین محبت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پلیز آپ میرے راستے میں نہ آیا کریں۔“ دل آویز اب سچ معنوں میں عاجز آ چکی تھی۔ اور اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس سے لفٹ لی تھی۔ جب انتہائی بے اختیاری میں اس کو اپنا نمبر دے دیا تھا۔ مبین نیازی نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

”میری محبت بے یقینی کی لپیٹ میں نہیں ہے۔ اگر مجھے رتی بھر بھی شک ہوتا تو اس پل یہاں نہ ہوتا..... خیر میرے لیے اپنے جذباتوں پر بھروسہ اور صداقت میرے نزدیک محبت کا اصول ہے۔ محبت غیر مشروط ہوتی ہے..... اور میں محبت میں سودے بازی کا قائل ہوں بھی نہیں۔ میں محبت کے بدلے محبت کا قائل نہیں محبت میں سچائی میری اولین ترجیح ہے۔“

”آئی ایم سوری مسٹر مبین..... شاید آپ کی محبت میرے لیے نہیں ہے۔ مجھے دل توڑنے سے ڈر لگتا ہے۔ ٹوٹنے دل کی آہ سے خوف آتا ہے مجھے..... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں.....“

”میں محبت میں سودے بازی کا قائل نہیں ہوں۔“ اس کی آواز میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا کہ مبین

اپنے الفاظ دہرانے پر مجبور ہو گیا۔

”نہ میرا دل ٹوٹا ہے نہ کوئی آنکلی ہے۔“ مبین مزید گویا ہوا تو دل آویز نے متغیر نظروں سے اس کے پرسکون چہرے کو دیکھا۔

”سی یوسون.....“ مبین نیازی اس کی حیرت کو نظر انداز کرتا وہاں سے پلٹا تھا۔

”مجھے خوش ہوگی اگر آپ دوبارہ میرے رستے میں نہ آئیں تو.....“ اس کے بڑھتے قدم پل بھر رکے۔ ایک نظر اسے دیکھا اور گہری مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا اور وہ دوبارہ پلٹ گیا۔

”شکر ہے جان چھوٹی.....“ دل آویز بڑبڑائی اور چلتی ہوئی اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی۔

”یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا..... دل آویز..... یہ محبت..... میرے بس میں نہیں۔“ مبین نیازی نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

☆☆☆

”اسلام علیکم..... مبین نیازی بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کر تے ہی مبین نے انتہائی محنت اور بردباری سے اپنا تعارف کروایا۔

”علیکم اسلام..... میں عدی بول رہا ہوں۔ کیسے ہیں مبین بھائی۔“ عدی نے بھی اپنے مخصوص دوستانہ انداز میں اپنا تعارف کروایا اور ساتھ ہی اس کا حال بھی پوچھا۔

”الحمد للہ..... کرم ہے اللہ کا۔ آپ لوگ سب کیسے ہیں۔ سوری کچھ مصروفیت کی وجہ سے کال میں ہو گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ نے آپ کی کال کا بتایا تھا تو بابا جانی کہنے لگے کہ وہ خود ہی کال کر کے آپ کی ابھن دور کر دیں گے۔ اس لیے آپ کے ٹائم کا اندازہ نہ تھا لیکن..... اس ڈنٹ میٹر مبین بھائی۔ ہم نے آپ کی معذرت قبول کر لی ہے اب آپ بھی سب بھول بھال کر ہمیں خدمت کا موقع دیں۔“ عدی نے ہنستے ہوئے کہا تو مبین بھی مسکرانے لگا۔

”واہ یا تم تو ہم مزاج لگتے ہو.....“ مبین نے

مکراتے لہجے میں کہا۔

”ہم مزاج؟ آپ کا.....؟“ عذی نے انتہائی حیرت سے اس سے استفسار کیا۔

”کیا تمہیں میری خوش مزاجی پر شک ہے؟“

”آپ نے کہا تھا آپ بہت..... سنجیدہ مزاج انسان ہیں.....“ عذی کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ

”اچھا، اپنے بابا جانی سے بات کروادو..... لیکن پہلے نام بتاؤ ان کا۔“ ”مبین نیازی کے دل ہی دل میں عفاف کو حتمی نظروں سے دیکھا تھا۔

”اسن ندیم..... اور یہ کیسے بات کریں۔“

”اسلام علیکم بیٹا! کیسے ہیں؟“ اسن ندیم نے موبائل کان سے لگاتے ہی پر جوش لہجے میں کہا۔

”وعلیکم اسلام، الحمد للہ آپ سنا میں کیسے ہیں؟“ ”مبین نیازی اب مکمل طور پر سنجیدہ روپ دھار چکا تھا۔

”جی بیٹا میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنا؟“ عروش بیٹی کیسی ہے اور میری عفاف کیسی ہے؟“

اسن ندیم نے عروش اور عفاف دونوں کا ایک ساتھ پوچھا۔

”جی اکل دونوں ٹھیک ہیں۔“ ”مبین نیازی نے گہرا سانس لیا۔

”بیٹا عفاف نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ عروش کی رہائش کے لیے بالکل بھی فکر مند نہ ہو۔

یہ اس کا اپنا گھر ہے اور اب بالکل بے فکر ہو کر اسے چھوڑ دو۔ ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ اسن ندیم نے ایک ذمہ دار انسان کا فرض بخوبی ادا کیا۔

”بہت شکریہ اٹکل۔ پہلی دفعہ ایسی جارتی ہے اس لیے ذرا فکر ہو رہی ہے۔“ ”مبین نیازی ان سے امپر لیس ہوئے تھے۔ ان کا اخلاق، لب و لہجہ واقعی پر خلوص تھا۔

”بیٹا! بالکل فکر نہ کرو۔ ہم یہی سمجھیں گے بلکہ سچ بھی یہی ہے عفاف کی کمی پوری ہو جائے گی۔“

اسن ندیم کے لہجے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ عفاف کو کتنا یاد کر رہے ہیں۔

”بہت شکریہ اٹکل۔ آپ نے میری آدمی ٹینشن دور کر دی ہے۔ عروش کی ٹکٹ آج کنفرم ہو جائے گی تو آپ کو اطلاع دے دوں گا۔ تھوڑی نادان

ہے اور لاڈلی بھی اگر کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے اس سے تو دور گزر کر دیکھیں گے۔“ ”مبین کے لہجے میں بہن کے لیے فکر اور پیار نے اسن ندیم کو اس کا گرویدہ کر دیا۔

”بیٹا! میں نے کہا تھا یہ اس کا اپنا گھر ہے اور بیٹیاں باپ کے گھر کو تباہیاں نہیں کریں گی تو کہاں کریں گی؟ بے فکر ہو.....“ اسن ندیم ویسے بھی نہایت شفیق انسان تھے اور پھر عفاف کی وجہ سے بھی ان کو ہر پہلو کا دھیان رکھنا تھا۔

”آپ کا بڑا این ہے اٹکل۔ ان شاء اللہ اب رابطہ رہے گا۔“ ”مبین صحیح معنوں میں ان کی خلوص نیت سے قائل ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! عفاف کو بھی کہا ہے کہ آجائے لیکن..... ہر حال بیٹا..... اپنا خیال رکھنا اور

بے فکر ہو کر عروش کو بھیجو.....“ اسن ندیم کچھ کہتے کہتے رکتے تو مبین ٹھٹک کر رہ گیا۔

”اللہ حافظ.....“

”اللہ نگہبان بیٹا.....“ ”رہی کلمات کے بعد فون بند ہو گیا لیکن مبین کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

”دادو کہاں ہیں آپ؟“ عروش نے سفینہ کے کمرے میں جھانکا لیکن وہ اس کو کہیں دکھائی نہ دیں تو

ان کو آواز دے کر وہ پوچھنے لگی۔

”ہاں بیٹا میں یہاں ہی ہوں۔“ سفینہ اپنے کمرے میں بے اسٹور روم سے مخاطب ہوئیں۔ تو

عروش اب اندر بڑھ گئی۔

پاس آکھڑی ہوئی اور منہ سر کر بولی۔

”چڑا جتنا دل ہے لیکن خواہش، باز کی پرواز کی۔“

سفینہ نے محبت باش نظروں سے اسے دیکھا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے دادو..... مجھے تو آپ اور لالہ کی فکر ہو رہی ہے۔“ عروش دلا رے ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔

”کیوں ہم کوئی دودھ پیتے بچے ہیں کیا؟“

سفینہ نے معنوی خطن سے اسے گھورا۔

”آپ دودھ پیتے بچے نہیں لیکن میں تو ہوں نا.....“ عروش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا دادو ایک بات میرے ذہن میں کافی عرصے سے پھل چا رہی ہے لیکن میں نے ہمیشہ دبا

کر رکھی۔“ عروش نے تمہید باندھی تو سفینہ نے قدرے جراتی سے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”کیا آپ کو کہیں لگتا کہ“ ”مبین مینشن“ کو ایک بہو کی ضرورت ہے۔“ عروش نے پر جوش انداز میں

کہا۔

”آپ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور میں بھی آج تو پڑھیں جارہی ہوں کل کلاں کو پیادیں بھی جانا

پڑ سکتا ہے تو کون ہوگا جو سنبھالے گا یہ سب.....؟“

عروش نے ان کو چھینرے ہوئے کہا۔

”پہلی بات کے بڑھی ہو گی تیری دادی..... میں تو ابھی جوان ہوں.....“ سفینہ نے

ایک خاص اداسے کہا تو عروش ہلکھلا کر ہنس دی۔

”ہاں بہو کی تو شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن تمہارا لالہ، بہو کے ذکر پر ایسے بدکتا ہے جیسے خدا

تا خواست اس کے قتل کے منصوبے بنانے کی بات کی ہو۔“ سفینہ نے منہ بنا کر اسے بتایا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ لالہ کی تو

عادت ہی ایسی ہے۔ لیکن اب ہمیں کوئی قدم اٹھانا ہو

گا۔“ عروش نے سفینہ کی طرف دیکھ کر مبین کی طرف

داری بھی کی اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

”دادو آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے کیا؟“

عروش نے سفینہ سے پوچھا۔

”نظر میں تو نہیں لیکن ایک لڑکی مجھے اچھی ضرور لگی ہے۔“ سفینہ نے جھپکتے ہوئے کہا۔

”کون؟“ عروش نے ابرو اچکا کر انہیں دیکھا۔

”عفاف.....“ سفینہ نے مدھم آواز میں کہا۔

”واہ..... واہ، دادو..... زبردست دل کی بات اور منہ کے الفاظ جھین لیے آپ نے..... میرا بھی یہی

ارادہ ہے کہ عفاف کو اپنی بھابھی بنالوں۔“

”ہاں لیکن مبین راضی ہو، تب ناں..... اور عفاف؟ کیا وہ راضی ہوگی؟ کہیں اس کا رشتہ کہیں طے

نہ ہو چکا ہو۔“

”ویل اس کی ٹینشن مت لیں۔ اس کا رشتہ طے ہوا ہی نہیں ابھی اور اگر ہو بھی گیا ہوتا تو تروادیتے۔“

عروش آنکھ دبا کر شریر انداز میں بولی۔

”ہائے ہائے باولی ہوئی ہو کیا۔ میرے مبین کو کیا رشتوں کی کمی ہے جو کسی کا رشتہ تڑوا کر کرے..... تو

پہلے عفاف سے کنفرم کر، اسے راضی کر دو پھر مبین سے بات کرتے ہیں۔“ سفینہ نے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایسے ٹھیک رہے گا۔“ عروش نے حامی بھری۔

”اچھی ملنسار لڑکی ہے اور خوش اخلاق ہے خواہ

تو وہ کاغذ نہیں تو مبین کے ساتھ اچھی رہے گی۔ لڑکی میں صبر و تحمل اور برداشت کافی زیادہ مقدار میں ہونا

چاہیے۔ تاکہ جب بھی ضرورت پڑے تو وہ با آسانی استعمال کر سکے۔ یوں ہی دلوں کو جیتا جاتا ہے۔ صبر

سے اور برداشت سے۔“ سفینہ نے عفاف کی تعریف کرتے ہوئے اسے بھی لہجھکتی کی۔

”دادو میں تو یو کے جارتی ہوں ناں۔ پلان یوں ہے کہ آپ عفاف کو زیادہ سے زیادہ توجہ دیں اس کو یہاں بلانی رہیں اور پھر موقع دیکھتے ہی اس سے بات کر لیں۔ لالہ کو راضی کرنا میرا کام..... ان کو کسی طرح سے بلیک میل کر کے راضی کرنا پڑے گا کیونکہ وہ

ذرا میڈھی شے ہیں تو ہمیں بھی انکی میڈھی ہی کر کے کھی

ٹکانا پڑے گا.....“ عروش نے راز درانہ انداز میں

سفینہ کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے زنجو

نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ہنسنے لگیں۔
 ”دادو بی سرلیں.....“ عروش نے نیکی نظروں سے انہیں دیکھا۔
 ”زبردست پلاننگ کی ہے لیکن پکڑی گئی تو میرا نام نہ لینا۔“ مبین کیا سوچے گا کہ دادو نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ سفینہ اپنی ہلکی کنٹرول کرتے ہوئے مصنوعی آنسوؤں کے ساتھ بولیں۔
 ”او کم آن دادو! محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے..... اور آپ فکر نہ کریں ہم سبھی بھی پکڑے نہیں جائیں گے۔“ عروش نے مسکرا کر کہا اور کارل جھاڑ کر شوخی بگھاری اور ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اور ہاں.....“ وہ کچھ یاد آنے پر جاتے جاتے پلٹی تو سفینہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”کل عفاف آرہی ہے۔ میں نے انوائٹ کیا ہے۔ میری پینک میں بھی مدد کر دے گی اور ہم کھانا بھی ساتھ کھائیں گے۔“ عروش نے سفینہ کو عفاف کے آنے کا بتایا..... تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور عروش باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اس میں جانے کیسی کشش تھی کہ اس کی طرف بڑھنے کا کچھ آدم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔
 ”تم ایک جھوٹے انسان ہو مبین نیازی.....“ اپنے سارے دعووں کو بھلا دیا۔ سارے اصول توڑ دیے..... یہاں تک کہ اپنی ”مردانگی“ بھی داؤ پر لگا دی مبین نیازی۔ وہ بھی صرف ایک لڑکی کی خاطر؟ مبین نیازی..... ابھی بھی وقت ہے یہ جی عروالی بے وقوفیاں چھوڑ دو۔“

”ہاہاہاہا..... کچی عمر کی محبت، کچی عمر کی بے وقوفیاں..... محبت چھوڑی نہیں جاسکتی اور محبت۔ کچی عمر کی بے وقوفی نہیں ہوتی۔ میری محبت کچی عمر کی پنہ محبت ہے۔“ مبین نیازی اپنے انداز میں بازو پھیلا کر فخریہ انداز میں بولا۔

”پنہ نہیں یک طرفہ.....“ تسخرانہ قہقہہ نہایت پر زور تھا۔

”محبت میں پختگی ہو تو یک طرفہ محبت، دو طرفہ محبت میں بدل ہی جاتی ہے..... دیر، سویر تو ہوتی ہی رہتی ہے۔“ مبین نیازی اتر آیا تھا۔
 ”وہ جانتی ہے کہ یہ محبت میرے بس میں نہیں۔ یہ بے قرار ہاں..... میری پہنچ سے دور ہیں۔“ وہ لب بھینچ کر شریر مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔
 ”گھانے کا سودا ہے۔“ ایک آواز پھر ابھری۔
 ”محبت کا سودا کبھی گھانے کا سودا نہیں ہوتا۔“
 ”تو تم نے اب سودا کرنے کی ٹھان لی؟“
 حاضر جوانی پر مبین نیازی چونکا تھا۔
 ”نہیں میں..... خیر..... آئی ایم گیٹک لیٹ.....“ مبین نیازی نے آخری نظر اپنے سراپا پر ڈالی اور مطمئن انداز میں دیکھا۔ ڈیپ گرین کارل شرٹ، بلیک جینز، بکھرے بال، بڑی شیو، ابھی سبھی یہ لک مبین نیازی کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ اسی آدمی احووری تیاری کے ساتھ وہ ایک بار پھر محبت کی تلاش میں رخت سفر باندھ رہا تھا۔
 ”دل میسر اور موجود سے بہلتا نہیں کوئی تو ہو جو میری دسترس سے باہر ہو“
 وہ زیر لب بڑبڑایا اور گرین ٹینڈر گلاسز اٹھا کر پہن لی۔ جو اس لمحے اس کی پرستائی کو مزید نکھار رہی تھیں۔
 ”مبین نیازی ایک بار پھر سوچ لو..... وہ تمہیں ٹھکرا چکی ہے۔“ ایک آواز پر اس کے قدم رک گئے۔
 ”اب سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔“ وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولتا باہر نکل گیا۔
 ”سہانہ سفر اور یہ موسم..... کاش کہ حسین ہو جائے۔“ ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے گہرے بادلوں کو دیکھا اور پھر ایک خیال..... خیال محبت کے سحر میں گرفتار ہونے لگا۔ اور پھر گاڑی اٹلی روڈ کی طرف موڑ دی۔
 ”کاش ایک حسین اتفاق ہو جائے۔“ سی ڈی پلیر آن کر کے سیٹ کو ریلیکس کر کے وہ سوچنے لگا۔
 ”تیری امید، تیرا انتظار کرتے ہیں

اے صنم ہم تو صرف تم سے پیار کرتے ہیں“
 ”ڈیوانہ.....“ وہ زیر لب بولا اور پھر اپنی اس ”ٹین انج“ حرکت پر خود ہی ہنس دیا۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ کارڈرائیو کر رہا تھا ایک بس اس کے آگے جا رہی تھی بس اسٹاپ پر رکی۔
 بس سے سواریاں اتریں اور مبین اپنی گاڑی میں بیٹھا بس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔
 ”حسین اتفاق.....؟ او مائی گاڈ.....“ جیسے ہی اس نے رائٹ انڈیکسٹر آن کیا اور گاڑی سو روکنے لگا اسی لمحے وہ بس سے باہر نکلی۔ ایک لمحہ، ایک نظر..... مبین نیازی کو زندگی کی نوید دے گیا۔ وہ امید، وہ انتظار..... ایک بل میں ہی قیمتی ہو گئے۔ اس نے انڈیکسٹر آف کر کے بس کے جانے کا انتظار کیا۔ لیکن نظریں اسی پر جمی تھیں۔
 ”ایکسیکوزی دل.....“ وہ فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ کہ اس نے گاڑی کو روڈ کے درمیان روک کر شیشہ نیچے کر کے اس کو پکارا۔ دل آویز نے چونک کر دیکھا اور اگلے لمحے انتہائی ناگواری سے رخ موڑ کر پھر چلنے لگی۔
 ”ایکسیکوزی، ایکسیکوزی.....“ کچھ دیر میں مبین گاڑی پارک کر کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور چہرے پر جھیل دلتیشن مسکراہٹ کو مزید گہرا کر کے اس کو مخاطب کرنے لگا۔ دل آویز نے اسے دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں چھائی ناگواری مبین نیازی سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔
 ”میں نے کہا تھا میرے پیچھے نہ آنا۔“ وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔
 ”یہ محبت میرے بس میں نہیں ہے۔“ مبین نیازی کے لب و لہجے میں ایک بے بسی جھلک رہی تھی۔
 ”افف او..... نو..... ناٹ اگیں۔“ دل آویز نے اکتا کر کہا۔
 ”پلیز اسٹاپ دس۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ کی اس بے بسی محبت میں۔“ دل آویز کا دل کسی

طرح بھی نہ پسند۔
 ”یہ محبت بے بس نہیں ہے۔ تم ایک بار اس کے متعلق سوچو تو.....“ مبین نیازی کے لہجے میں ایک التجا تھی۔
 ”مجھے نہیں سوچنا.....“ وہ ایک بار پھر بگڑ کر بولی۔
 ”کیوں؟“ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”دیکھیں مسٹر مبین۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ یوں سر راہ لڑکی کو روک کر اس سے اظہار محبت کرنا اور یہ توقع رکھنا کہ وہ آپ کی حوصلہ افزائی کرے۔ کیا آپ اسے صحیح سمجھ رہے ہیں؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یوں میرا رستہ روک کر آپ میرے دل میں اپنے لیے کسی قسم کی کوئی احساس جگا سکتے ہیں۔“
 ”مجھے بھی آپ کی طرح یہ سب پسند نہیں ہے۔ دل میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ مبین نیازی نے تو وہ کہہ دیا جس کا اس نے خود بھی ابھی سوچا نہ تھا۔ اپنی بات ختم کر کے وہ خود بھی حیران رہ گیا۔
 ”واٹ؟ مسٹر مبین..... آپ ہوش میں ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اور نیسٹ ٹائم اگر آپ نے میرا پیچھا کیا تو میں پولیس کو کال کروں گی۔ دیکھنے میں آپ جتنے ڈینٹ لگتے ہیں اس سے کہیں زیادہ چھپچھوری حرکتیں ہیں آپ کی..... آج کے بعد سو فٹ کے فاصلے پر ہٹاؤ۔“ ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔“
 دل آویز کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اور مبین نیازی صحیح معنوں میں شرمسار تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے بولا تھا۔ اور اب خود کو، اپنی محبت کو اس کی جھنجھلاہٹ اور نفرت سے بچانا اسے انتہائی ٹھن لگ رہا تھا۔
 ”آئی ایم سوری..... دل میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ مجھے واقعی آپ اچھی لگتی ہیں۔ محبت کرتا ہوں میں آپ سے..... میں سچ کہہ رہا ہوں دل میں نے.....“

نہیں تھا۔ آپ کو دیکھتے ہی میں.....

”میں نے دل“ کہنے کا حق نہیں دیا اور اب بہتر یہی ہے کہ جاؤ یہاں سے..... دیکھ لی آپ کی محبت اور کرلیا یقین..... فارگا ڈسک۔ اب جاؤ یہاں سے اور دوبارہ نظر نہ آنا..... دل آویز نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر انتہائی ترش لہجہ میں کہا اور اس کو یوں ہی جبرانی، فحش کے ساتھ چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ مبین نیازی کو پہلی نظر کی پہلی محبت کی پہلی چوٹ نے ایک دم ہی غم حال کر دیا تھا۔

”یہ محبت میرے بس میں نہیں ہے دل..... میں راستے میں نہیں آؤں گا۔ لیکن میں..... مبین نیازی اپنی محبت کی صداقت کی قسم کھاتا ہوں۔ کے انہی راستوں پر ایک دن تم میرے ہم قدم ہو گی دل..... میرے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ ہو گا اور تمہاری دھڑکنیں میرے نام کی مالا بنیں گی۔ ہاں میں اب تمہارے سامنے نہیں آؤں گا دل لیکن تمہیں دیکھنا چھوڑ دوں یہ میرے اختیار میں نہیں..... تمہیں مانگوں نہ، میں ایسی محبت نہیں کرتا..... میں نے تمہیں ”دل“ کہا ہے دل۔ تو تمہارے بغیر جی لوں..... میں یہ ہو نہیں سکتا..... رب را کھا.....“ مبین نیازی گاڑی میں بیٹھا اس کو بیچ سینڈ کرنے لگا تھا۔

”اور ایک بات اور دل..... آخری بات..... تم میرا نمبر بلاک نہیں کرو گی“ بیچ بیچنے کے بعد مبین نیازی نے ایک تاکید کرنا ضروری سمجھا اور وہاں سے چلا گیا..... وہ نہیں جانتا تھا کہ دل آویز کا کیا رد عمل تھا کیونکہ اس نے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا..... کتنے دن یوں ہی گزر گئے..... اور پھر دن گزرتے چلے گئے..... مبین نیازی انہی راستوں پر ڈرائیو کرتا رہتا..... کبھی وہ نظر آ جاتی تو کبھی یوں ہی..... خواری مقدور ہو جاتی۔

☆☆☆

”یعنی کے حد ہی ہو گئی ہے۔ اب اس دن نے بھی آتا تھا۔ ایسی خواری بھی قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔“ وہ مسلسل کوفت کا شکار تھا۔ زندگی میں پہلی بار

وہ یوں کسی کے نام کا بورڈ اٹھائے ایئر پورٹ پر کھڑا انتظار کر رہا تھا اور ”کسی“ بھی جب ایک لڑکی ہو تو عدی جیسے الیز اور بے چین روح کے مالک لڑکے کے لیے جھنجھلا نا بقیہ نا ایک لازمی امر تھا۔ عفاف نے اس کو تنگ کرنے کے لیے عروش کی تصویر بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔

”بیٹا آرام سے، ذرا حوصلے سے۔“ ثمن نے اس کو یوں تیوریاں چڑھاتے دیکھ کر بار بار صبر کی تلقین کر رہی تھیں۔

”کئی اٹل رڈ کیس اکتے ہی جانے والے ہیں جنہوں نے مجھے دیکھا ہے۔“ عدی اب غصے میں تھا۔ فلائٹ دیر سے آئی تھی اور عدی اور ثمن ایئر پورٹ پر عروش کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور یہ انتظار عدی کے لیے شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

”کہا جی تھا آپ سے کہ مجھے اس کی تصویر بھیج دو۔“

”بیٹا صبر سے کام لو اب۔ ابھی دس منٹ تک فلائٹ آ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ عفاف نے عروش کو تمہاری تصویر دکھا دی ہو۔“ ثمن نے اس کے جھنجھلائے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اگر ایسی ہی شرمندگی ہو رہی ہے تو دو مجھے یہ بورڈ میں پکڑ لیتی ہوں۔“ ثمن نے اس کو خاموش دیکھ کر ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں کوئی بات نہیں اب..... اور لگتا ہے کہ فلائٹ آ گئی ہے۔“ عدی نے اناؤنس منٹ اسکرین کی طرف دیکھا جہاں پلی آئی اے کے ساتھ اب لینڈ ڈ لکھا ہوا تھا۔

اگلے دس منٹ تک مسافر آنا شروع ہو گئے تھے اور اپنے اپنے پیاروں کو دیکھ کر دودر سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ثمن نے عدی کو دیکھا جواب عروش کے نام کا بورڈ اٹھا کر تھوڑا آگے بڑھا تھا۔ ثمن بھی آگے بڑھیں۔

”ثمن آنی.....؟“ کچھ دیر بعد ایک لڑکی نے عدی کے ہاتھ میں پکڑے بورڈ کو نظر انداز کر کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر ثمن

کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

”عروش.....؟“ ثمن نے دیکھا اور سوالیہ نظریں اس پر جمائیں۔

”جی آنی عروش نیازی۔“ عروش نے ثمن کی تصویر ان کے سامنے کی۔ جو عفاف نے اسے دی تھی کہ اس کو پہچاننے میں آسانی ہوگی۔ اس ساری پہچان کے دوران عدی کا پارا ہائی ہو چکا تھا۔ جو پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے نام کا بورڈ اٹھائے کھڑا تھا لیکن اس نے تو اس کو مکمل نظر انداز کر دیا تھا۔ عدی نے دوسرے پل کا بورڈ کو پھاڑ دیا۔ تو عروش متوجہ ہوئی..... ثمن نے شرمیلیں نظروں سے اسے دیکھا۔

”بیٹا یہ عدی ہے۔ عفاف کا بھائی.....“ ثمن نے پھولے منہ والے عدی کا تعارف کروایا۔ عروش نے دیکھا وہ اس لمبے منہ سے ایک معصوم سالک کا لگا۔ عروش کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔ تو یک دم ہی عدی نے منہ موڑ کر گویا ناراضی کا بھرپور اظہار کیا۔

”بیٹا تم نے عدی کے ہاتھ میں بورڈ نہیں دیکھا ناں۔ بہت سے جاننے والے اس سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کس کے نام کا بورڈ اٹھا کر کھوم رہے ہو۔“ عدی مکمل خاموش تھا۔ ثمن نے گاڑی میں بیٹھ کر عروش کو عدی کے خاموش رویے کی وضاحت دی۔

”اس لیے اس کا موڈ آف ہے۔“ ثمن نے ہنس کر کہا تو عدی خواہ خواہ ہی نکل ہو گیا۔

”آئی ایم سوری پینڈم ہوائے..... اکیچو بائی عفی نے آنی کی تصویر دی تھی۔ میں ان کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے اپنے نام کا بورڈ دیکھ ہی نہیں سکی۔“ عروش ہنستے ہوئے بولی۔ تو عدی نے بیک ویو مرر سے اس کو دیکھا۔ اور اگلے لمحے مکمل فراموش کر بیٹھا کہ وہ اس وقت ڈرائیونگ کر رہا ہے۔

”عدی.....“ ثمن کی فلک شکاف چیخ نے پیچھے بیٹھی عروش کو بھی لرزادیا تھا۔

☆☆☆

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں.....؟“ بللی سی

دستک کے بعد دروازہ کھول کر انہوں نے جھانکا تو اپنے کام میں مشغول عفاف نے چونک کر دیکھا۔

”کیس کم ان.....“ عالیہ اور امینہ کو انشینیوٹ میں ایڑے نیچے چر جانے کے لیے بلایا تھا اور اب مبین نیازی کی طرف سے اپروکرتا تھا۔

”السلام علیکم.....“ مبین نیازی آگے بڑھا۔ تو با آواز بلند سلام دیا۔ عالیہ اور امینہ نے پلٹ کر دیکھا۔ تک سک سے تیار ہوا اپنے مخصوص دربار انداز میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ عالیہ اور امینہ نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھ کر عفاف نے قہر آلود نظروں سے عالیہ اور امینہ کی چمکی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں مبین نیازی کی محرکیز شخصیت سے متاثر ہونے کی چمک انتہائی واضح تھی۔

”گڈ آفٹرنون لیڈیز.....“ مبین نیازی عفاف کے سامنے والی جیئر کے قریب آ رکھا تھا۔ عفاف نے دل ہی دل میں دانت پیسے۔ جبکہ عالیہ اور امینہ نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

”پلیز سر ہوائے سیٹ.....“ عفاف نے سیٹ انداز میں کہا تو مبین مسکرا کر جیئر کو پیچھے کھینچ کر اس پر بیٹھا اور نظریں عفاف پر جمائیں۔

”مسٹر نیازی۔ یہ عالیہ ہیں اور یہ امینہ.....“ عفاف نے تعارف کروایا۔ تو مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔

”یہ دونوں میرے ساتھ روشنی فاؤنڈیشن میں کام کرتی ہیں۔“ عفاف نے مبین کی نظروں کو نظر انداز کر کے اسے بتایا تو مبین نے عالیہ اور امینہ کو باری باری دیکھا۔

”عروش انشینیوٹ کے لیے ہمیں کم از کم تین لیچرز کی ضرورت ہوگی۔ جو ایونٹک کلاسز کو ہینڈل کریں۔ تو عالیہ اور امینہ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ یہ میننگ ان دونوں سے آپ کا تعارف کروانے کے لیے رکھی ہے۔“ عفاف نے بات ختم کی۔

”اوہو..... تو یہ میننگ ہے۔“ مبین نیازی مسکراتے لہجے میں اس سے استفسار کرنے لگا۔

”جی.....“ عفاف فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

”لیکن میں تو میٹنگ کے لیے تیار کر کے آیا ہی نہیں، میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے مجھے چائے پر بلایا ہے.....“ مبین نیازی کی مسکراتی آنکھیں عفاف کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ اس نے شیشا کر پہلے مبین اور پھر عالیہ اور امینہ کو دیکھا۔ جن کے چہروں پر ابھری مسکراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ ان دونوں نے مبین نیازی کے اس بے تکلفی کو انجوائے کیا ہے۔

”آپ غلط سمجھے ہیں مسٹر نیازی..... اور ویسے بھی یہ کوئی ایسی میٹنگ نہیں ہے جس کے لیے آپ کو باقاعدہ نوٹس بنانے پڑتے۔“ عفاف نے تیوریاں چڑھا کر اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”پھر جی آپ کو مجھے مطلع کرنا چاہیے تھا۔“ وہ بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔ عفاف نے کن انکھیں سے اسے دیکھا اور پھر عالیہ اور امینہ کو۔ جن کی مسکراہٹ اور چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں اس کے انداز اور لب و لہجے سے بہت متاثر ہو رہی ہیں۔

”آپ دونوں مسٹر نیازی کو ساری ڈیٹیل بتا دیں۔ تاکہ ان کو بھی معلوم ہو سکے کہ کن کو جواب کے لیے منتخب کیا جائے گا۔“ اگلے لمحے عفاف اس کو نظر انداز کر کے عالیہ اور امینہ سے مخاطب ہوئی..... تو امینہ نے اپنے سامنے رکھی فائل کو مبین نیازی کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے گہرا سانس لیا اور اب سنجیدگی سے اس معاملے کو دیکھنے لگی۔

”ہاں سچ ہے۔ ان سب کو انٹرویو کے لیے کال کر لیں۔“ مبین نیازی نے فائل میں رکھی ویز میں سے چند ویز کا انتخاب کیا اور ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ عالیہ نے منتخب شدہ ویز کو اٹھا کر الگ کیا اور فائل عفاف کی طرف بڑھادی۔

”آپ پلیز اپنی ٹائمنگ بتا دیں تاکہ انٹرویو کے لیے آسانی ہو.....“ امینہ نے مکمل پیشہ ورانہ طریقہ کار اپنایا تھا۔ عفاف نے اس فائل میں رکھی گئی ویز کو دیکھنے لگی تھی۔

”آپ ایسا کریں..... جو ٹائم آپ کے لیے مناسب ہے اس میں انٹرویو ٹائم رکھ دیں۔ مجھے انفارم کر دیجیے گا۔“ مبین نیازی پر سوچ لہجے میں بولا تو عفاف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”انٹرویو پینل میں کون کون ہو گا۔“ عالیہ جس پر عفاف نے یہ ذمہ داری لگائی تھی۔ اس نے مبین سے پوچھا۔

”میں اور مس عفاف.....“ مبین نیازی نے عفاف کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔ اس نے حیرت سے مبین کی طرف دیکھا۔ تو نہ جانے کیوں اسے لگا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود مبین کو معلوم ہے کہ عفاف اس پل حیرت میں ہے۔ عالیہ خاصی بد مزہ ہوئی تھی۔ امینہ نے بھی سر آدھ بھری۔

”میرے خیال میں تو آپ کا چائے پانی پوچھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس گئیے مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔ بہت سے ادھورے کام چھوڑ کر آیا تھا۔“ انداز سراسر احسان جتانے کا سا تھا۔ عفاف کچکا کر رہ گئی۔

”جی بالکل آپ ٹھیک سمجھے.....“ عفاف بلا مروت بولی۔ تو مبین کا قہقہہ بلند ہوا جو عفاف کے ساتھ ساتھ امینہ اور عالیہ کو بھی چڑھ گیا۔

”اوکے آپ مجھے ساری تفصیل ای میل کر دینا تو پھر ملاقات ہوگی۔“ دوسرے پل وہ کہتے ہوئے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آفس سے باہر نکل گیا اور عفاف جانے کیوں اندر ہی اندر تمللا کر رہ گئی۔ جبکہ امینہ اور عالیہ ابھی تک ہونقوں کی طرف بیٹھی تھیں۔

”تم دونوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟“ عفاف نے امینہ اور عالیہ کو گم صم سمجھے دیکھا تو قدرے خبی سے گویا ہوئی۔

”یار کیا بندہ تھا۔ کیا وہ بنگ انٹری ماری..... اور اس کی مسکراہٹ اس کی آنکھیں، اس کا اسٹائل.....“ عالیہ انتہائی متاثر کن انداز میں بولنے لگی تو عفاف نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

”ایمنہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر دہائی دی۔

”ہاں اور مجھے یوں لگا وہ میرا دل چرا کر فرار ہوا ہے۔“ عالیہ نے دونوں بازو پھیل کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ کر یوں پوز بنایا جیسے واقعی بے جان ہو گئی ہو۔

”دفع دور.....“ عفاف نے دانت پیس کر کہا۔

”حد سے بے شری کی..... یوں کرو دونوں انگلیوں میں جو انگوٹھیاں پہنی ہیں اتار دو۔ دونوں اور ”سہیلیاں“ بن کر رہو..... ویسے بھی دل و دماغ سے تاپید خالی وجود کو علی بھائی اور مسیح بھائی کیا کریں گے.....“ عفاف کے لہجے میں انتہائی کڑواہٹ تھی جس پر بجائے ناراض ہونے کے عالیہ اور امینہ کے قہقہے بلند ہوئے..... تو عفاف نے نیچھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”سوری یار ہم تو ایسے مذاق کر رہی تھیں۔“ امینہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”دے تمہیں کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ.....“ عالیہ نے تفتیشی نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے یار۔ تم تو جانتی ہو ناں مجھے خواہ خواہ لڑکوں سے فری ہونے کا شوق نہیں ہوتا..... اور نہ ہی میں کسی کو اس بات کی اجازت دیتی ہوں کہ اپنی فضول شوخیاں مجھ پر آزمائے.....“ عفاف نے سامنے بکھرے پیپر کی ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

”ویسے لگتا تو نہیں کہ خواہ خواہ فری ہونے والا بندہ ہے۔“ عالیہ نے ایک اور کمنٹ پاس کیا۔

”کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کیسا ہے اور بہتر ہی ہے کہ کسی کو موقع ہی نہ دیا جائے۔ اگر عروش کی محبت آڑے نہ آئی تو میں سمجھی بھی اس بندے کے ساتھ کسی پارٹنرشپ کی حامی نہ بھرتی۔“ عفاف سارے پیپر درواز میں رکھتے ہوئے بولی۔

”خیر..... تم دونوں ان سی ویز کو سننا لو اور انٹرویو کے لیے کال کرو..... اور پھر مجھے ساری ڈیٹیل بتا دینا۔“ اس سے پہلے کے عالیہ یا امینہ میں سے کوئی

مزید کوئی سوال پوچھتیس عفاف نے موضوع ہی بدل دیا۔ تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا امینہ نے سی ویز اٹھائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوکے ٹھیک ہے پھر۔ انٹرویو کے لیے ٹائم اور ڈیٹ فائل کر کے بتائی ہوں۔“ امینہ نے فائل بیگ میں ڈال کر کہا۔

”تھینک یو سوچ یار۔ تم دونوں کی مدد کے بغیر میں یہ نہیں کر سکتی تھی۔“ عفاف نے تشکر آمیز نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”لو جی..... یہ ہوتی ہے دوستی اور ہم تو دوستی میں جان قربان کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ تو چیونٹی جتنا کام تھا۔ سوسیشن ٹاٹ مانی ڈیئر.....“ عالیہ کا انداز شاہانہ تھا، امینہ نے بھی مسکرا کر اس کی بات پر ”میشن ٹاٹ“ پر مہر ثبت کر دی۔ تو عفاف کی مسکراہٹ بھی گہری ہو گئی۔

”لچ ٹائم بھی نزدیک ہے ویسے.....“ وہ دونوں باہر نا جانب بڑھیں تو امینہ نے پلٹ کر عفاف کو دیکھا۔

”نہیں یار ابھی تو بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔“ عفاف نے سہولت سے انکار کیا۔ تو امینہ اور عالیہ نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ دونوں آفس سے نکل گئیں تو عفاف نے بھی چند ضروری فائل کو سیٹ کر کے رکھا۔ تو اب احسن ندیم کو کال کرنے کا سوچ رہی تھی۔ عروش بھی یقیناً پہنچ گئی ہوگی تو وہ ساری تفصیل پوچھنا چاہ رہی تھی۔ ابھی کچھ کام باقی تھا لیکن وہ موبائل ہاتھ میں اٹھائے احسن ندیم کو کال ملانے ہی لگی تھی کہ اس کے موبائل پر رینگل ہونے لگی۔

”انٹرویو کے لیے سب کو انفارم کر دیا ہے۔ بدھ کو بجے سے چار بجے تک..... میں تمہیں ساری ڈیٹیل میٹج کر رہی ہوں.....“ عالیہ نے کال کی بابت بتایا تو عفاف نے کیلیڈر دیکھا۔ آج تو جمعہ ہے ابھی چند دن ہیں۔

”ہاں ٹھیک ہے مجھے ساری تفصیل ای میل یا میٹج میں بھیج دو میں مبین نیازی سے کنفرم کر لوں گی۔“

عفاف جلدی سے بولی۔ مبین نیازی کو بتانا ضروری ہے کہ جب میں مبین مینشن جاؤں تو وہ وہاں موجود ہو۔ وہ اب سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے کیا مبین مینشن جانا چاہیے۔ اسی شش و پنج میں جتلا وہ آفس سے نکل کر اپنے پارٹنرٹ کی طرف بڑھی تھی۔

”السلام علیکم دادو میں عفاف بول رہی ہوں۔۔۔۔۔“ راہداری سے گزرتے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی کہ مبین نیازی سے کیسے رابطہ ہو۔ ایک لحظہ اس کے ذہن میں آیا کہ سفینہ کو کال کر کے کنفرم کرے وہ گھر کس وقت ہوگا۔ تاکہ اسی وقت وہ بھی مبین مینشن پہنچ جائے اور انٹرویو کے حوالے سے سارے پوائنٹس ڈسکس کرے۔

”علیکم السلام بیٹا!“ خیریت سے ہو۔ تم کب آؤ گی مجھ سے ملنے۔ عروش بھی چلی گئی ہے مبین بھی مصروف رہتا ہے اب تم ہی جو میرا دل بہلاؤ گی۔“ سفینہ نے مسکرا کر فرمائش کی۔

”جی دادو ضرور آؤں گی اس وقت اس لیے فون کیا ہے کہ آپ سے صرف یہ کنفرم کرنا تھا کہ مسٹر نیازی کس وقت گھر ہوں گے میں نے عروش انٹیشیوٹ کے حوالے سے کچھ ڈسکس کرنا تھا۔ میرے پاس ان کا کاٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔“ عفاف جھجکتے ہوئے ان سے پوچھ رہی تھی۔

”بیٹا وہ تو آج کل ذرا دیر ہی سے آ رہا ہے۔“ سفینہ نے اسے بتایا تو وہ خاموشی سے سونے لگ گئی۔

”میں ایسا کرتی ہوں تمہیں اس کا نمبر دے دیتی ہوں تم خود ہی کنفرم کر لینا کہ کب وہ مل سکتا ہے۔“ اس کی خاموشی پر سفینہ نے فائنل حل پیش کیا۔

”دادو۔۔۔۔۔ آپ میرا نمبر مسٹر نیازی کو دے دینا اور کہنا کہ مجھ سے رابطہ کر لیں، آڈیشنل کام کے سلسلے میں کچھ ڈسکس کرنا ہے۔“ ایک دم ہی انا کا پرچم بلند ہوا۔

”میں کیوں رابطہ کروں۔ کام ان کا ہے تو رابطہ بھی انہی کو کرنا چاہیے۔“ ایک دم عفاف نے سوچا اور سفینہ کو پیغام دے دیا اور ”آڈیشنل نام“ کو واضح

کیا۔۔۔۔۔ لیکن بھول گئی کے انجانے میں ہی وہ مبین نیازی کو کامیاب بنا گئی تھی۔۔۔۔۔ مبین تک عفاف کا نمبر پہنچ رہا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں آج ہی اسے تمہارا پیغام دے کر نمبر دے دوں گی پھر وہ تم سے خود ہی رابطہ کرے گا۔۔۔۔۔“ سفینہ کے خوش مزاجی سے کہا تو عفاف پرسکون ہو گئی۔ اس نے واپس گھر جانا تھا اس لیے جلدی فون بند کر دیا۔

☆☆☆

”فارگا ڈسک دل آویز۔۔۔۔۔ تمہیں اب تک سمجھ جانا چاہیے کہ جب تم ڈرائیونگ کے لیے گاڑی میں بیٹھتی ہو تو ساری انجنین نکال کر بیٹھا کرو۔ یوں ڈسٹرب ذہن کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا انتہائی خطرناک ہے۔“ مانی ایک بار پھر اس کی حرکتوں سے عاجز آ چکا تھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ میں اسٹیڈیز کی وجہ سے تھوڑی سی ڈسٹرکٹ ہوئی ہوتی ہوں۔ کوشش کروں گی اب کوئی غلطی نہ ہو۔“ دل آویز ہاتھ مروڑتے ہوئے وضاحتیں دے رہی تھی۔

”اوکے۔۔۔۔۔ ریلیکس اور ایک کام کرو۔“ اگلے لمحے مانی کا لہجہ ایک بار پھر نارمل ہو چکا تھا۔ دل آویز نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن اگلے پل نظریں جھکا لیں۔

”کم بخت بگڑے تیوروں میں بھی زیر کر کے گھائل کرنے کے ہنر سے واقف ہے۔“ وہ من ہی من اپنی دھڑکنوں کو بے قابو ہونے سے روکنے کی ناکام سی کوشش میں جتلا ہو رہی تھی۔

”گاڑی کا انجن آف کرو۔۔۔۔۔ اور باہر نکلو۔۔۔۔۔“ مانی کی ہدایت پر اس نے چونک کر دیکھا۔ مانی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ تو دل آویز کو بھی اس کی ہدایت پر عمل کرنا پڑا۔

”گاڑی کی چابی مجھے دو۔“ مانی اس کی سائڈ پر آیا اور ہاتھ بڑھایا۔ تو دل آویز نے گاڑی کی چابی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

”اس لیب پوسٹ تک واک کر کے جاؤ۔ اور پھر واپس آؤ۔۔۔۔۔“ مانی کی مزید ہدایت کچھ انوکھی قسم کی تھی۔ اس نے چار پانچ ڈرائیوے چھوڑ کر بنے لیب پوسٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ اور واپس آ کر سوالیہ نظروں سے مانی کو دیکھا جو اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”اب یہ لو چابی اور لیسن اشارت کرو۔۔۔۔۔ مکمل فریش مائنڈ کے ساتھ۔۔۔۔۔“ مانی نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ چابی اس کی جانب بڑھائی۔ دل آویز نے متحجب انداز میں مانی کی اس عجیب و انوکھی منطق کو مسکرا کر دیکھا۔ دل آویز نے سن رکھا تھا کہ مانی کا کوئی اسٹوڈنٹ اگر دل جمعی سے ڈرائیونگ نہ کر رہا ہو تو وہ طرح طرح کے طریقوں سے ان کی توجہ ڈرائیونگ کی جانب مبذول کرتا ہے۔ لیکن ابھی ہار نہیں مانتا۔

”یوں سمجھو تم ابھی لیسن اشارت کر رہی ہو۔“ مانی بھی اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔

”میں تو محبت اشارت کر رہی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بولی ضرور لیکن یہ آواز مانی تک نہ پہنچی تھی۔

”میں نے کہا تھا کہ اب ہم دوستوں کی طرح ڈرائیونگ کریں گے۔ لیکن اگر تم غلطیاں کرو گی میں جان بوجھ کر اپنی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“ مانی ڈشیں مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

”کاش کے آپ کو میرا جان کے خطرے کی بھی اتنی ہی فکر ہوتی۔“ دل آویز نے آہستگی سے کہہ کر رخ موڑا تھا اور گاڑی اشارت کر دی۔ مانی کی سماعت میں اس کی سرگوشی گونجی تھی۔ اس نے دانستہ رخ موڑ لیا اور ساری توجہ روڈ کی جانب کر دی۔ دل آویز اب احتیاط سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ پیڈل شیرین کراسنگ تک اس کی پہنچ اب بحفاظت طریقے سے ہو رہی تھی۔ اسپید پر بھی اس کی نظریں تھیں۔

”ویری گڈ۔۔۔۔۔ ویل ڈن۔۔۔۔۔ یہ امپر وومنٹ مجھے چاہیے تھی۔“ مانی نے تحریری کلمات کے ساتھ اس

کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو دل آویز نے بریک پیڈل پر پاؤں رکھ کر اسپید کو کنٹرول کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کم از کم دوستی کا کچھ تو فائدہ ہو۔۔۔۔۔“ وہ خاموش تھی تو مانی مزید گویا ہوا۔

”یہی کہ تم ڈرائیونگ جلدی سیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔“

دل آویز نے استغہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تو مانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تنگ پڑ گئے ہیں؟“ دل آویز نے زیر پر کراسنگ پر کھڑے لوگوں کو دیکھ کر گاڑی روکی اور مانی کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”دس از جسٹ پرفیکٹ۔۔۔۔۔“ مانی نے دل آویز کی زیر پر کراسنگ تک اپروچ کی دل کھول کر تعریف کی۔

”نہیں تنگ نہیں پڑا۔۔۔۔۔ خوشی ہو رہی ہے کہ تم ڈرائیونگ کے لیے اب سیریس ہو اور اب کافی دیکھ سیکھ بھی گئی ہو۔“ مانی نے خوش مزاجی سے کہا تو دل آویز نے گہرا سانس لیا اور گاڑی آگے بڑھائی۔

”اب اس کی طرف سے کچھ دیکھا۔“

”ہاں لیکن میں نہیں کروانا چاہتی تھی۔“

بعد تو یہ لمحے میسر آتے ہیں جب میری محبت میرے ہمراہ ہوتی ہے۔ اتنے انتظار کے بعد تو یہ دن آتا ہے جب میں اپنی محبت کو محسوس کر پاتی ہوں۔ اس کے ساتھ جیسے لگتی ہوں۔“ آدھی بات کے بعد وہ من ہی من میں سرور لہجے میں بولی۔

☆☆☆

(باقی آئندہ)



سورة الانفطار

ترجمہ:-

”جب آسمان پھٹ جائے اور جب ستارے جھڑ جائیں اور جب سمندر ابل پڑیں اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں۔ تب ہر شخص جان لے گا کہ کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑ آیا۔ اے انسان تجھے اپنے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے مغرور کر دیا۔ جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے ٹھیک کیا پھر تجھے برابر کیا۔ جس صورت میں چاہا تیرے اعضا کو جوڑ دیا۔ نہیں نہیں بلکہ تم جزا کو نہیں مانتے اور بے شک تم پر محافظ ہیں۔ عزت والے، اعمال لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ نعمت میں ہوں گے اور بے شک نافرمان دوزخ میں ہوں گے۔ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے کہیں جانے نہ پائیں گے اور تجھے کیا معلوم انصاف کا دن کیا ہے۔ پھر تجھے کیا معلوم کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ جس دن کوئی کسی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے گا اور اس دن اللہ ہی کا حکم ہوگا۔ (آیت ۱ سے ۱۹)

عظیم خیانت

حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عظیم خیانت زمین کے گز میں خیانت ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دو آدمی ایک زمین یا ایک گھر میں پڑوسی ہیں لیکن پھر بھی ان میں سے ایک اپنے ساتھی کے حصے

میں سے ایک گز ظلم لے لیتا ہے، ایسا کرنے والے کو قیامت کے دن ساتویں زمینوں سے اس حصہ کا طوق بنا کر گلے میں پہنایا گا۔“ (23283 مسند احمد بن حنبل)

نجات حاصل کرنے کا گر

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ.....
”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نجات حاصل کرنے کا گر کیا ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
”اپنی زبان پر قابو رکھو اور اپنے گناہوں پر اللہ کے حضور میں رویا کرو۔“ (جامع ترمذی)

سعدیہ وحید سعدی..... اسلام آباد
بات تمیز سے اور اعتراض دلیل سے کرو کیونکہ زبان تو حیوانوں کے منہ میں بھی ہوتی ہے مگر وہ علم اور سلیقے سے محروم ہوتے ہیں۔
دنیا میں رہنے کے لیے دو جگہیں سب سے زیادہ بہترین ہیں۔ کسی کے دل میں یا کسی کی دعاؤں میں۔
اپنوں کو ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاؤ ورنہ وقت آپ کے اپنوں کو آپ کے بنا جینا سکھا دے گا۔
مجھے بہت سے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے جو میرے مرنے پر رونے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف ایک شخص کی ضرورت ہے جو میرے رونے پر میرے کو تیار ہو۔
فوزیہ شمر بٹ، ہانیہ عمران..... گجرات

نفس کی اصلاح

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے۔

بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی اور عمدہ پوشاک زیب تن تھا۔ عیش پسندی دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے کو دروہ سے اتار مارا کہ وہ رونے لگے۔
حضرت حصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ ”آپ نے اسے کیوں مارا؟“
آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس کو دیکھا کہ یہ خود پسندی میں مبتلا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ اس کے نفس کو اس کے سامنے حق بناؤں۔“

اس کو دیکھا کہ یہ خود پسندی میں مبتلا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ اس کے نفس کو اس کے سامنے حق بناؤں۔“

(لن تلقی مثل عمر ۲/۲۱۱)
عائشہ ضیاء..... منٹولی

سلطان نور الدین زنگی

یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ غدار ہماری قوم کا لازمی حصہ بن گئے ہیں اور قوم ان سے بھی پاک نہیں ہوگی۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب غدار، قوم پر باقاعدہ حکومت کریں گے۔ دشمن کے خلاف باتیں کریں گے، بلند دعوے کریں گے۔ دشمن کو پھیل دینے کے نعرے لگائیں گے مگر قوم جان نہیں سکے گی کہ ان کے حکمران دراصل ان کے اور ان کے دین کے دشمن کے ساتھ درپردہ دوستی کر چکے ہیں۔ دشمن ان ہی کو ڈھال اور ان ہی کو تکیا بنائے گا اور ان ہی کے ہاتھوں قوم کو مروائے گا۔
فلکشن چوہدری گل..... گجرات

لیڈری

ہم لوگ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں دونوں کی بھیک لینے جب وہ چل کے آتے ہیں دے دے کے ووٹ ہم انہیں ممبر بناتے ہیں کرسی پر بیٹھ کے وہ ہمیں بھول جاتے ہیں پھر دور ہی سے جلوہ دکھائی ہے لیڈری صدف سخی..... کراچی

قائد اعظم کے اصول

۳۱ جب ۱۹۲۰ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کی شادی ہوئی تو انہوں نے غسل خانہ کی تعمیر میں اس وقت کے پچاس ہزار روپے خرچ کیے مگر آپ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے تو قائد اعظم ڈیڑھ روپے کا موزہ لینے سے انکار کر دیتے کہ مسلمان ملکہ کے گورنر کو اتنی ہنگامی چیز نہیں پہننی چاہیے۔

۳۱ ایک دفعہ آپ گاڑی میں نہیں جا رہے تھے تو ایک جگہ ریلوے ٹریک بند ہو گیا۔ آپ کا ڈرائیور اتر کے وہاں موجود شخص سے کہنے لگا کہ ”گورنر جنرل آئے ہیں، ٹریک کھولو“ مگر ہمارے عظیم لیڈر اور بانی پاکستان نے فرمایا کہ ”نہیں، اسے بند رہنے دو میں ایسی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا جو پروٹوکول پر مبنی ہو۔“

نہلے یہ دہلا
ریٹورنٹ کے اندر ایک ٹرک ڈرائیور اکیلا بیٹھا صبح کے ناشتے میں سری پائے، چھو لے نان، حلوہ پوری اور مٹھی سی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ تین موٹر سائیکل سوار شہری بابو اندر آ گئے اور آ کر اس سے انکھیلیاں کرنے لگ گئے۔ ایک نے سری پائے کا پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ دوسرے نے کسی پی کر اٹنے کا تھم سے خیالی مونچھ صاف کی۔ تیسرے نے حلوے کو ایک پوری کے اوپر ڈالا اور اس کو پیٹ کر کھایا۔ ٹرک ڈرائیور یہ سب کچھ دیکھتا رہا لیکن کچھ نہ بولا۔ اس نے آرام سے اٹھ کر کاؤنٹر پر جا کے پیسے ادا کیے اور باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وینر ان تین لڑکوں کے لیے چائے کے گد دیئے میز پر گیا تو انہوں نے ویٹر سے کہا۔ ”دیکھنے میں تو وہ بہت جی دار لگ رہا تھا لیکن آگے سے کچھ بولا ہی نہیں۔ بس ایویں سا کوئی مرد ہے، مزا نہیں آیا۔“

ویٹر بولا۔ ”ڈرائیور بھی وہ بس ایویں سا ہے، ابھی



رُبابِ راجپوت، کی ڈائری میں تحریر
ایک خوبصورت نظم

گزرے لمحوں میں
دفاؤں کا پاس رکھیں گے
موتے ہوئے بھی
تیری ہی پیاس رکھیں گے
تیرے کوجلوں پہ بچھاؤ دردی ہے
اپنی جوانی کی راجپوت
اپنی امگلوں کی پائیں
سب جذلوں کی ساتھی
تیرا وجود میرا وجود ہے
تیرا قیام ہی میرا قیام ہے
تو ہے تو میرا نام ہے
پتی دہریں نکلتا ہے
تو میرا پاکستان ہے
میری ذات کی پہچان ہے
تو میرا پاکستان ہے

کنول شاہین، کی ڈائری میں تحریر
احمد اسلام احمد کی نظم
میرا تمام فن، میری کاوشیں، میرا ریاض
اک نام تمام گیت کے مصرعے ہیں جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کلمے نہ ہوا ہو، اک ایسا لکھیل
میری مستاع، بس یہی جادو ہے عشق کا

سیکھ ہے جس کو میں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحر عشق کا تحفہ عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے کچھ کہ حقیقت میں کیا ہے یہ
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ
کس سے ہیں اے جاں کہ یہ قصہ عجیب ہے
کہنے کو یوں تو عشق کا جادو ہے میرے پاس
پر میرے دل کے واسطے اتنا ہے اس کا بوجھ
سے پاک پہاڑا، ہوتا نہیں ہے یہ
لیکن اثر کے باب میں ملکا ہے اس قدر
تجہ پر اگر چلاؤں تو ملتا نہیں ہے یہ

نور العین، کی ڈائری میں تحریر
محمود میر پوری کی غزل
مجھے غرور رہتا ہے تیری آشنائی کا
مگر ساتھ غم بھی ہے تیری جدائی کا

بیشیر میں اکیلے بن کا احساس ہوتا ہے
تیرے بن یہ حال ہے میری تنہائی کا
تمہی نے ہماری کوئی خبر نہ لی جاننا
وردہ ہمیں دعویٰ تھا تیری دلربائی کا
اپنے پیار کی قید سے تم آزاد نہ کرنا
میرا بھی ارادہ نہیں رہائی کا

اصغر کو کیوں طعنہ دیتے ہو بے وفائی کا
جب تم خود سامنا نہیں کر سکتے سچائی کا

فوزیہ ثمریٹ، کی ڈائری میں تحریر

بشر مدنی غزل
کبھی یوں بھی آسیری آنکھ میں کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے کراں کے بعد سحر نہ ہو
وہ بڑا دجیم دکریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
مجھے بھولنے کی دعا کر دے تو دعا میں میری اثر نہ ہو
کبھی دن کی دُحوب میں جھول کے کبھی شے کے پھولوں کو خوم کے
یونہی ساتھ ساتھ جلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو
میرے پاس میرے صیب آذرا اور دل کے قریب آ
مجھے دھرتیوں میں بساؤں میں کہ بھڑکنے کا کبھی درد نہ ہو

گریشاہ، کی ڈائری میں تحریر

ساحر لدھیانوی کی غزل
میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا
بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا
بربادیوں کا جستن منانا چلا گیا
جرم مل گیا اسی کو مقدمہ سمجھ لیا
جو گھو گیا میں اس کو جھلاتا چلا گیا
غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو چھاں
میں دل کو اس مقام پہ لا تا چلا گیا

عائشہ جہانگیر مرالی، کی ڈائری میں تحریر
نوشی گیلانی کی غزل
تجھ سے اب ادھرت نہیں کی جاسکتی
خود کو اتنی بھی اذیت نہیں دی جاسکتی

جاننے ہیں کہ یقین ٹوٹ رہا ہے دل پر
بھر بھی اب ترک یہ وصفت نہیں کی جاسکتی
جس کا شہر ہے اور اس میں کسی بھی موت
سانس لینے کی سہولت نہیں دی جاسکتی
روشنی کے لئے دھواڑہ کھلا رکھنا ہے
شب سے اب کوئی اجازت نہیں لی جاسکتی
عشق نے بھر کا آزار تو دے رکھا ہے
اس سے بڑھ کر تو دعا ہے جس دلی ہاتھی

نمرہ عاقب، کی ڈائری میں تحریر

فہم احمد غزل
ناموشی میں طور ستاروں نے لٹا کر بھی نہیں
اس لئے سب کچھ دیا لیکن کیا کچھ بھی نہیں
تجہ کو کیا معلوم اے جان جہاں تیرے بغیر
میرا جیون کٹ گیا اور میں جیا کچھ بھی نہیں
علم ہے ہم کو ملا اس کے سوا کچھ مانگیں
انکھ کے دستِ دُعا لب پہ دُعا کچھ بھی نہیں
تیری خاطر عمر بھر کا رست جگا ہم کو قبول
چاہتوں میں ایک شب کا جاگنا کچھ بھی نہیں
پیارے دکھ مجھے اب بھی ملے اس سے غلیل
دل دھڑک اٹھا میرا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں



بسمِ بزرگوار
ابھی تک پاؤں سے چھٹی ہیں زنجیریں غلامی کی
دن آجاتا ہے آزادی کا، آزادی نہیں آتی
بہنی غاور
میں اپنے رب سے ہوں اس بات کا سوالی
ہو قائم میرے ملک میں امن و خوش حالی
مدہ
خدا کرے کہ مری ارض پاک پہ آئے
وہ فصل گل سے اندیشہِ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو بھی گزرنے کی مجال نہ ہو
امن عامر
دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی آفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی
فاطمہ نور
ہماری آنکھ میں جو خواب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
یہاں جو گوہر نایاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
وطن کی آن پر قربان کرتے ہیں دل و جان بھی
ہمارے پاس جو اسباب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
شہزاد
یہ دل یہ جان وار دو مرا وطن سوار دو
حیات جس کا نام ہے بہادری کا جام ہے
یہ جام جوم کریمو، جیو تو بے دھڑک جیو
یہ دل یہ جان وار دو، مرا وطن سوار دو
سوہتم بھری
کاسن کی میرے خالوں کو تعمیر مل جائے
جاگتی آنکھوں میں اس کی تصویر مل جائے
جو شخص مقتدر میں نہیں ہے میرے
وہ شخص بنا تقدیر کے مل جائے

عائشہ جاگیر مرالی
کوئی دل ایسا نہیں جس میں تو یاد نہ آیا ہو
سچ کہوں مری ہر سانس غلام ہے تیری
فرزانہ مغل
رہے گی یاد ہمیں اس کی خوش مزاجی بھی
ملا جب بھی وہ خوش نہیں دل ڈال گیا
شازب گلزار
کہتے کہتے کچھ بدل دیتا ہے کیوں باتوں کا رخ
کیوں خود اپنے آپ کے بھی ساتھ وہ بچا نہیں
رسخانہ اعجاز
وفا تجھ سے اسے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
صائمہ سحر
سنگ رہا ہوں میں دھیرے دھیرے مگر کسی پرچیاں نہیں ہے
وہ آگ دل میں لگی ہے جس میں پیش ہے لیکن دھل نہیں
تہارے تم نے سکھا دیا ہے مجھے ہر اک غم سے بیکرنا
غم جہاں بھی، یقین جانو، مزاج دل پر گراں نہیں ہے
عذرا ناصر
چاہوں تو بھی نہ مٹا پاؤں گایترا نام دل سے
مثلاً وہ لفظ جلتے ہیں جو غلطی سے لکھ جاتے ہیں
اقطی ناصر
یوں تو نکلتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا
گریشاہ
اپنی تو محبت کی بس اتنی کہانی ہے
نوٹی ہوئی کشتی ہے مہرا ہوا پانی ہے
ایک پھول کتابوں میں دم توڑ چکا ہے
کچھ یاد نہیں آتا یہ جس کی نشانی ہے

ایمان جمید
اب اندھروں میں جو ہم خوفزدہ بیٹھے ہیں
بس کیا کریں خود ہی چراغوں کو بجھاتے ہیں
نظارا ق
مہربان ہو کے بلا لوجھے ہا، جو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر نہ آ سکوں
عائشہ، تحریم
دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو
فرحین اختر
ہوئے مدقون دیا زبردیا تیرے والے
طلبے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گھر نکلے
نادیہ یاسر
تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھول دیتے ہیں
اقرا
جو ملی ہے زندگی اسے گھونٹ گھونٹ لی ہیں
کبھی مر بھی لیں گے اسے دل ابھی اندھوڑا جی نہیں
نور شریٹ
اداسیوں کی شام ادیا دوں گا سہاں
اپنی آنکھوں پر ستارے ہرگز نہ لائیں گے
رکھنا سنبھال کے تم چند خوشیاں رہیں گے
میں نوٹ کر آؤں گا پھر میری منائیں گے
لاریب انعم
باہمی رہنمائی بھول کر آ ملو
توڑ ڈالو سب ہی بیڑیاں عید پر
انوش البادر
عید کی ہر بہار دیکھو تم
عیش لیل و نہار دیکھو تم
ایک اس عید پر کیا موقوف
ایسی عیدیں ہزار دیکھو تم
کرن، ینش
جن کے ملنے کا آسرا بھی نہیں
عید ان کا خیال لاتی ہے

بشری یوسف
نہ جانے میرا تصور مٹا یا فریب نظر
ہلال عید میں بھی تم مجھے نظر آئے
کنول شاہین
آؤ مل کر مانگیں دعا میں ہم عید کے دن
باقی رہے نہ کوئی بھی غم عید کے دن
ہر آنکھ میں خوشیوں کا سمندر ابھرے
ادب جگمگا تا رہے ہر آنکھ عید کے دن
عظمیٰ ولی محمد
خوب تم نے کہا حشر میں مل جائیں گے
اس قدر بھیر میں ہوتی ہے ملاقات بھلا
افضل سمیع
موسم کی مثال دوں یا تمہاری
کوئی پوچھ بیٹھا ہے بدلنا کو کبھی نہیں
صدف عمران
آنکھیں جو اٹھائے تو محبت کا گہاں ہو
نظر دل کو کھٹکے تو شکایت سی لگے ہے
ماہندیم
ابھی رات میں کئی نوڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی ہالے گا
نہیں جس نے دل سے جھٹکنا ہے میرے دل کو
حاکم
محبت کا ذخیرہ دل کا ہے
کہ اپنی قدر ہے ہر لمحہ
وہ مجھے آہستہ خدا کر لے گا
اندر لاس کیر سے دل لگتا ہے
نقد نور
وصل کو کیسے معتبر سمجھیں
ہجر کا خوف دل پر طاری ہے
آج تو دل کی بات کہنے دو
آج کی شام تو ہماری ہے
غزوہ، اقرا
نہیں مجھ کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے روٹا ہوا ہوں
بظاہر خوش ہوں لیکن سچ بتاؤں
میں اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں
کراچی



بے بسی

شوہر نے پہلی بار اپنی نئی ٹیلی دہن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا شروع کیا تو پہلے ہی نوالے سے حالت خراب ہو گئی۔ نوالہ اس کے منہ سے باہر آ گیا اور اسے انٹی آتے آتے رہ گئی۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”بیگم! میں یہ کھانا ہرگز نہیں کھا سکتا۔“ مروت کے مارے، اس نے بیوی کو یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ کھانا کس قدر بد ذائقہ ہے۔

بیوی اطمینان سے بولی۔ ”کوئی بات نہیں، میں نے کھانے پکانے والی کتابوں میں یہ بھی پڑھا ہے کہ بچے ہوئے اور باسی کھانوں سے ڈشیں کیسے تیار کی جاتی ہیں۔“

یہ سن کر شوہر خوف زدہ انداز میں بے بسی سے کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں..... نہیں..... ٹھیک ہے، میں یہی کھانا کھا لیتا ہوں۔“

مسرت طارق..... مظفر آباد

نسخہ شادمانی

بیوی دیکھو نا! ہمارے پڑوسی نے پچاس انچ کا ایل سی ڈی، ٹی وی خریدا ہے، آپ بھی خرید لایے نا۔“

شوہر: ”ارے ڈارلنگ! جس کے پاس تمہارے جیسی خوب صورت بیوی ہو وہ کیونکر فالتو کا وقت ٹی وی دیکھنے میں برباد کرے۔“

بیوی: ”اوہ آپ بھی نا..... میں ابھی آپ کے

لیے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔“

☆.....☆

بیوی: ”آپ میری سالگرہ کا دن کیسے بھول گئے؟“

شوہر: ”بھلا تمہاری سالگرہ کا دن کوئی کیسے یاد رکھے، تمہیں دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ تمہاری عمر بڑھ رہی ہے۔“

بیوی: آنسو صاف کرتے ہوئے..... ”رکیں، ابھی آپ کے لیے کھیر لے کر آتی ہوں۔“

عائشہ تحریم..... گوجرہ

ایک سے بڑھ کر ایک

موسم بہار کا خوش گوار ترین دن تھا۔ ایک ہائی اسکول کی چار طالبات سہیلیوں نے سوچا کہ ٹھوڑا سا وقت سیر و تفریح میں گزارا جائے۔ سچ کے بعد وہ چاروں اسکول پہنچیں اور انہوں نے انی ٹیچر کو بتایا کہ اسکول آتے ہوئے ان کی کار کا ٹائر پچھڑ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لیٹ ہو گئیں۔

”لو کیوں“ ٹیچر نے کہا۔ ”آج صبح پوری کلاس کا ٹیسٹ لیا گیا لیکن تم لوگ شریک نہ تھیں۔ اب تم چاروں اپنی اپنی کاپیاں اور پین نکالو اور الگ الگ بیٹھ جاؤ۔“

چاروں لڑکیاں ایک دوسرے سے دور دور بیٹھ گئیں تو ٹیچر نے کہا۔ ”اب اپنی اپنی کاپیاں سو الگ جواب لکھو کہ کار کے کس ٹائر میں پچھڑ ہوا تھا۔“

ارم طاہرہ..... شندو اکرم

بیوی ہو تو ایسی

ایک صاحب کی آفس سے چھٹی ہوئی تو ان کی ملاقات ایک پرانے جگری دوست سے ہو گئی۔ چائے پینے کی غرض سے وہ دونوں ایک ریستورنٹ میں بیٹھ گئے تو باتوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو۔

رات دس بجے جب موصوف گھر پہنچے تو بیوی کھانے کی میز پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ صاحب ”بھوک نہیں ہے“ کہہ کر گھر کے اندر چلے گئے اور اپنے بستر پر جا کر آرام سے سو گئے۔

رات ساڑھے تین بجے الارم کی آواز پر ان کی آنکھ کھل گئی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور گھڑی دیکھی تو غصے سے آگے سے باہر ہو گئے۔ بیوی کو جھنجھوڑ کر اٹھایا اور پوچھا۔ ”یہ کیا حرکت تھی؟“

”ہوں.....“ بیوی نے انتہائی سکون اور اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے سوچا کہ دفتر سے آنے میں آپ کو پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں تو اتنا ہی وقت جانے میں بھی لگے گا، اس لیے میں نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگادیا تاکہ آپ وقت پر آفس پہنچ جائیں۔“

منیب شمشاد..... آزاد کشمیر

بس اور رکشا

ایک لڑکے نے لڑکی کو پھیلے ہوئے کہا۔ ”بس اور لڑکی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک ہالی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔“

”رکشا اور لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں، ایک کو بلاؤ تو چار چلے آتے ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

نوشابہ اسد..... سبھرات

معیار حماقت

لندن کے نواح میں ایک نوجوان جوڑا کار میں تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ ایک جش آف پیس نے انہیں روک لیا اور موقع پر ہی ایک سو پونڈ کا جرمانہ کر دیا۔

نوجوان بولا۔ ”جناب والا! ہم تو آپ کے

پاس ہی آرہے تھے تاکہ آپ ہماری شادی کا فریضہ انجام دے دیں۔“

”پھر تو جرمانہ دو سو پونڈ ہوگا۔“ جج صاحب نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم تو اس سے بھی زیادہ احمق ہو، جتنا میں نے پہلے سمجھا تھا۔“

شازیہ گلزار..... بمبئی

اعتراض

ایک بچہ کافی دیر سے رو رہا تھا۔ ماں کے بار بار چپ کرانے پر بھی چپ نہ ہوا تو شوہر نے کہا۔ ”اری او نیک بخت! تم اسے لوری دے کر سلا کیوں نہیں دیتیں؟“

بیوی نے کہا۔ ”میں نے پوری لوری سنا لی تھی، مگر بڑوس سے آواز آئی کہ اس سے بہتر ہے بچے کو رونے دو؟“

حور بن زہب..... کراؤٹا

حاضر دماغی

بیوی: ”ایسی سنتے ۱۱۹۲ سے وہ ایک ادا دیتا۔ میرا ہاتھ پھانچ رہا ہے۔“

شوہر نے فوراً جواب دیا۔ ”الو! ہاں سے لڑا لڑو۔“

ایک ماں اپنے بچے کو اپنے گھر کے دروازے پر لٹا کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بچہ اس کے ہاتھ سے لٹا کر دیکھ رہی تھی۔

وزیر صحت نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”دوسرے بچوں کو سی این جی لگی ہوئی ہے، تیرے کو کیوں نہیں لگائی؟“

ڈاکٹر نے سر سے بے کر پاؤں تک وزیر کو دیکھا اور پھر ڈرپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”سر یہ مریض پیٹرول پر چل رہا ہے۔“

کنول شاہین قصیر..... تلہ کنگ

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

بھید

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپاس سے گزرے تھے جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں کنویں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری انگی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اوز بھتنا اور جس کارن آدی دکھ بھوگتا ہے ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نروا ڈھونڈنے والے کو نروا مل جاتا ہے اور جو دنیا کی خاطر کشت اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔ (مشتاق احمد یوسفی..... آب گم) فوزیہ شربت، ہانیہ عمران..... ہجرات

کڑیاں، چڑیاں

عورتیں ایک تسلسل ہیں، ایک رابطہ ہیں..... حیات اور کائنات کا، زمین اور آسمان کی اندر..... جیسے ہر دم چوں چوں کا ساز بجانے والی چڑیاں..... فقط ایک کھونسلے کے لیے ہر دم جگہ ڈھونڈتی رہتی ہیں اور اکثر غلط جگہ پر گھونسلہ بناتی ہیں..... بچائیں تو بھی چلائی ہیں..... نہ بچائیں تو بھی شور مچائی ہیں۔ (بشری رحمن..... چپ)

صائمہ سحر..... فیصل آباد

برتر

برتر وہی ہے جو بے وقوف ہے جتنا بے وقوف اتنا ہی برتر! پہلے مرد عورت پر حکومت کرتا تھا۔ طاقت سے۔ اب بے وقوف یعنی برتر بنا کر حکومت کرتا ہے۔ برتر بنا کر حکومت کرنے میں اسے دہرا فائدہ ہے یعنی عورت پر دہری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ وہ خود انہیں اپنے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیتا ہے، رہ

گئے چار دیواریوں والے فرائض تو عورتیں انہیں عادات انجام دیتی ہیں۔ یعنی مرد عورتوں کے دوش بدوش بچوں کو دودھ نہیں پلاتا۔ عورتوں کے دوش بدوش باورچی خانے میں جھک نہیں مارتا۔ عورتوں کے دوش بدوش گھر کی صفائی نہیں کرتا۔ بچوں کے کپڑے نہیں دھوتا۔ اس وقت وہ پلنگ پر لیٹ کر چین کی بنسی بجاتا ہے یا دوستوں کو سیٹ کرتا اس ٹھیلے لگتا ہے۔ عورت اسی لیے مرد سے برتر ہے کہ اس نے دہری ذمہ داریاں سمیٹ رکھی ہیں۔ (ابن صفی..... آہنی دروازہ)

افشاں سمیع..... کراچی

تباہی کی وجہ

انسانوں کی طرح ملک اور قومیں بھی ہمیشہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔ خوبی وہ چیز ہے جس پر انسان اعتماد کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کی ذات پہ اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو کھانے لگتی ہیں۔ اسی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس خوبی کے باعث وہ انسانیت سے گرنے لگتا ہے۔ فرد، ملک، قومیں سب اپنی خوبی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہے۔ (بانو قدسیہ..... راجہ گدھ)

سحر تبسم سحری..... منگل پورہ

زبان کے گھاؤ

کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل بم اور ڈرون ایجاد کر کے تباہی پھیلانی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے۔ اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے کبھی بھی میں سوچتا کہ ایٹم بم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا برباد کرنے کے لیے ہے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔ (ہاشم ندیم..... پری زاد)

فضلہ نور..... روہڑی

شاء شہزاد..... کراچی

سرور قی بن ٹھیک لگا۔ سب سے پہلے ادارہ اور ”حمود لغت“ کو پڑھنے کا شرف بخشا۔ رخ چوہدری کا ناول ”شب نم کی سحر“ کچھ زیادہ متاثر نہیں کر رہا اب بعد میں جا کر پتا چلے گا کہانی کیسی ہوگی۔ نگہت عبد اللہ کا ”ہوا میں رخ بدل گئی“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ خزینہ ابھی تو خوشیوں کے پنڈولے میں جھولا جھول رہی ہے مگر بعد میں غزنی اس کا پچھراہ کوڈے کا جب احساس ہوگا۔ تنزیلہ ریاض کا ناول بہت ہٹ جا رہا ہے۔ نظیر فاطمہ نے ”سورما“ بہت اچھا لکھا۔ نادیہ احمد کا ”چھوٹی سی خطا“ پسند آیا۔ صائمہ قریشی کا ”لذت تم عشق“ ابھی نہیں پڑھا دو تین اقساط ہو جائیں پھر پڑھوں گی۔ ”الباہی، میں اور تم“ ام ایمان نے بہت شان دار لکھا اچھا سبق دیا ایسے مردوں کو جنہیں بیٹھ کر کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ افسانے اس بار جھپٹے اور سب ہی تقریباً اچھے لگے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی سبق موجود ہوتا ہے بس سمجھنے والا ہونا چاہیے۔ رائٹرز ہم تک جو بات پہنچانا چاہتی ہیں وہ ہم سمجھ جائیں تو ان کی محنت وصول ہو جاتی ہے۔ سلسلے تمام بے مثال تھے مجبوری طور پر پورا کرنا پسند آیا۔

ج: پیاری شفاء! کرن کی پسند کی کہ ہے۔
آپ اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کچھ دوا لگواؤ
سے کرن کی عقل میں شریک۔ رسول۔ اللہ آپ کا
تندرستی دے آمین۔

مغل پورہ

ناٹل سو سوتا۔ ”ہوا میں رخ بدل گئی“ ناول تو ٹھیک ہے پر ”شب نم کی سحر“ اپنی چمک نہیں بنایا رہا ہے۔ مغل ناول دونوں اے دن تھے صائمہ قریشی اور ام ایمان ویل ڈن۔ ناول ”عم ہے یا خوش ہے تو“ آتش کا کردار میرا فیورٹ ہے۔ ویل ڈن تنزیلہ اور واپس آنے کا شکر یہ۔ ”چھوٹی سی خطا“ نادیہ کی تحریر اس دفعہ متاثر نہ کر سکی۔ ”سورما“ نظیر فاطمہ ویل ڈن۔ ایمل رضا کرن میں لکھنے کا بہت شکر ہے میں آپ کی بڑی شین ہوں۔

افسانوں میں ”تیری چاہت۔ برسوں بعد۔ لغزش“ بس ٹھیک ٹھاک تھے۔ جبکہ ”ذخول سہانے۔“ میں تقسیم کرنی ہیں“ اے دن تھے۔ مستقل سلسلے کرن کے تو کافی شان دار ہیں۔

میسرین



ج: پیاری سحر! ان شاء اللہ ”شب نم کی سحر“ آگے جا کر اپنی جگہ بنا لے گا۔ کرن کتاب میں پیغامات کے ذریعے اپنے چاہنے والوں تک اپنی آواز پہنچانی ہے ”مقابل ہے آئینہ“ میں آپ کے جوابات ان شاء اللہ شائع کر دیے جائیں گے۔

تبسم بشر حسین..... ڈنگہ

میری امی کی مکمل صحت کے لیے دعا کریں۔ ناٹل اے دن تھا۔ ادارہ یہ میں آپ کے الفاظ آپ کی محبتوں کا پتا دے رہے تھے۔ حمود لغت سے روح کو سرشار کیا تو راستے میں رمشا خان ملی ان سے بیلو ہائے ہوئی۔ ”میری جی میں“ میں وہاں علی کی کافی عادتیں مجھ سے ملتی جلتی ہیں۔ ”مقابل ہے آئینہ“ میں سعدیہ صدیقی کالی سادہ اور پیاری لکھتی ہیں۔ ”شب نم کی سحر“ میں شفاء کی ناسازی ام سے اچھا لگتا ہے۔ ”سورما“ میں فاطمہ نے اچھا لکھا۔ ”چھوٹی سی خطا“ میں نادیہ کی تحریر اس دفعہ متاثر نہ کر سکی۔ ”سورما“ نظیر فاطمہ ویل ڈن۔ ایمل رضا کرن میں لکھنے کا بہت شکر ہے میں آپ کی بڑی شین ہوں۔

دعا میں ہیں اللہ ان صاحبہ کو تندرستی و دل کی آواز دے۔ آپ اپنی تحریر کے بارے میں جاننے کے لیے ادارہ میں فون کر کے معلوم کریں۔ مریم عزیز اور صدف آصف تک آپ کا پیغام پہنچا دیا جائے گا۔

فضلہ نور..... روہڑی

مارچ، اپریل، مئی، جون اور پھر جولائی ان پانچ مہینوں میں میرا ہر خط اللہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ گلے، شکایات بہت سے زبان پر آئے لیکن جب کسی نہ کسی سلسلے میں اپنی شمولیت دیکھتی تو چپ

ٹاپک تھا۔ ٹائس ایل جی۔ فرح بھٹو کا ”اک تیری چاہت“ اپنے نام کی طرح..... یعنی اپنے نام کی ہی عکاسی کر رہا تھا۔ اور آخر میں بات کروں گی رضوانہ اسحاق کے افسانہ ”برسوں بعد“ منفرد ٹاپک کی بنا پر بہت اچھا لگا..... مگر شکر ہے رضوانہ جی نے دونوں کو اینڈ پیہ ملا دیا.....! اور ایک افسانہ جو مجھے اچھا نہیں لگا..... مجھے شدید اختلاف ہوا اس افسانے سے وہ تھا عمارہ امداد کا ”لغزش“ ٹھیک ہے بہت اچھا موضوع تھا..... بہت اچھا لکھا مگر..... میں اتنا ضرور کہوں گی کہ جو انسان اپنے ماضی کو بھول کر..... اس پر نام اور شرمندہ ہو کر اپنی حال کی زندگی کو اچھا جی رہا ہو تو اس کے ماضی کے باعث اسے یا اس کی اولاد کو برا نہیں کہنا چاہیے.....!

ج: پیاری صائمہ! ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی مصروفیت کے باوجود کرن کے لیے وقت نکالا۔ اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کرن عمران احمد..... ساہیوال

جولائی کے شمارے میں اپنا خط نہ پا کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں بہت ناراض ہوں۔ کرن میں ہر نئے لکھنے والے کو جگہ دی جاتی ہے۔ میں نے بہت سے خطوط اور اپنی تحاریر بھی بھیجیں مگر کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ مجھے تو ایگزیکٹو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ آپ کو ملے بھی ہیں یا نہیں۔

ج: پیاری کرن! ہمیں آپ کا یہ پہلا خط ملا ہے اس سے پہلے کوئی خط اور تحریروں ہمیں موصول نہیں ہوئی ہے۔

نوزیہ شمر بٹ ہانیہ عمران..... گجرات

ٹائٹل پرفیکٹ لگا۔ ماڈل نے شاید آرٹیفشل تھیلی ڈالی ہوئی تھی۔ لگ پیاری رہی تھی۔ کرن کے پہلے دو تین صفحے میرے فیورٹ ہیں۔ شاہین جی! بن کہے ”رمشا خان“ کا انٹرویو کر کے دل خوش کر دیا..... ”میری سنے“ میں بھی اچھی پرسنٹی سے ملاقات کروائی۔ ”آواز کی دنیا“ کو پڑھا۔ رائے یہی قائم ہوئی کہ بندہ اگر کچھ کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ ویسے ایک بات شیر کرتی ہے کہ قسمت کا بھی گڈ لکنگ ہونا چاہیے۔ سلوٹ ایسے پرسن کو.....

سب سے پہلے ”شب نم“ کو پڑھا۔ چوتھی قسط تک تو ابھی کرداروں سے تعارف ان کی عبادات کے بارے میں پتا چل رہا ہے ویسے رائٹر صلاحہ نے خوب پنجن پکایا ہے مطلب ہر قسم کی زبان یوز کی ہے۔ انگریزی پنجابی۔ اور خالص اردو نوابی جے

پڑھتے ہوئے بھی منہ کا جغرافیہ بہت ٹیز ہائیڈرہا ہونے لگتا ہے۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ سوری خاص متاثر نہیں کر سکا۔ شاید کچھ اور آگے جا کر بہتری ہو جائے اب تک تو کوئی سر پیر نہیں نظر آ رہا۔ ”لذت غم عشق میں“ ہم ابھی گوٹے گوٹے ڈوبے ہوئے (کہ آئندہ ماہ) نے سارہ مزا کر کر دیا۔

شکر ہے۔ اس ماہ کچھ مزاحیہ تحریروں بھی شامل تھیں۔ ”اباجی میں اور تم“ بڑی خوب صورتی سے رائٹر نے اپنوں کے چہروں سے نقاب اتارنے۔ اباجی کا کردار سائلڈ تھا۔ ناولٹ ”غم ہے یا خوشی ہے تو“ واہ کیا سین تھا۔ اب التمش کو بھی عقل آئے گی جب میڈم جی رشتے سے انکار کرے گی۔ مجھے تو غصہ ہی بہت ہے جو حرکت التمش نے کی سونیا سے کوئی ایسے بھی بے عزت کرتا ہے۔ لوجی ماسٹر جی۔ تو کنویں سے پانی پینے چلے گئے ہیں ہمیں انتظار کالالی پاپ پکڑا کر۔

”چھوٹی سی خطا“ یہ بھی ناولٹ ہلکا پھلکا رہا۔ ہاں مزاحیہ فقرے بننے پر مجبور کرتے رہے۔ خاص کر پاکستانی اپیل آئٹم (چھتر) کیا خوب کہی۔

”سورما“ بھی بیسٹ تحریر رہی۔ سوہنی جٹ کے ساتھ تو اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔ بات ہو جائے افسانوں کی تو جناب سب اے دن تھے۔ خاص کر ”گھروندہ“ پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ دل ٹوٹا کون دیکھتا ہے، زندگی تو گزر رہی جاتی ہے، پر اک بے سکونی کے ساتھ۔ مجھے تو ہیر و کا کہیں نام نظر نہیں آیا۔

”تیری چاہت“ بھی بیسٹ رہا۔ حقیقت یہی ہے جو اللہ کی رضا میں خود کو ڈھال لیتے ہیں وہی کامیاب رہتے ہیں دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ ”لغزش“ بھی سبق آموز رہا۔ ازل سے دنیا کا یہی دستور رہا ہے، کسی کی بھول کو معاف نہیں کرتی۔ یہ لغزش حد تک چھپا نہیں چھوڑتی۔ ”برسوں بعد“ بھی دل میں چھب سی گئی۔ چلو جی برسوں بعد ہی سہی رضوانہ اسحاق نے کہانی کا اینڈ اچھا لکے دل خوش کر دیا۔

”محببتیں تقسیم کرنی ہیں“ کیا زندگی کا فلسفہ یہاں کیا گیا ہے۔ ج: نوزیہ جی! ماشاء اللہ آپ کرن کی پرانی قاری ہیں۔ اور کم و بیش ہر ماہ کرن کے سلسلوں میں شامل ہوتی ہیں اور آپ کی یہی بات ہمارے لیے فخر کا باعث ہے کہ آپ نہ صرف کرن پڑھتی بلکہ اسے بہتر سے بہتر کرنے میں اپنا حصہ بھی ڈالتی ہیں۔